جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد دوم | ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ مطابق جولائی ۱۹۲۳ء | نمبر ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ مطابق جولائی ۱۹۲۳ء نمبر ۱

تعلیم و آزادی فکر

ہم کسی پچھلی اشاعت میں ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو کے متعلق انگلستان کے مشہور فلسفی مسٹر برٹرنڈ رسل کے خیالات ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ اپنے فلسفہ سیاسی میں فاضل موصوف نے ہیجانات کی دو قسمیں کی ہیں یعنی تخلیقی و تملیکی۔ اور اول الذکر کے تحت میں آپ تعلیم، مذہب، اور ازدواج کو سب سے موثر قوتیں تصور کرتے ہیں۔ ہم ذیل میں مسئلہ تعلیم پر موصوف کے خیالات کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ انشاء اللہ وقتاً فوقتاً اس مسئلہ پر دیگر حکمائے فرنگ کے افکار پیشکش کرتے رہینگے کہ ان سے آگہی ہمارے پیچیدہ مسئلہ تعلیمی کے صحیح حل کے لیے ازبس ضروری ہے۔

تعلیم معمولاً حالات موجودہ کی موافقت اور ہر بنیادی تغیر کی مخالفت میں سب سے قوی طاقت ہوتی ہے۔ موجودہ نظام اجتماعی جب اپنے کو خطرہ میں پاتا ہے، تو فوراً، (اگر ابھی اس کا اقتدار باقی ہے) تعلیمی نظام پر قبضہ کر لیتا ہے اور کم عمر بچوں کے اثر پذیر دماغوں میں اپنے محاسن کا یقین اور ان کی عظمت

جاگزیں کرنے لگتا ہے۔ اُدھر مصلحین ان لوگوں کو اس مورچے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ غریب بچوں کا طرفین میں سے کوئی خیال نہیں کرتا۔ یہ گویا بے سکھے سپاہی ہوتے ہیں جنھیں چاہے اس لشکر میں شامل کرلیا جائے اُس میں۔ اگر بچوں کا لحاظ کیا جائے تو تعلیم کا مقصد یہ نہ ہو کہ بچے اس فریق کے ساتھ ہوں یا اُس کی، بلکہ انھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ معقولیت کے ساتھ فریقین میں انتخاب کرسکیں۔ تعلیم کا مقصد پھر یہ نہ ہو کہ لڑکے وہ سوچیں جو ان کے اُستاد سوچتے ہیں، بلکہ ان میں خود فکر کا مادہ پیدا کردیا جائے۔ چنانچہ اگر بچوں کے حقوق کا خیال ہو تو تعلیم کا وجود بہ حیثیت ایک سیاسی حربے کے باقی نہ رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عدل اور حریت کے وہ دو اصول جو ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو میں بہت سی چیزوں پر حاوی ہیں تعلیم میں آکر بجائے خود کافی نہیں رہتے۔ عدل اگر اسے مساوات حقوق کے معنی میں لیا جائے تو ظاہر ہے کہ بچوں کے معاملہ میں ممکن نہیں۔ رہی حریت تو اول تو یہ اصلاً ایک منفی چیز ہے۔ یہ آزادی میں ہر ممکن الدفع مداخلت کی مخالف ہے لیکن کوئی مثبت اصول تعمیر اس سے فراہم نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ تعلیم میں ایک حد تک تسلط اور اختیار ناگزیر ہے۔ ہاں، معلموں کو اس تسلط کے استعمال کا ایک ایسا راستہ دریافت کرنا ہے جو حریت کے منشا کے مطابق ہو۔ جہاں تسلط ناگزیر ہو وہاں ضرورت ہوتی ہے حرمت و تکریم کی۔ جو شخص بچوں کو دراصل اچھی تعلیم دینا چاہتا ہے۔ اور ان کی صلاحیتوں کو درجۂ کمال پر پہونچانے کا آرزومند ہے، اسے اس جذبۂ تکریم سے لبریز ہونا چاہیے۔ مشین میں ڈھلے ہوئے آہنی نظاموں کے مویدین میں یہی جذبہ ناپید ہوتا ہے۔ حربیت سرمایہ داری فاشی، اشتراکی اور حکمی جماعتیں اور وہ تمام زندان و محبس جو مصلحین اور ان کے مخالفین روح انسانی کو مقید کرنے کے لیے بناتے ہیں اسی ذیل میں ہیں۔ اس تعلیم میں جسکے قواعد وضوابط دفتر حکومت سے نکلتے ہوں مع اپنی بڑی بڑی جماعتوں، مقررہ نصاب، اور کثرت کار سے شل اساتذہ کے اور مع اپنے اس تہیہ کے ایک ہی ڈھنگ کے متوسط استعداد کے لوگ پیدا کردیے جائیں، یہ فقدان تکریم تقریباً ہمہ گیر ہے۔ اس حرمت و تکریم کے لیے ضرورت ہے تخیل اور حرارت زندگی کی۔ اور پھر جن کی طاقت یا

واقعی تحصیل سب سے کم تر ہے انھیں کے باب میں سب سے زیادہ یہ تخیل درکار ہے - بچہ کمزور ہوتا ہے اور بظاہر بیوقوف - استاد مضبوط ہوتا ہے، اور اصطلاح عام میں بچہ سے زیادہ دانشمند - بے حرمت استاد یا بے تکریم دفتریت کا دلدادہ بآسانی بچہ کو ان کمزوریوں کے باعث تحقیر سے دیکھنے لگتا ہے - یہ بزعم خود سمجھتا ہے کہ میرا فرض ہے کہ بچے کو فلاں سانچے میں ڈھالوں - یہ اپنے تخیل میں خود کو ایک کمہار تصور کرتا ہے، جس کے ہاتھ میں بچہ بمنزلہ مٹی کے ہے - چنانچہ بچہ کو کوئی غیر فطری شکل دے دیتا ہے جو زیادتی سن کے ساتھ پختہ ہوتی جاتی ہے - یہ ذہنی کشاکش اور روحانی بے اطمینانیاں پیدا کرتی ہیں، اور ان سے حسد و بیرحمی - نیز یہ یقین بھی ترقی کرتا ہے کہ اوروں کو بھی اسی مسخ کن منزل کے طے کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے - جس استاد میں جذبہ تکریم موجود ہے وہ بچہ کو کسی سانچہ میں ڈھالنے کا خیال نہ کرے گا - وہ تو ہر ذی حی شئے میں، خصوصاً وجود انسانی اور پھر اس میں بھی سب سے زیادہ بچہ میں، ایک مقدس، غیر محدود، ناقابل تشریح، اس سے مختلف اور ایک عجیب بیش بہا چیز یعنی دنیا کی بے نداسی کمال کے ایک ریزہ مجسم کے وجود کا احساس کرتا ہے بچہ کے سامنے یہ ایک ناقابل توجیہ انکسار محسوس کرتا ہے، ایک انکسار جو عقلی وجوہ سے بآسانی قابل پذیرائی نہ سہی لیکن بہرحال اس سہولت پسند، بر خود غلط اعتماد کے بہ نسبت عرفان سے قریب تر ہے جو اکثر والدین اور اساتذہ میں ہوتا ہے - بچہ کی بیچارگی اور کسی کا سہارا ڈھونڈنے کی التجا اس میں ایک امانت کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے - اس کا تخیل اسے بتاتا ہے کہ بچہ خیر یا شر دونوں کے لیے کیسے کیسے ممکنات اپنے اندر رکھتا ہے؛ اس کے ہیجانات کس کس طرح نشو و نما پا سکتے یا دبائے جا سکتے ہیں؛ اس کی امیدیں کس طرح مرجھا جائینگی؛ اس کی زندگی کس طرح کم زندہ رہ جائیگی؛ اس کی امانت کیونکر مجروح اور اس کی آرزوئیں کیونکر ارادہ میں مبدل ہو جائینگی - یہ سب احساسات اس میں ایک خواہش پیدا کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں بچہ کی مدد کرے - وہ بچہ کو کسی خارجی غرض کے لیے نہیں (جو ریاست نے متعین کی ہو یا کسی اور غیر شخصی استبداد نے) بلکہ خود ان اغراض کی خاطر تقویت پہونچانا اور مسلح کرنا چاہتا ہے جنھیں بچہ کی روح پوشیدہ

طور پر تلاش کر رہی ہے جس شخص میں یہ احساس ہو وہ معلم کے اختیار کو اصول حریت کے توڑے بغیر استعمال کر سکتا ہے۔

. . . .

جب تک تعلیم کا مقصد فکر و خیال کے بجائے یقین و اعتقاد پیدا کرنا باقی رہیگا آزادی تحقیق ہی کا خون ناگزیر ہے۔ تعلیم کا مقصد آرزوئے صداقت کی پرورش ہونا چاہیے، نہ یہ عقیدہ پیدا کرنا کہ کوئی خاص مسلک سچا ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ اتحاد مسلک ہی لوگوں کو جارحانہ نظام میں منسلک رکھ سکتا ہے۔ جس قدر مسلک پر اعتقاد شدید ہو اسی قدر جدال میں کارکردگی زیادہ ہوگی۔ یہ شدت اعتقاد اور کارکردگی پیدا کرنے کے لیے بچہ کی فطرت پس پشت ڈالی جاتی اور اس کا مطمح نظر تنگ کر دیا جاتا ہے . . . . . لیکن آزادی فکر کو دبا کر جنگ و جدال میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ بہت آنی اور بے قیمت ہے۔ آخر کار کامیابی کے لیے بھی دماغی اور نفسی قوت اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی کہ حیات حسنہ کے لیے۔ بدقسمتی سے تعلیم کا یہ تصور کہ یہ قواعد کی ایک تشکل اور غلامی کے ذریعہ اتحاد عمل پیدا کرنے کی ایک سبیل ہے بہت عام ہے اور زیادہ تر اس بنا پر اس خیال کی ترویج کیجاتی ہے کہ یہ حصول فتح کا ذریعہ ہے۔ تاریخ قدیم کی تمثیلوں کے شائق اس کی تائید میں ایتھنس پر اسپارٹا کی فتح کی مثال دینگے۔ لیکن یاد رہے کہ لوگوں کے فکر و تخیل پر فرمانروائی ایتھنس کی رہی نہ کہ اسپارٹا کی ' آج ہم میں سے ہر ایک اگر وہ کسی گذشتہ عہد میں پیدا ہو سکتا تو ایتھنس میں پیدا ہونا چاہتا۔ اسپارٹا میں نہیں۔

تعلیم دینے والے عموماً بعض عادات کی تلقین کرتے ہیں، مثلاً اطاعت اور ڈسپلن، دنیاوی کامیابی کی بے پناہ کشمکش، مخالفین سے نفرت و حقارت، بے چون و چرا باور کرنے کی عادت، اور استاد کے عقل و فہم پر مجبول یقین یہ ساری کی ساری عادتیں زندگی کی منافی ہیں۔ اطاعت اور ڈسپلن کے بجائے ہمیں چاہیے خود مختاری اور ہیجان کی حفاظت؛ بیرحمی کی تلقین کے

بجائے تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے کہ خیال و فکر میں عدل کی پرورش کرے ؛ تحقیر کے بجائے اسے تکریم پیدا کرنی چاہیے اور تفہیم و تفہم کی کوشش ؛ دوسروں کی رائے سے یہ ضروری نہیں کہ اتفاق پیدا کیا جائے بلکہ اگر مخالفت ہو تو وہ جس کے ساتھ تخیل اور وجوہ مخالفت کا واضح احساس شامل ہو۔ بجائے زود عقیدگی کے اشتباہ تعمیری و تخلیقی اور ذوق مہمات ذہنی کو تحریک دینا اور ان عالمہائے گوناگوں کا احساس پیدا کرنا چاہیے جو فکر کی حوصلہ مندی اور خیال کی جرأت سے فتح کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے مدارس میں ڈسپلن اور ضبط نفس پر جو اصرار پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر ایک عیب ہے۔ ضبط نفس کی ایک قسم ہے جو ہر حصول مقصد کے لیے لازمی ہے۔ لیکن یہ پسندیدہ قسم خود اندر سے پیدا ہوتی ہے اور ایک بعید مقصد کے لیے استقلال کے ساتھ کوشش کرنے اور اس کی راہ میں بہت سی چیزیں ترک کرنے اور بہت سے مصائب برداشت کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ہیجانات کو ارادہ کا ماتحت کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے مہتم بالشان تخلیقی آرزوؤں سے عمل کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر بھی کہ یہ آرزوئیں خود روشن طور پر زندہ نہوں۔ اس ضبط کے بغیر کوئی حوصلہ، اچھا ہو یا بُرا، پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضبط خود اپنے ارادہ سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ کسی خارجی جبر سے۔ لیکن یہ قسم جو بُری نہیں اسی پر مدارس میں زور نہیں دیا جاتا۔ معاشی کشمکش میں بیرحمی اور سفاکی کی تعلیم اس وقت ناگزیر ہے تاکہ ہمارے جماعتی نظام کی ساخت میں تبدیلی نہ ہو۔ یہ چیز علی الخصوص متوسط طبقہ کے مدارس میں اور بھی پائی جاتی ہے کیونکہ مدرسہ کی کامیابی کا مدار والدین میں اس کی نیک نامی پر ہے اور یہ نیک نامی طلباء کی کامیابی کی تشہیر پر منحصر ہے۔ یہ منجملہ ان بہت سی صورتوں کے ایک صورت ہے جس میں ریاست کا نظام مسابقت و مقابلہ اپنا نقصان پہونچاتا ہے۔ علم کی فطری اور بے لوث آرزو بچوں میں کچھ کمیاب نہیں ہوتی، اور اکثر صورتوں میں جہاں یہ دبی ہوتی ہے اسے ابھارا جا سکتا ہے۔ لیکن اساتذہ اسے نہایت بیدردی سے کچلتے ہیں، اس لیے کہ انہیں تو سند، فضیلت اور امتحان کا خیال

ہوتا ہے۔ مدرسۂ ابتدائی میں داخلہ سے لیکر اعلیٰ تعلیم کے ختم تک قابل لڑکے کو فکر وخیال اور مذاق ذہنی کی پرورش کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ از اول تا آخر سوائے امتحان کے لیے اشارات اور درسی کتابوں میں مندرج حقایق کی ایک لمبی داستان کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ طلباء میں جو سب سے ذہین ہوتے ہیں وہ آخر میں تعلیم سے بیزار ہوجاتے ہیں اور اسے کسی طرح فراموش کرکے دنیائے عمل میں داخل ہونے کے آرزومند رہتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی معاشی نظام انھیں مقید رکھتا ہے اور ان کی تمام فطری خواہشات مجروح اور پامال ہوجاتی ہیں۔

استاد کے فہم و دانش پر مجہول قبول وتسلیم اکثر لڑکے لڑکیوں کے لیے نہایت سہل کام ہے۔ اس میں اپنی فکر ذاتی کی ضرورت نہیں پڑتی اور پھر بات بھی معقول معلوم ہوتی ہے کہ استاد اپنے شاگردوں سے زیادہ جانتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر استاد غیر معمولی آدمی نہیں تو اس کی نظر میں اچھا بننے کا بھی یہ ایک ذریعہ ہے۔ لیکن مجہول قبول وتسلیم کی یہ عادت آگے چل کر بہت مضر اثرات پیدا کرتی ہے۔ یہ انسانوں میں ایک قاید کی آرزو پیدا کردیتی ہے اور پھر جو کوئی اس حیثیت میں ملتا ہے اسے یہ اپنا راہنما تسلیم کرلیتے ہیں۔ کلیساؤں، حکومتوں، سیاسی فرقہ بندیوں، اور ان تمام نظاموں کی قوت، جو سادہ لوح انسانوں کو اپنی اور اپنی قوم کی اغراض کے منافی نظامہائے کہنہ کی تائید پر آمادہ کرتے ہیں اسی عادت سے پیدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ باوجود تعلیم کی تمام ممکن مساعی کے آزادی فکر ہب عام نہ ہوگی۔ لیکن اس وقت کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہوگی۔ اگر لڑکے سے بعض نتائج کا قبول کرانا مقصود نہو بلکہ اس میں فکر کی عادت پیدا کرنا تو تعلیم یقیناً بالکل دوسرے رنگ سے دیجائے۔ مثلاً تدریس کی یہ سرعت کم ہو اور بحث مباحثہ زیادہ، طلباء کو اظہار خیال کے زیادہ مواقع ملیں اور تعلیم ان چیزوں سے واسطہ رکھنے کی زیادہ کوشش کرے جن میں طالبعلم کو دلچسپی ہے۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ ذہنی حوصلہ مندی کے ذوق کو تحریک دینے اور ابھارنے کی کوشش ہو۔ یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں بہت حیرت خیز اور رنگارنگ

ہے۔ بعض چیزیں جو بہت سادہ معلوم ہوتی ہیں غور کرو تو اتنی ہی دشوار نظر آتی ہیں۔
(بہ ما ہمہ راز ہست کہ معلوم عوام است) بہت سی چیزیں جن کا اکتشاف ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ انھیں
محنت اور ذہانت آشکار کر دیتی ہے۔ خیال کی قوت، وہ وسیع میدان جو یہ سر کر سکتا ہے، اور وہ
وسیع تر میدان جن کی ایک دھندلی سی تصویر یہ تخیل کے سامنے پیش کرتا ہے، یہ چیزیں ان لوگوں
کو جو روزمرہ کے چکر سے ذرا پرے پہنچ گئے ہیں ایک عجیب متاعِ گراں ارزہم پہنچاتی اور
انھیں آئے دن کی کم حیثیت اور ماندگی جزئیات سے نجات دلا دیتی ہیں جس سے ان کی
ساری زندگی دلچسپیوں سے پُر اور حیاتِ عامیانہ کے زندان کی دیواریں شکست ہو جاتی ہیں
وہی حوصلہ مندی اور ذوق اور امنگ جو لوگوں کو قطب جنوبی لیجاتی ہے، جو قوت کے ایک
فیصلے کے امتحان کے لیے ہمتوں کو آمادہ پیکار بنا دیتی ہے، وہی تخلیقی فکر و خیال میں اپنے
لیے ایک راستہ نکال سکتی ہے، جو نہ مضرت رساں ہو نہ بیرحم؛ بلکہ حیاتِ بشری میں اس
جمالِ روشن کو شامل کر کے جو روحِ انسانی "غیر معلوم" کی بلندیوں سے لا رہی ہے، وقارِ انسانیت
میں افزونی کا باعث ہو۔ اس مسرت کو 'تھوڑا یا بہت' ہر اس شخص تک پہنچا دینا جو اس کی عقلاً حیثیت
رکھتا ہے وہ مقصدِ اصلی ہے جس کے لیے دماغی تعلیم کی قدر کرنا چاہیے۔ لوگ کہینگے کہ ذہنی حوصلہ مندی
کی مسرت لازماً کمیاب ہوگی، بہت کم لوگ ہیں جو اس سے محظوظ ہو سکیں گے اور معمولی تعلیم اس
موثری خوبی کا کس طرح خیال کر سکتی ہے۔ میرا یہ عقیدہ نہیں۔ دماغی حوصلہ مندی کا انبساط جوانوں
میں بڈھوں سے بہت زیادہ عام ہے اور بچوں میں تو بہت ہی عام۔ لیکن بعد کی زندگی میں یہ
اس لیے نادر و کمیاب ہو جاتا ہے کہ تعلیم کے ذریعہ اس کے قتل کی ہر ممکن کوشش کیجاتی ہے۔
انسان جتنا خیال سے ڈرتا ہے دنیا میں کسی اور شے سے نہیں ڈرتا؛ نہ تباہی سے حتیٰ کہ موت
تک سے نہیں۔ خیال انقلاب انگیز ہے اور تہ و بالا کرنے والا، تباہ کن ہے اور ہیبت ناک، یہ
قائم شدہ رسوم اور رواج، مراعات، آرامدہ عادات، غرض کسی پر رحم نہیں کھاتا۔ یہ نراجی
ہے اور بے آئین، یہ اختیار و استبداد کی طرف سے بے نیاز ہے اور قرنوں کی آزمودہ دانش

سے بے پروا۔ خیال دوزخ کے قعر تاریک تک میں جھانکتا ہے اور ڈرتا نہیں۔ یہ اس بیچارے ضعیف انسان کو، خاموشی کی گہرائیوں میں محصور دیکھتا ہے، لیکن ایک انداز تفاخر سے اسے اس طرح بے متاثر ہوئے جھیل جاتا ہے گویا یہی کائنات کا مالک ہے۔ خیال عظیم ہے، سریع ہے اور آزاد۔ یہ دنیا کا نور ہے اور انسان کی شوکت خصوصی۔

لیکن اگر خیال کو بجائے معدودے چند لوگوں کے حق کے اکثر کی ملک ہونا ہے تو ہم کو خوف سے منہ موڑ لینا چاہیئے۔ خوف ہی انسانوں کو روکتا ہے۔ اس کا خوف کہ کہیں ان کے عزیز عقائد دھوکہ نہ ثابت ہوں؛ اس کا خوف کہ جن کیفیات اساسی میں وہ زندگی گذارتے ہیں وہ مضر نہ قرار پائیں، اس کا خوف کہ کہیں وہ خود عزت کے اس سے کم مستحق نہ نکلیں جتنا وہ سمجھا کیے ہیں"۔ کیا مزدور املاک کے متعلق آزادی سے سوچے؟ پھر ہم امیروں کا کیا حشر ہوگا؟ کیا نوجوان مرد عورتیں اپنے تعلقات باہمی کے متعلق آزادی سے سوچیں؟ پھر اخلاق کی کیا گت ہوگی؟ سپاہی جنگ کی بابتہ آزادئ خیال رکھیں؟ تو فوجی نظام کی کیا نوبت ہوگی؟ نہیں نہیں۔ خیال سے باز آؤ۔ خدا کی پناہ۔ پھر تعصب کی تاریکیوں میں لوٹ چلو کہ کہیں املاک، اخلاق اور جنگ معرض خطر میں نہ آجائیں۔ بہتر ہے کہ انسان بے شعور رہے، کاہل رہے، ظالم رہے، لیکن اس کا خیال آزاد نہ ہو۔ اگر خیال آزاد ہوا تو ممکن ہے یہ اس طرح نہ سوچیں جیسے ہم سوچتے ہیں۔ اور یہ وہ مصیبت ہے جس کے ٹالنے کے لیے ہر قیمت کم ہو"۔ اپنی روح کی غیر شعوری گہرائیوں میں حریت خیال کے مخالفین یوں دلیلیں کرتے ہیں۔ اور اسی کے مطابق اپنے کلیساؤں، اپنی حکومتوں، اپنے مدارس اور کلیوں میں عمل پیرا ہوتے ہیں۔

کوئی اساس جس کی آبیاری خوف سے ہوئی ہو معاون حیات نہیں ہوسکتی۔ معاملات انسانی کا اصول تخلیقی و تعمیری امید ہے نہ کہ خوف۔ وہ سب کچھ جس نے انسان کو بڑا بنایا خیر کے حصول کی کوشش سے پیدا ہوا ہے، شر کے دفع کرنے کی کشمکش سے نہیں۔ جدید تعلیم میں چونکہ بہت کم کسی بڑی امید کی روح ہوتی ہے اسی لیے اس درجہ کم اچھے نتائج اس سے مرتب ہوتے ہیں۔ بچوں

سے معلمین کے دماغ پر تخلیق استقبال کے مقابلہ میں قیام ماضی کا خیال زیادہ مستولی ہے۔ لیکن تعلیم بس واقعات مردہ سے ایک مجہول آگہی پر مشتمل نہ ہونی چاہیے۔ اسے ایک عملی کیفیت ہونا چاہیے جس کی سمت اس دنیا کی طرف ہو جسے ہماری مساعی پیدا کرینگی۔ اس کی روح رواں یونان اور نشاۃ الثانیہ کے معدوم حسن کی غمناک جوع نہ ہونی چاہیئے بلکہ جماعت کی ہیئت استقبالی کا ایک درخشاں منظر۔ ان فتوحات کا تصور جو جہاں آیندہ حاصل کریگا، اور کائنات پر نظر انسانی کا روز افزوں اور ہر آن وسعت پذیر اُفق۔

ذاکر حسین خاں

(دالبرلن)

اندلس پر قبطی اثر

مصر کی قدیم قوم قبط کی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے اپنے گرد و نواح کے ممالک و اقوام پر اس نوع کے اثر چھوڑے ہیں، جن کو نظر انداز کرنا تاریخ کے مطالعہ میں ایک سخت فروگزاشت کا مترادف ہے۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ مصر کی اسلامی حکومت اور معاشرت وغیرہ پر قبطیوں کا گہرا اثر تھا۔ مگر اُس سے آگے بڑھ کر اگر اندلس پر نگاہ ڈالی جائے، تو اور بھی زیادہ دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

مؤرخ گبن کا بیان ہے کہ حضرت عمرو ابن عاص اور اُن کی فاتح فوج کو قبطی دشمن نہیں بلکہ مصائب سے ذریعہ نجات رت و فلاح سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر بٹلر کا خیال ہے کہ قبطیوں کے سرکردہ فرضی یعنی مقوقس نے مصری عیسائیوں سے غدارانہ سلوک کیا، اور اُسے مسلم فاتحین کے پنجوں میں پھنسا دیا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ بٹلر نے گبن کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ مسلمان فاتحین نے مصر فتح کرنے کے بعد اپنی خاص شرائط کے بعد عیسائیوں کو اپنے مذہب کی پیروی کی پوری پوری اجازت دے دی تھی؛ چنانچہ اُس کا قول ہے کہ "اِس مذہبی آزادی کی نئی فضا میں کلیسائے قبطی دوبارہ زندہ ہو گیا، اور اس قابل ہو گیا کہ اس قوم کے کلیسا کو ایک جداگانہ اور معزز جگہ دیجائے۔[1] قبطی تحریروں سے پایا جاتا ہے کہ وہ اُس زمانہ کو "یونانی کفار کے آوردہ مصائب و آلام کے بعد امن و امان کا زمانہ" سمجھتے تھے۔ اور یہ کہ ان دونوں قبطیوں کا حال "ان بھیڑوں کا سا تھا جن کی رسّی کھول کر اجازت دے دی جائے کہ وہ بہ امن و آرام آزادی کے ساتھ اپنی ماؤں کا دودھ پی لیں"۔ ۶۴۴ء عیسوی کے ایسٹر کا ہفتہ تھا جب حضرت عمرو بن عاص نے اپنی مسجد میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ "ہماری ہمسایہ قوم یعنی قبطیوں کا خیال رکھو۔ حضرت امیر المومنین

---

[1] کتاب "مصر کی عربی فتوحات" صفحہ ۴۳۹ - ۴۴۰

[2] ایضاً - صفحہ ۴۴۵

عمر نے مجھ سے فرمایا ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "اللہ تعالیٰ میرے بعد مصر کو تمہارے ہاتھ سے فتح کرائیگا - اس ملک کے قبطیوں کا خیال رکھنا - وہ تمہارے اعزہ اور تمہاری نگاہداشت کے محتاج ہیں - اپنی نگاہیں نیچی رکھو اور ان پر دست درازی سے باز رہو" - اسی حدیث کی ایک اور روایت یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں تین بار فرمایا کہ "گھونگر والے بالوں کا بخوبی خیال رکھنا" اور ان الفاظ مبارکہ کی یہ تشریح فرمائی تھی کہ "مصر کے قبطی تمہارے اعمام و اصہار ہیں - وہ تمہارے دشمنوں کے خلاف تمہارے معاون ہونگے اور تمہارے مذہب کی اشاعت میں مدد دینگے - وہ دنیا کے افکار میں تمہارا ہاتھ بٹائینگے کہ تم کو عبادت کے لیے کافی و وافی وقت مل سکے"۔ ام المومنین حضرت ماریہ قبطی قوم سے تھیں - پھر مصر کی فتح کے بعد مسلمانوں نے قبطیہ عورتوں کو اپنے نکاحوں میں لاکر احترام بخشا تھا۔

سادہ لوح، سادہ خیال عرب فتح مصر کے وقت تک نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے - انھیں آرائش مکان اور تکلفات غیر ضروری کی نہ ضرورت تھی اور نہ وہ اس سے اور اس کے ذرائع سے واقف[1] تھے - ظاہر ہے کہ ایسے حال اور ایسے زمانے میں (ساتویں صدی مسیحی) عرب فاتحین کے قبطی قوم سے کس قدر مدد ملی ہوگی، اور اُن سے اُنھوں نے صنعت و حرفت کے بدائع میں سے کیا کیا کچھ نہ سیکھا ہوگا - اس زمانے کے حالات و کوائف کی بازجست سے واضح ہوتا ہے کہ مورخین نے اس وقت کے قبطیوں اور مسلمانوں کی صنعت و حرفت کی بدیع کاری کے بیانات ہرگز مبالغہ پر مبنی نہیں ہیں - ان ایام کی پارچہ بافی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں یا جن کے حالات معلوم ہوتے ہیں، اُن سے خاص ملک مصر کی جدت طرازی اور نفاست آفرینی کا پتہ چلتا ہے - زائد سے زائد یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اس صنعت پر ایران اور بازنطین کا کچھ اثر پڑا ہو۔

---

[1] - یمن کے عرب البتہ اس لحاظ سے عام اعراب سے ممتاز تھے۔ ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان تکلفات سے واقف نہ تھے۔

صنعت پارچہ بافی میں نہایت وسیع تجارت ہوتی تھی، اور عجیب و غریب اقسام کے کپڑے تیار ہوتے تھے۔ جیسا سفید باف کپڑا وہ لوگ تیار کرتے تھے، قدیم مصری شاید ہی کسی طرح اس بارے میں اُن سے فایق ہوں۔ ریشم کا رواج عام ہوگیا تھا، اور وہ لوگ نہایت شوق سے سوتی اور ریشمی کپڑوں پر زردوزی اور کشیدہ کاری کیا کرتے تھے۔ کشیدہ، جالی، لیس، جُراب اور بنیان، اور ہر نوع کے اونی کپڑے عربوں کے ہاں ہر وقت کی چیزیں تھیں۔ آثارِ قدیمہ کے فرانسیسی عالم گایہ کا بیان ہے کہ اُس نے قبطیوں اور تیرھویں صدی کے یورپین صلیبی سپاہیوں کے کفن میں یہ سب مختلف الانواع کپڑے دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر بٹلر کا قول ہے کہ پانچویں صدی مسیحی کے اواخر سے دسویں صدی کے اوائل تک کے مصری ساخت کے کپڑوں میں ان تمام سیاسی تغیرات کا جو اُس ملک میں اُن صدیوں میں رونما ہوتے رہے، اس قدر صاف اور صحیح پتہ چلتا ہے جیسے کوئی آئینہ میں دیکھے۔" گایہ نے اس قول پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ان کپڑوں کی یہ آئینہ صفتی صلیبی جنگیوں کے زمانے تک کے واقعات تک پہنچتی ہے۔ مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مصر کے کئی مقامات میں جالی، کمخواب، دھاری دار ریشم، مخمل، مشجر، زربفت، بادلہ، تامی، منقش طلا کا پچڑے، قالین، غالیچے اور طرح طرح کے خوبصورت پردے بُنے جاتے تھے اور بکثرت استعمال ہوتے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے مصریوں نے صرف پارچہ بافی ہی میں کمال نہیں پیدا کیا تھا، بلکہ سونے کے زیور، سفال، چینی، ظروف سازی، ملمع سازی، بلورسازی میں دھات، لکڑی، ہاتھی دانت اور سیپ پر نقش و نگار کرنے میں، پھر سنگ تراشی، نقاشی اور فنِ عمارت میں، — غرض یہ کہ بقول بٹلر کے "قبطیوں نے صنعت و حرفت کے ہر ہر شعبے میں اپنے ملک کی صنعتی روایات کو قائم و باقی رکھا۔"[۲]

---

[۱] گایہ کی کتب "تیسری صدی سے تیرھویں صدی تک کے مصری لباس" "عربی صنعت" اور "قبطی صنعت"۔

[۲] بٹلر کی کتاب "عربی فتوحات"۔ باب ہشتم۔

صوبۂ یمن کے عربوں میں اگر یہ تمام نہیں تو ان میں اکثر صنائع ضرور موجود تھیں، اور بہت قدیم روایات پر مبنی تھیں۔ مصر قدیم کی تہذیب کے زمانے میں یمن کی تہذیب اور اُس کا تمدن نہایت اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ پھر ایرانی تسلط کے دَور میں کسریٰ نے ایرانی تکلفات اور سامان تعیش کا اُس پر اور بھی اضافہ کیا تھا بالخصوص صنعاء میں تہذیب و تمدن کا یہ عالم تھا کہ اُس وقت کی دُنیا میں اُس پر شاید ہی کوئی ملک مقدم تھا۔ تبلیغ اسلام سے قبل اہل یمن نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا، مصر کے قبطیوں کی طرح وہ لوگ بھی حضرت مسیح کی وحدتِ طبیعت کے قائل تھے۔ چنانچہ صنعاء کے گرجا کی ساخت و وضع کے بیانات سے اب بھی مصر کے قبطی گرجاؤں کی وضع سے یہ آسانی مقابلہ ہو سکتا ہے۔ اندرونی تفاصیل میں بھی صنعاء اور مصر کے گرجاؤں میں بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اہل صنعاء کے ہاں ہر قسم کے بیش قیمت لوازم استعمال ہوتے تھے، مگر قبطی چونکہ غریب تھے معمولی اشیاء سے کام لیتے تھے۔ بہر کیف ان دونوں مقامات کے گرجا اور راہبوں کے دَیر آپس میں نہایت مشابہ تھے۔ دیواروں کے بیرونی حصوں پر بھی دونوں جگہ نہایت خوشنما نقاشی سے کام لیا جاتا تھا۔

ممکن ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن (عرب) اور مصر (قبطی) کی اسی نوع کی باہمی مشابہت اور یگانگت پر خیال فرما کر یہ فرمایا ہو کہ "مصری تمہارے بھائی ہیں"۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اہل یمن تبلیغ اسلام کے وقت اپنے اور مصر کے اِن مذہبی تعلقات کو فراموش کر چکے ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں عرب کے مُسلم فاتحین نے مصر کے باشندوں سے برادرانہ تعلقات قائم کر لیے ہوں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مصر کی عربی فتح کے بعد تھوڑے ہی سے عرصہ میں دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قبطیوں کو اپنی حکومت کے متعدد سر بر آوردہ عہدے دیئے اور بہت عرصہ تک قبطیوں نے سلطنت کا نظم کام سنبھالے رکھا۔

سطور بالا میں مسلمانوں (اور بالخصوص اہل یمن) اور قبطیوں کے اِن برادرانہ تعلقات پر اس لیے بالتفصیل بحث کی گئی ہے کہ اس کا آسانی سے اندازہ ہو سکے کہ اندلس کے جنوب مغربی

حصے میں خصوصاً اور دوسرے حصوں میں عموماً جہاں جہاں اہل یمن آباد ہوئے، قبطی اثر اس قدر نمایاں کیوں تھا۔ اندلس میں آٹھویں صدی کے شروع سے گیارھویں صدی کے آخر تک (جب کہ اشبیلیہ کا آخری یمنی تاجدار تخت سے اتارا گیا اور وہ افریقیہ کے قید خانے میں جلاوطنی کے عالم میں راہیٔ ملک بقا ہوا) یہی حال رہا۔

موسیٰ ابن نصیر، فاتح افریقیہ کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ وہ بھی یمن کے رہنے والے تھے۔ اور گو ان کے دشمن اُن کو باندی بچہ بتاتے ہیں، لیکن اس کے قائل ہیں کہ وہ ایک یمنی سردار کی اولاد میں سے ہیں۔ فتح اندلس کے وقت موسیٰ افریقیہ کے گورنر تھے سب سے پہلا کام جو انھوں نے افریقیہ میں کیا وہ یہی تھا کہ اہل افریقیہ کو پوری طرح قابو میں رکھا جائے اور اس میں انھوں نے جس فوج سے مدد لی اُس میں زیادہ تر مصری شامل تھے ۷۰۲ء میں جب وہ بربریوں سے جنگ میں مشغول تھے، ان کا بیٹا مصریوں کا ایک زبردست دستہ ایکر اُن کی کمک کو پہنچا تھا۔ گو یہ ضروری نہیں کہ اس دستہ میں سب کے سب قبطی سپاہی ہی تھے۔ (کیونکہ قبطی سپاہی نہیں واقع ہوئے تھے)، مگر اس قدر سمجھ لینے میں تو کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی کہ فوج کے ہمراہ قبطیوں کی ایک معقول تعداد ضرور ہوگی۔ علامۂ مقری نے نفح الطیب میں ذکر کیا ہے کہ ۷۰۰ء (یا اس کے قریب قریب) میں موسیٰ کی نصیحت کی خلاف ورزی میں ایک "مصری بیڑا" سردانیہ کو گیا اور یہ کہ ۷۰۰ء کے قریب "عبداللہ ابن مرہ مصریوں کا ایک دستہ لیے ہوئے پہنچا"۔

فتوحات اسلامی کے آغاز میں مسلمان جہازرانی نہیں جانتے تھے۔ اس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور و معروف قول کو یاد کر لینا کافی ہوگا۔ جہازرانی اور سفر دریائی کی یہ ممانعت امیر معاویہ کے زمانے تک بجنسہٖ قائم رہی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ مسلمان یہ فن سیکھ گئے تو اُن کی فتوحات میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری ہی میں ایک طرف شام اور مصر کی بندرگاہوں میں اُن کے جہاز موجود تھے، اور دوسری طرف موسیٰ نے افریقیہ کے نومفتوحہ سواحل پر تونس میں ایک اچھا خاصہ بیڑا تیار کر لیا تھا۔

مصری بیڑے اور جہاز رانوں کے مذکورۂ بالا حوالہ سے معلوم ہوتا ہی کہ موسیٰ ابن نصیر نے سپنے بیڑے کی تیاری میں مصریوں سے بہت کچھ مدد لی تھی، اور چونکہ اسلامی فتح کے بعد یونانی اور رومی اقوام مصر سے نکل گئی تھیں، ظاہر ہے کہ مصری بیڑے میں عرب سرداروں کے ماتحت بربریوں کے ساتھ ساتھ قبطی جہازراں بہت اچھی تعداد میں موجود ہونگے - ایک اور بات یہ ہے کہ عرب مؤرخین جب "مصریوں" کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے اُن کی مراد عموماً قبطیوں ہی سے ہوتی ہے کیونکہ اس وقت مصر میں قبطی ہی تھے - غرض یہ کہ موسیٰ نے قبطی قوم سے ضرور کام لیا ہے۔ اسی طرح جب عبدالرحمٰن اول اندلس پر تسلط قائم کرنے کے خیال سے وہاں پہنچے ہیں، تو اُن کے ہمراہ بجایہ میں ایک مصری لشکر تھا، جس نے اموی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی یہ ۱۴۲ھ کے بعد عقنبہ بجایہ اور تدمیر میں مصری فوج آباد ہوئی تھی -

بجایہ میں اور اندلس کے مغربی حصے میں پارچہ بافی کے فن میں مصری اثر اس قدر صاف اور نمایاں تھا کہ شاید، سوا اشبیلیہ کے، اندلس کے کسی اور حصے میں نہ تھا - حالت یہ تھی کہ مصر کے سیاح اور تجار جو اندلس میں تازہ وارد ہوتے تھے، وہاں کے بعض کپڑوں کو دیکھ کر فوراً کہہ اُٹھتے تھے کہ "یہ مصری وضع ہی"۔ تدمیر میں (جو آجکل صوبۂ مرسیہ میں شامل ہی) اسلامی حکومت کے زمانے میں ایسے نفیس ریشمی کپڑے بنتے تھے کہ نہ صرف تمام اندلس میں مشہور تھے بلکہ مصر اور مشرق کو بھی بھیجے جاتے تھے۔

فتح اندلس کے دو سو سال بعد کا واقعہ ہی کہ عبدالرحمان ثالث نے اپنے ایک اشبیلی رئیس ... کے نام ایک خط میں قبطیوں کا ذکر کیا ہے - علامۂ مقری نے سنت یاقوہ کی فتح (۹۹۰ء) کے بیان میں لکھا ہے کہ "سینٹ جیمز کا گرجا پرہیزگار عیسائیوں کے نزدیک نہایت مقدس و متبرک جگہ تھی - اور قوبہ، سرزمین قبط، اور دوسرے دُور دراز ممالک سے عیسائی وہاں آتے تھے"۔ یہ امر شاید زیادہ قرین قیاس نہیں ہی کہ نوبہ اور مصر کے عیسائی اتنی دور کا سفر کرکے اندلس جا کر سینٹ جیمز کے گرجا کا حج کرینگے - لیکن یہ بات ناممکن نہیں ہی کہ اندلس کے قبطی عیسائی اور نوبہ کے وہ عیسائی غلام

یا سیاہی جو اندلس میں لائے جاتے تھے، اُس گرجا کا حج کرنے جاتے ہوں، کیونکہ اُن دنوں اُن کے ہم مذہب لوگوں کا بہت لحاظ کیا جاتا تھا۔

عبدالرحمان ثالث کے دورِ حکومت میں مشرق کی سیاسی ہلچل نے اندلس کی تجارت کو معرضِ خطر میں ڈالدیا، اور اندلسی مالِ تجارت کی نہایت کساد بازاری ہو گئی۔ آخر کار ۳۴۴ھ میں خلیفہ کے حکم سے مصری اور صقلی تجارت کے لیے اشبیلیہ میں ایک جہاز بنوایا گیا۔ اُس جہاز کا پہلا ہی بحری سفر تھا کہ راستے میں اُس کی ایک افریقی جہاز سے مڈبھیڑ ہو گئی جو معز الدولہ وزیر بغداد کی طرف سے صقلیہ کے گورنر کے نام خطوط لیے جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں لڑائی ہوئی، جس میں اندلسی جہاز کو فتح ہوئی۔ اہلِ جہاز نے وزیر کے جہاز مع اُس کے کل مافیہ کے قبضہ کر لیا، اُسے اپنے ہمراہ اسکندریہ کو لے گئے۔ اُس کا مال و اسباب وہاں فروخت کیا اور وہاں سے مصری پیداوار اور سامانِ تجارت لے کر اندلس کو واپس ہوئے۔ اس واقعہ نے طول کھینچا اور ان دونوں کے آپس میں کچھ عرصے تک اسی طرح کا مناقشہ رہا، جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ عبدالرحمن ثالث کی حکومت کو مصر سے تجارتی تعلق تھا۔

اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ قبطی لوگ کافی تعداد میں اندلس گئے تھے، اور وہاں جا کر اُنھوں نے اسلامی حکومت کے امورِ داخلہ میں وہی حصہ لیا جو وہ اپنے وطن مصر میں لیا کرتے تھے۔ اسی طرح اندلس میں جہاں جہاں بنی عربوں کا قدم پہنچا ہے، وہاں کی عمارات کی طرزِ تعمیر اور وضع میں قبطی اثر صاف نمودار ہے۔

تعمیرات میں ان اثرات کے لیے وہ گرجا شاہد ہیں، جو سولھویں اور سترھویں صدی کے مؤرخین کے قول کے موافق "پہلے مسجدیں تھیں" اور بعد میں گرجا کی صورت میں بدل دی گئیں۔ اشبیلیہ کے گرد و نواح میں، قادس کے مضافات میں، مرسیہ میں اور ان کے علاوہ اور مقامات میں، گرجاؤں کی بہت بڑی تعداد اس قسم کی ہے کہ اسلامی حکومت کے اٹھ جانے کے بعد ان کی تعمیرِ دوبارہ نہیں ہوئی اور اب تک اُسی حالت میں ہیں جیسے اصل میں تھے۔ خواہ وہ عمارتیں اصل

میں مسجدیں ہوں یا نہ ہوں، اس قدر ضرور ظاہر ہے کہ ان میں قبطی اثر نہایت صریح طور پر نمایاں ہے، عمارات کی بلندی اور دالانوں کی وضع صاف کہہ رہی ہے کہ وہ قبطی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں: مگر چھت کی ساخت بالکل عربی ہے تقریباً سب پر کھپریل ہے اور اندر کی طرف کڑیاں دکھائی دیتی ہیں، جن پر اقلیدسی شکلوں کی خاص اور خالص عربی طرز کی گلکاری اور منبت کاری ہے۔ اشبیلیہ کے گرجاؤں میں یہ بات خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اس قسم کے گرجا جہاں جہاں پائے جاتے ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے مغربی حصے میں گول گول کھڑکیاں ہوتی ہیں، جن میں عربی طرز کے تراشے ہوئے پتھر لگے ہیں۔ اطراف میں جو حجرے ہیں ان کی وضع بالکل وہی ہے جو مصر کی مسجدوں سے ملحق مقبروں کی ہے۔ ان مقبروں کی وضع کی شناخت یہ ہے کہ ان میں سب سے نیچے ایک مستطیل چبوترہ ہے۔ جس پر ایک اور ہشت پہلو چبوترہ ہر سولہ اضلاع کی دیوار پر ایک گنبد قائم ہے جس کے نیچے اصلی قبر واقع ہے، پھر سب سے اوپر گنبد کے کلس پر روشنی کے لئے چراغدان بنا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کے ان مذکورہ گرجاؤں کی ساخت خالص مصری طرز کی ہے، اور یہ وضع اخمیم کے قبطی دیر رہبان کی ہے جس کی تعمیر ۵ھ کی ہے۔

مصر کے فاطمی خاندان کی تباہی کے وقت تک مصر کی عمارات میں قبطی اور عربی عمارات کی طرز کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا۔ قبطی معماروں سے جب مسجد بنانے کو کہا جاتا تھا، تو وہ اُسی نمونے پر تیار کر دیتے تھے جس پر اپنے گرجا بناتے تھے۔ اس کی مثال یوں بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مصر کی پرانی عمارتوں کو دیکھا جائے تو قبطیوں کی بنائی ہوئی عربی اور عیسائی عمارتوں میں تقریباً ہر جگہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک اقلیدسی شکل کے درمیان میں ایک صلیب بنی ہوئی ہے، اور ایک کثیر الاضلاع شکل کے چھوٹے سے حلقہ کے گرد ایک حاشیہ ہے جس میں ایک خرگوش کی شکل بنی ہوئی ہے۔ یہ خرگوش عثون کا تحریری نام ہے، جو مسبرس دیوتا کا (جو مردوں کا حافظ و محافظ ہے) نشان ہے۔ اور اسی قسم کی اور ان گنت باتیں ہیں جو اس

قدیم طرز کی مشابہت کو پورا کر دیتی ہیں۔ اسی نوع کی تحریری علامات اور اقلیدسی اشکال کا مجموعہ اشبیلیہ اور اس کے گرد و نواح میں بھی پایا جاتا ہے۔ اندلس میں اب بھی اس قسم کے عجیب و غریب مجموعہ سے عمارتیں تیار ہوتی ہیں، اور وہاں کی دیہاتی عورتیں اب بھی اپنی دستکاری میں اس کی پیروی کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صنعت و حرفت اور عام دستکاری میں یہ طریقہ قدیم زمانے سے اب تک نسلاً بعد نسلٍ جاری چلا آتا ہے۔

اس تمام بیان سے اتنا تو ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ عبدالرحمان ثالث کے زمانہ سے پہلے جو اشبیلیہ نے قرطبہ سے زیادہ ترقی کی تھی، اس کا اصلی سبب وہ فنون اور وہ تہذیب تھی جو تین طرح کی عناصر کے امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔ اول یہ کہ قوم گاتھ کے امرا نے (جن کا صدر مقام اشبیلیہ تھا) رومانی روایات کو برقرار رکھا تھا۔ دوم یہ کہ عربوں کا دارالسلطنت بھی وہی اشبیلیہ تھا (اور مسلمانوں کی حکومت اندلس کے تقریباً آخر تک رہا)، اور وہاں یمنی عربوں نے اپنے قدیم تمدن اور تعیش کے حالات اور سامان کو قائم و دائم کر دیا تھا۔ اور سوم یہ کہ یمنی عربوں نے مصر قدیم کے فنون و صناعات کی روایات کو اندلس میں بھی رائج کیا، اور ان کے عمل اور ہر دلعزیز ہونے میں انہوں نے قرطبہ کے غالی المذہب سُنی خیالات اور طرزِ عمل کو اس میں دخل انداز نہیں ہونے دیا۔

اس مضمون پر اطلاع کے جس قدر ذرائع اس وقت تک ہم کو حاصل ہیں ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اشبیلیہ میں کبھی یونانی معمار اور صناع نے کام کیا ہے۔ مگر اس قدر ضرور تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی اشبیلیہ کے شروع کے فنون و صناعات پر عیسائیوں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس میں بھی شک کی گنجایش نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے تمام زمانے میں اندلس کے اکثر گرجاؤں میں مسلمانوں نے کسی طرح کی دست اندازی نہیں کی، خواہ اس دست اندازی کا نتیجہ عمارات کے حسن کی صورت میں رونما ہوتا یا قبح کی۔ اور پھر آخر میں جب فرڈیننڈ نے ملک کو دوبارہ مسلمانوں سے فتح کیا ہے، تب تو ان تمام گرجاؤں کو واپس گرجا کی صورت

میں منتقل کر ہی دیا تھا - اب رہی وہ عمارتیں، جن کی شکل یا انداز کو مسلمانوں نے تبدیل کر دیا تھا، ان کے متعلق اس امر کی شہادت موجود ہے کہ موحدین کے حملے اور حکومت سے قبل جتنقدر تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی ساخت و پرداخت کے لیے قبطی صناع یا اُن کے شاگردوں کو ترمیم پر لگا یا گیا تھا، بعینہ جس طرح کہ مصر کے شیعی مسلمانوں نے قبطی معماروں سے چند عمارتوں کی ترمیم کا کام لیا تھا - اندلسی عمارتوں کی نوکدار محرابوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں یمنی آبادکاروں کے علاقوں کی طرح، بازنطینی اثر نہ تھا بلکہ کوئی اور ہی اثر اپنا کام کر رہا تھا۔

یہ قبطی اثر مغربی اندلس کی عمارتوں کی صرف تعمیر ہی میں نمایاں نہیں ہے، بلکہ اگر عربی قلعوں اور گرجوں کو غور سے دیکھا جائے تو اُن کی دیواروں کی استرکاری اور اُن کی فصیلوں کی اینٹوں میں جو نقش و نگار ہیں وہ بھی اس قبطی اثر کا نمونہ ہیں - برعکس اس کے موحدین کے زمانے میں اس نوع کی جو تعمیرات ہوئی ہیں اُن کی صورت کچھ اور ہی ہے -

افسوس ہے کہ آج کل ہمارے پاس پارچہ بافی، زرگری، شیشہ سازی اور سفال کاری کے وہ نمونے یا آثار موجود نہیں ، جو بقول ابن سعید، اشبیلیہ، مُرسیہ وغیرہ میں اہل یمن کی حکومت کے دوران میں اس قدر نفاست اور حُسن کو پہنچ گئے تھے کہ اُن کے کمال کو پہنچنا مشکل ہے - یہ گیارھویں صدی عیسوی کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ اُس وقت تک قبطی صناعوں کے اندلسی شاگرد اپنے استادوں کے کمال کو حاصل کر چکے ہوں گے - صنعت و حرفت کا یہ کمال صرف حرفت پیشہ لوگوں تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ شاہزادے تک اس کام میں شریک تھے؛ چنانچہ گیارھویں صدی (عیسوی) کے ایک طلائی ظرف پر کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک یمنی شاہزادے کی دستکاری کا نمونہ ہے اور اُس نے اپنے داماد معتمد اشبیلی کے لیے بنایا تھا -

اشبیلیہ میں موحدین کے زمانے میں بھی یمنی قبائل کے افراد ارکان دولت اور عمائد سلطنت میں شامل تھے - اُن کو نہ صرف امور شاہی بلکہ کو الف ملکی میں جو درخور حاصل تھا،

اس کا ایک عمدہ نمونہ جیرالڈا کے مینار میں نظر آتا ہے۔ پھر اس مینار اور معتمد ابن عباد کے قصر کے حصہ زیرین کی ساخت میں جو غائر مناسبت اور مشابہت ہے، اس سے بھی اس اثر کا پتہ چلتا ہے۔ موحدین کے خروج کے بعد عیسائیوں نے اشبیلیہ کی چند عمارتوں میں جو دست اندازی کی اور ان کے حسن وشان کو برباد کیا ہے اُس کا جس قدر رنج کیا جائے بجا ہے۔ اس نافہمی اور کمینہ خیالی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشبیلیہ کے متعدد قیمتی نمونے ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کیلیے اوجھل ہو گئے۔ مسلمانوں کی عمارات کی اندرونی زیبائش، اُن کے شیشہ آلات کی نازکی، سامان نشست وبرخاست کی خوبی ولطافت، پردوں کی چمک ایسی چیزیں تھیں کہ قشتالہ کے عیسائیوں کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ یہ تمام چیزیں خالص عربی ساخت کی تھیں۔ ایک لباس کا ٹکڑا اب بھی میڈرڈ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ قشتالی عیسائیوں نے، اس میں شک نہیں کہ ان اشیاء کے حسن ولطافت کی بخوبی داد دی۔ چند ہی عرصہ میں یہ سامان عیش وزندگی لوگوں میں اس طرح عام ہوا کہ حکومت کی طرف سے اس کی بندش کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ پھر خود اہل دربار اور صاحب دربار کا دل ان چیزوں سے اس قدر سیر ہو گیا کہ نتیجہ بالکل برعکس ہوا اور اُنھوں نے دیدہ ودانستہ اور نہایت بے رحمی کے ساتھ اپنے پیش رو اسلامی حکومت کے ہر طرح کے نشانات کو مٹانا شروع کیا، اور مٹا کے چھوڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(ماخوذ)

محمد نعیم الرحمٰن۔ ایم اے۔ ایم آر اے۔ ایس
(مدراس)

جدید عالمِ اسلامی

مسٹر لوتھروپ اسٹوڈرڈ کی کتاب "جدید عالمِ اسلامی" کے مختلف بابوں کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے۔ موصوف امریکہ کے مشہور ماہر سیاست ہونے کے علاوہ سیاسیاتِ اسلامی کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ کتاب مذکور اس کا بین ثبوت ہے۔

اسلام کی محیر العقول کامیابی کے متعدد اسباب تھے۔ ان میں خاص طور پر ممتاز عربی نسل کی خصوصیات، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور اس زمانہ میں مشرقی دنیا کے حالات ہیں۔ پیروانِ مذہب زرتشت اور عیسائیوں میں آپس کے مذہبی اختلافات پھیلے ہوئے تھے، ایران اور روم کی سلطنتوں میں حال ہی میں ایک ہولناک جنگ ہو چکی تھی، مزید برآں یہ کہ دونوں سلطنتیں بنجۂ استبداد میں گرفتار تھیں جسکی وجہ سے رعایا میں وطن خواہی نیز حکومت کی وفاداری کا خیال مفقود تھا۔ ان لوگوں نے اسلام کے جمہوری اور سادہ اصول بہت جلد قبول کر لیئے اور اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔

علاوہ بریں عربوں میں حکومت قایم کرنے کی خداداد قابلیت موجود تھی۔ وہ غیر مہذب اور جنگجو قوم نہ تھی (جیسا کہ بعض کا خیال ہے) وہ اپنے سے پرانے تمدنوں کے اصول معلوم کرنے کے مشتاق تھے۔ شادی بیاہ کے ذریعہ محکوم اقوام کے ساتھ بہت جلد مل گئے اور اس اختلاط نے ایک نئی تہذیب کی بنا ڈالی جو یونان، روما اور ایران کی قدیم تہذیبوں کی ترکیب، عربی حرارت اور روحِ اسلامی کی رہین منت تھی۔ اپنے ابتدائی تین صدیوں تک (۶۵۰ سے ۱۰۰۰ء) ممالک اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ بڑے بڑے شہر، عالیشان مساجد اور شور و شغب سے مشحون دار العلوم جہاں قدیمی دنیا کے علم و عقل کے محافظ اور قدرداں جمع رہتے تھے ہر جگہ موجود تھیں۔

اسلامی مشرق اور مسیحی مغرب میں اس وقت تضاد تھا کیونکہ تمام یورپ پر جہالت کی اندھیری گھٹا چھا رہی تھی۔ دسویں عیسوی میں عربوں کی اس تہذیب میں تنزل کے آثار صاف نمایاں ہونے لگے خانہ جنگی، حقیقی رہبران ملت کا فقدان اور سب سے بڑھکر ریگستان عرب کی قوت بخش فضا سے محرومی، یہ اسباب تھے جنہوں نے ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیر دیا۔

جب غیر عرب اقوام نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے رسول عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیغام کی تاویل اپنے رجحانات طبع اور نسلی روایات کے مطابق کرنی شروع کی۔ ایران و ہندوستان کا تصوف اور مسئلہ ہمہ اوست، شمالی افریقہ کی پیر پرستی انھیں رجحانات طبعی کا نتیجہ ہیں۔ اسی قسم کے مابعد الطبعی خیالات نے اصل روح اسلامی کو بالکل منقلب کر دیا۔

ان اعتقادی اختلافات کے ساتھ سیاسی اختلافات بھی واقع ہوتے رہے۔ عباسیوں کی جانشینی کے وقت پہلا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ خاندان بنی امیہ کا ایک مغرور فرد قرطبہ میں اپنی علیحدہ خلافت قائم کرتا ہے اور تمام شمالی افریقہ اس کی خلافت کو تسلیم کر لیتی ہے۔ ادھر مصر میں فاطمی خلافت کا قیام عالم اسلامی کے سیاسی اتحاد کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔

مذہبی اور سیاسی اختلافات نے قوم عرب کی دماغی نشو ونما اور قوت فکری کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ عرب اپنے مذہب کے سخت پابند تھے لیکن ان میں تعصب نہ تھا۔ وہ اپنے دماغوں کو ہمیشہ کشادہ رکھتے تھے۔ مشرقی دنیا کے فاتحوں (یعنی عربوں) کے اسلام کے اصول میں حد درجہ سادگی تھی اور اس سادہ مذہبیت نے عربی دماغ کے لئے جو فلک پیما "جستجو پسند" اور علوم کا متلاشی تھا کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی۔ انہوں نے قدیم علوم و فنون کی صرف قدردانی اور سرپرستی ہی نہیں کی بلکہ اپنی مادری زبان میں تمام یونانی اور ایرانی علوم کی کتابوں کو تراجم کے ذریعہ منتقل بھی کر لیا۔

فرقہ معتزلہ صرف فلسفیانہ بحث و مباحث تک محدود نہ رہا بلکہ ان تمام تر تحریک کا رخ مذہبی اور سیاسی استبدادیت کے خلاف رہا۔ انہوں نے عوام الناس میں خلافت کے

نجاب اور خلیفہ کی عامۃ المسلین کو جوابدہی کے متعلق تبلیغ شروع کی۔ حکومت کی طرف سے اس تحریک کا خاتمہ کردیا گیا۔ اس زمانہ سے مسلمانوں کی دماغی نشوونما ایسی رُکی کہ اب ہمارے زمانہ میں اس کے احیاء کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔

عباسیوں میں اپنے آبا و اجداد کی سی تاب و توانائی نہ رہی تھی اس لئے ترکوں کی جماعت جو عرصہ سے معاملات حکومت میں اپنا اثر رکھتی تھی برسراقتدار ہوگئی۔ ترکوں کے زمانہ میں مشرق و مغرب کے تعلقات کی ناخوشگواری بڑھ گئی۔ تمام مسیحی مشرق ترکوں پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ ترکوں کی فتوحات کے بعد "مسیحی جہاد" تمام دنیا کے لئے بہت بڑی بدنصیبی تھی۔

جب اسلامی مشرق ترکوں اور مغلوں کی فتوحات کا آماجگاہ تھا عین اسی زمانہ میں یورپ میں بیداری اور زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ہندوستان اور براعظم امریکہ کے بحری راستوں کی دریافت نے اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اب ملکۂ بحر یعنی یورپ کی جانب قوت کا پانسہ پھر تا ہے۔ سائنس کے طلسم سے یورپ نے میدان ترقی کی مسافت بہت قلیل عرصہ میں طے کرلی۔

بایں ہمہ مسلمانوں نے کروٹ تک نہ بدلی۔ آہستہ آہستہ میراث اسلامی یورپ کے قبضہ میں آگئی۔ اب خدا خدا کرکے مسلمانوں میں یورپ کی یورش کا احساس پیدا ہوا۔ یہ جنگ عظیم مسیحی یورپ کا مسلمانوں کے خلاف آخری حربہ تھا۔ عالم اسلامی کی غلامی کم از کم "کاغذ" پر تو پایۂ تکمیل کو پہونچ ہی گئی۔ میں نے قصداً لفظ "کاغذ پر" اس لئے استعمال کیا کہ عین اسی زمانہ میں جبکہ "مسیحی مغرب" نے اپنے پندار میں اپنے آپ کو "اسلامی مشرق" پر مسلط کرلیا تھا اس وقت مغربی اقتدار کے خلاف جہاد عام بولا جاچکا تھا۔ گزشتہ صدی میں عالم اسلامی میں ایک عظیم الشان انقلاب کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ آخرکار مغرب کی موج تند نے غیر متحرک جسم کو اپنی جگہ سے ہٹادیا۔ مراکش سے چین اور ترکی سے کانگو تک مسلمانوں کو اپنی رسوائی کا احساس پیدا ہوگیا۔ پہلی چنگاری ریگستان عرب ہی میں بھڑکی جو اسلام کا گہوارہ ہے۔ تحریک وہابی مسلمانوں کی اصلاح کے لئے اٹھائی گئی اور اسی کی آغوش میں احیاء و اتحاد

اسلامی کی تحریکوں (پین اسلامزم) نے پرورش پائی جس قدر یورپ کی طرف سے یورش بڑھتی گئی احیاے ملت کے لئے مسلمان زیادہ آمادہ ہوتے گئے۔ یہ صدمہاے جانستاں تھے جو گزر گئے اور اب "جدید عالم اسلامی" کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔

عالم اسلامی اٹھارویں صدی عیسوی میں اپنی انتہائی ذلت کا زمانہ دیکھ چکا ہے۔ علم و مذہب دونوں مردہ ہو چکے تھے۔ مستبدانہ طریق حکومت رائج تھا۔ لیکن اسی زمانہ میں عبدالوہاب کی ریگستان عرب میں گونجتی ہوئی آواز نے تمام عالم اسلامی کے لئے برق کا اثر دکھایا یہ احیاے اسلامی کی ابتدا ہے۔ محمد بن عبدالوہاب شہر نجد میں سنہ ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے علم کا شوق اور رجحان طبع مذہب کی طرف تھا۔ باوجودیکہ ان کے بعد ان کی سیاسی طاقت بہت جلد فنا ہو گئی لیکن ان کا روحانی تصرف اور زاہدانہ زندگی کا اثر برابر قائم رہا۔ ان کی تمامتر تعلیم توہمات کے خلاف تھی لیکن ان کے بعد تنگ نظری ان کے پیرووں میں پیدا ہو گئی۔

اب دوسرا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ آزاد خیالی اس تنگ نظری کا لازمی ردعمل ہوئی آزاد خیال مسلمان مدبرین ہندوستان، ترکی اور مصر میں پیدا ہوئے۔ مدحت پاشا اور رشید پاشا نے ترکی کو ذمہ دار اور جمہوری حکومت بنانے کے لئے جو کوششیں کیں ہمیشہ یادگار رہینگی۔

مصر میں شیخ محمد عبدہ جو آزاد خیال مدبر اور تحریک "احیاء اسلام" کے علمبردار تھے موجودہ تاریخ اسلام کی قابل احترام ہستیوں میں ہیں۔

پین اسلام ازم

درحقیقت تحریک "اتحاد اسلام" تو اسی وقت سے موجود ہے جب کہ رسول عربی کی بعثت ہوئی اور انہوں نے آپس میں ان کافروں کے خلاف ایمان کا عہد کیا جو ان کی تباہی و بربادی کے درپے تھے۔ عالم اسلامی کی یکجہتی فریضۂ حج اور خلافت کے ساتھ قائم ہے۔ عام خیال کے خلاف میری یہ ذاتی رائے ہے کہ صرف حج کی وجہ سے شیرازہ اسلامی منتشر ہونے سے بچا رہا۔ حج درحقیقت "اتحاد اسلام"

کی سالانہ کانگریس ہے جہاں عالم اسلامی کی مدافعت اور بہبود و فلاح کی تدابیر سوچی جاتی ہیں۔ یورپ کے اکثر مدبرین اور اخبار نویس طبقہ کا اب تک یہ خیال ہے کہ اگر "خلافت" کا خاتمہ کر دیا جائے یا شریف مکہ کو خلیفہ بنا دیا جائے تو تحریک "اتحاد اسلام" خود بخود فنا ہو جائے گی۔

اتحاد اسلام سے یورپ کی مخالفت اس وقت سے خیال کی جانے لگی جس وقت سے کہ انگریزوں نے ہندوستان، فرانس نے الجیریا اور روس نے ترکستان فتح کیا۔ تمام سنجیدہ مزاج مسلمانوں کو بھی یقین ہو گیا کہ عنقریب باقی ماندہ ممالک بھی یورپ کے زیر تصرف ہو جائیں گے۔ خوف و نفرت بڑھتی رہی اور اٹھارویں صدی سے اس کا اظہار شروع ہو گیا۔ شمالی افریقہ، الجیریا اور ترکستان کی حکومت کے خلاف بغاوتیں ہوئیں اور افغانستان، وسط ایشیا اور مغربی چین میں نقشبندیہ برادری کی شورشیں دراصل اندرونی اضطراب کے مظاہر تھے۔ اس کے بعد جزائر مشرقی میں ڈچ گورنمنٹ کے خلاف جنگ اچین اور مہدی سوڈانی کی انگریزوں سے جنگ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ان تمام تحریکوں میں عالم اسلامی کی خصوصیت فقدان نظام ہے۔ "تحریک اتحاد اسلام" کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوتا ہے۔ اس تحریک کے دو علیحدہ مرکز قائم ہوتے ہیں لیکن دونوں مقاصد میں مشترک۔

(۱) مذہبی برادریاں — مثلاً سنوسی برادری۔ یہ لوگ اپنے مقاصد کا ذریعہ حصول خالص مذہبی تبلیغ کو ٹھیراتے ہیں اور پیری مریدی کے ذریعہ ان لوگوں کے خیال میں اسلام کو گزشتہ شوکت پھر حاصل ہو سکتی ہے۔

(۲) تبلیغ سیاسی — جمال الدین الافغانی کے رفقائے کار کا یہ طریقہ ہے۔

مذہبی برادریاں شمالی افریقہ میں صدیوں سے موجود ہیں۔ ان کا نظام تقریباً ہر جگہ ایک سا ہے۔ ہر قریہ میں ایک "زاویہ" اور "مقدم" ہوتا ہے۔ "مقدم" اس قریہ کی تمام

برادری کا سردار ہوتا ہے۔ ان برادریوں میں "سنوسی برادری" ممتاز حیثیت رکھتی ہے سید محمد بن سنوسی۔ نظام سنوسیہ کے بانی ہیں۔ انہوں نے طرابلس میں اپنا مشن شروع کیا۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے سنوسی المہدی جانشین ہوئے جن وجوہ سے ان کو اپنے بڑے بھائی پر ترجیح دی گئی وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ سید محمد کے دو بیٹے تھے انہوں نے اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے دونوں کا امتحان لینا چاہا۔ چنانچہ تمام "زاویہ" کے روبرو ان دونوں کو حکم دیا کہ سب سے اونچی کھجور کے درخت پر چڑھ جاؤ۔ جب وہ چوٹی پر پہونچ گئے تو کہا کہ "اللہ اور رسول کے نام پر فوراً کود پڑو" چھوٹا بیٹا بلا تامل کود پڑا اور چونکہ دل میں اعتقاد تھا اس کے چوٹ بھی زیادہ نہ لگی۔ بڑے صاحبزادہ نے انکار کیا اور کہنے لگے کہ "یہ تو خودکشی ہوگی"۔ اس طرح سنوسی المہدی جانشین ہوئے۔ اس واقعہ سے ان لوگوں کی مذہبیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ تمام شمالی افریقہ میں ان کے "زاویہ" موجود ہیں۔ ایک "زاویہ اکبر" ہے جہاں سے سب کو ہدایات بھیجی جاتی ہیں۔ ان کا امیر السنوسی کہلاتا ہے۔

ان کا مقصد ہے کہ افریقہ کو اور بعد ازاں "عالم اسلامی" کو ایک امام کے ماتحت لایا جائے اور ان کے نزدیک سیاسی غلامی سے اسوقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک کہ سب مسلمانوں میں رشد و ارشاد کے ذریعہ روحانی تعلق نہ قائم ہوجائے۔

انہوں نے ہر جگہ اپنے مدارس قائم کر لئے ہیں جہاں تبلیغ مذہب طلبا کو سکھلائی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہر سال اپنی جماعت میں لاکھوں مسلمانوں کا اضافہ کرتے ہیں۔

تاتار عرصہ سے روسیوں کے زیر تسلط ہے اور یہاں کے مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے عیسائی بنانے کو زور ڈالا گیا لیکن یہ لوگ سب مصائب اپنے ایمان کی خاطر برداشت کرتے رہے انیسویں صدی کے نصف میں جب کہ "اتحاد اسلام" کی موج ہر طرف لہریں مار رہی تھی یہ دور دراز راہ ملک بھی اثر سے علیحدہ نہ رہ سکا۔ یعقوب بیگ نے ترکستان اور مغربی چین کے مسلمانوں میں حکومت کے خلاف آزادی کامل کا اعلان کرادیا۔ سلطان ٹرکی کی طرف سے

ان کو خطاب و خلعت بھی عطا ہوا - اگرچہ چینی گورنمنٹ نے ان کی تحریک کا خاتمہ کر دیا لیکن یہ بڑی غلطی ہوگی اگر تحریکوں کے عارضی دب جانے کو فنا ہونا کہا جائے۔

سید جمال الدین الافغانی تحریک "اتحادِ اسلام" میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں وہ مقام اسد آباد نزدِ ہمدان پیدا ہوئے۔ ان کے نام سے واضح ہے کہ وہ افغانی نسل سے تھے اور ان کی رگوں میں عربی خون بھی تھا۔ برخلاف ہمعصروں کے انہوں نے تمام تر توجہ میدان سیاست کی طرف منعطف کی۔ یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغربی اقتدار پسندی کی ماہیت کو سمجھا اور اپنی عمر "عالم اسلامی" کو اس کے خلاف مدافعت کے لئے تیار کرنے میں صرف کی۔ تھوڑے عرصہ تک ہندوستان میں قید رہنے کے بعد وہ ۱۸۷۱ء میں مصر پہونچے۔ یورپیوں کے خلاف عربی پاشا کی تحریک انہیں کے ایما سے ہوئی۔ ۱۸۸۲ء میں جب انگریزوں کا قبضہ مصر مکمل ہوگیا تو سید موصوف جلاوطن کر دیئے گئے کچھ عرصہ تک بے خانماں پھرنے کے بعد قسطنطنیہ پہونچے۔ سلطان عبدالحمید خاں پر جو "اتحاد اسلامی" کے حامی تھے انہوں نے بہت جلد اپنا اثر جمالیا۔ محکمہ تبلیغ و اشاعت کا افسر اعلیٰ ان کو بنا دیا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے انتقال کیا اور آخر وقت تک اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں رہے۔

عبدالحمید خاں ۱۸۷۶ء میں تخت سلطنت پر متمکن ہوئے جنگ روس سے قبل ترکی میں ان مدبرین کا گروہ برسرِ اقتدار رہا جو ترکی کو یورپ کی دوسری حکومتوں کی طرح موجودہ تہذیب و تمدن کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ انہوں نے جمہوری حکومت کو رائج کیا لیکن جب عبدالحمید خاں کا زمانہ شروع ہوا تو انہوں نے عطا کردہ اختیارات ضبط کر لئے اور مستبدانہ حکومت قائم کر دی۔ عبدالحمید خاں نے "اتحادِ اسلام" کے استحکام کے لئے باقاعدہ ایک نظام تیار کیا تھا لیکن ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کے انقلاب نے ان کی اسکیم کو دگرگوں کر دیا۔

اسی زمانہ میں ایران میں بھی انقلاب رونما ہوا۔ دستوریت، قومیت اور اشتراکیت

کے خیالات عالم اسلامی میں پھیل رہے تھے۔ ان گوناگوں خیالات کی وجہ سے "اتحاد اسلام" کا مفہوم خبط ہو گیا لیکن ۱۹۱۲ء میں یورپ کی طرف سے دباؤ پڑنے کی وجہ سے یہ تحریک پھر اپنے اصل رنگ میں ظاہر ہوئی۔ اٹلی نے ۱۹۱۲ء میں طرابلس پر جو ٹرکی کے ماتحت تھا حملہ کیا اور اس کے فوراً بعد جنگ بلقان شروع ہو گئی جس کے خاتمہ پر یورپین صوبے جو ٹرکی کے ماتحت تھے عین قسطنطنیہ کی دیواروں تک چھین لیے گئے۔ انگلستان اور روس نے ایران پر اپنی دیرینہ آرزوئیں پوری کیں اُدھر فرانس نے مراکش پر تسلط جمانے کی ٹھانی غرضکہ یورپ کی عنایات سے تحریک "اتحاد اسلام" میں جان پڑ گئی۔

جنگ طرابلس سے قبل ترکوں اور عربوں کے تعلقات ناخوشگوار تھے۔ اس جنگ بلقان نے ان کے تعلقات میں یگانگت پیدا کر دی۔ جنگ طرابلس کے موقعہ پر فرانس کے وزیر اعظم نے بالکل درست کہا تھا:۔ "اٹلی نے جب جامد کو متحرک کیا ہے نہ صرف اس کو بلکہ ہم سب کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑیگا"

ہندوستان اور چین کے مسلمان ابتک اپنے ملکوں کی حکومت کے خلاف تحریکوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے لیکن اب انھوں نے بھی اپنے غیر مذہب ملکی بھائیوں کے ساتھ جو آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے کھلی ہمدردی ظاہر کرنا شروع کر دی۔ جنگ عظیم کے دوران میں مسلمان اس لیے خاموش رہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو جانتے تھے اور فیصلہ کن جنگ کے لیے تیاری کرنا انکے نزدیک قرین مصلحت نہیں معلوم ہوا۔ صلح ورسیلز نے یورپین ارادوں کی توضیح کر دی اور مسلم لیڈروں کو تمام دنیا کے مسلمانوں کی اخلاقی و مادی مدد حاصل کرنے کا زرین موقعہ مل گیا۔

مغربی اثر

اس وقت عالم اسلامی میں مغرب کی کورانہ تقلید نہیں کی جا رہی ہے بلکہ مشرقی مقاصد کے حصول کے لیے مغربی ذرائع اختیار کیے جا رہے ہیں۔

مشرق پر مغرب کا اثر پڑنے کی اصل وجہ تو اس کی سیاسی حکمرانی ہے۔ مغرب کے گوناگوں خیالات نے زیادہ تر تعلیم یافتہ جماعت پر اثر کیا لیکن وہی یورپ پرست نوجوان اپنی امیدوں میں ناکام ہوئے تو مغرب کے تمام محاسن کے منکر ہو گئے اور ان کے سخت ترین دشمن بن گئے۔

درحقیقت مغرب کی طرح مشرق کی خصوصیات زندگی علیٰحدہ ہیں لیکن گذشتہ دس صدیوں میں عادات حسنہ کے بجائے برائیاں زیادہ تر اختیار کی جارہی ہیں جس کا نتیجہ عدم ترقی، جمود، ذلت و غلامی ہے۔

مشرقیوں کے نزدیک یورپینوں کا ان کے ممالک میں رہنا چاہے وہ کتنے ہی علیٰحدہ کیوں نہ رہتے ہوں ایک مستقل ذلت ہے۔ مشرق میں یورپین کا وجود نہ صرف ایک غیر ملکی کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اجنبی حاکم کی جسکا تعلق دوسری نسل سے ہے بنی نوع انسان کی نسلی تقسیمیں انسانی تجربہ میں سب سے زیادہ اہم، دیرپا اور کبھی نہ محو ہونے والے نقوش ہیں۔ اختلاط نسل کے ذریعہ خصوصیات فنا ہو جاتے ہیں اور امتیازات کو مٹانے کی کوشش سے بجائے نفع کے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے۔ علیٰحدہ رہکر دونسلیں تبادلہ خیالات کے ذریعہ تہذیب و تمدن کے میدان میں زیادہ پیشقدمی کرسکتی ہیں۔

سیاسی تبدیلی مشرق کی ترقی کی سب سے بڑی سدراہ اسکی سیاسی روایات ہیں۔ طریقہ استبدادیت یہاں قدیم زمانہ سے رائج چلا آتا ہے۔ بادشاہ اپنی مرضی و منشار کے موافق سفید و سیاہ کرسکتا ہے۔ رعایا کی حیثیت بمنزلہ غلام کے ہوتی ہے۔ جس کی ذاتی ملکیت، عزت و شرف یہاں تک کہ اس کی جان بھی حاکم کی مرضی کے تابع ہوتی ہے۔ مشرق کی یہ خوش قسمتی ہے کہ بادشاہوں کی استبداد پسند طبائع پر مذہب کا پُرخوشگوار اثر رہا۔ خوف خدا کی وجہ سے یہ لوگ رحم و انصاف کی حدود سے متجاوز نہیں ہونے پاتے تھے۔ بایں ہمہ ایک رحم دل بادشاہ کے یہ اختیار کی بات تھی کہ راتوں رات اپنی مستقل عادت بدل ڈالے یا کسی عورت پر فریفتگی یا اپنے معدہ کی کسی خرابی کی وجہ سے پوری سلطنت کی قسمت کو معرض خطر میں ڈالدے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یہ طریقہ حکومت ہر جگہ رائج تھا۔ تحریک "احیائے اسلام" نے نہ صرف مذہبی امور کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا بلکہ اس زمانہ کے مستبدانہ طرز حکومت کے خلاف بھی انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ٹرکی میں

اعتدال پسند جماعت نے کمزور سلطان سے پارلیمنٹ کے اختیارات کی منظوری لے ہی لی لیکن اس کے فوراً بعد عبدالحمید خاں نے وہ سب اختیارات عملاً واپس لے لیے۔ دیگر ممالک اسلامی میں بھی آزاد خیال اور تعلیم یافتہ جماعت میں اسی قسم کی سیاسی امنگیں موجود تھیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں مسلمانوں کی سیاسی روایات سب سے زیادہ جمہوریت کی طرف مائل ہیں۔ مذہبی اصول کے علاوہ اس مذہب نے عربوں کی حریت پسند قوم کے گہوارہ میں ابتدائی زندگی گزاری ہے۔ اسی لیے حریت و مساوات کے رجحانات مسلمانوں سے زیادہ اور کسی قوم میں نہ ملیں گے۔ ڈمبری نے ٹھیک کہا ہے: "دنیا میں سب سے زیادہ جمہوریت نواز اور حریت پسند و مساوات، پسند مذہب اسلام ہے۔ دنیا میں اگر کبھی آئینی و دستوری حکومت قائم ہوئی ہے تو یقیناً وہ خلفائے راشدین کے عہد میں ہوئی۔"

قومیت قومیت موجودہ سیاسیات عالم کی روح رواں ہے انیسویں صدی میں قومیت کے جذبہ نے یورپ کی صورت حالات کو بالکل منقلب کر دیا۔ اسی لیے اس زمانہ کو "عہد قومیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ قومیت کے جذبات صرف یورپ ہی تک محدود نہیں ہیں۔ اب تو دنیا کا گوشہ گوشہ اسی جذبہ کے زیر اثر ہے۔ آخر قومیت ہے کیا؟۔ اس کی بہت سی تعریفیں کی گئیں ہیں۔ اکثر نے نسل و زبان کو بعض نے تہذیب و مذہب اور جغرافی حدود کو، اور بعضوں نے سیاسی و اقتصادی اغراض کے اشتراک کو اس کا مرادف ٹھیرایا ہے۔ لیکن قومیت اپنے ان اجزائے لاینفک سے بالاتر ہے۔ درحقیقت وہ ایک کیف نفسی ہے۔ یہ انسانوں کی ایک جماعت کے اعتقاد کا نام ہے۔ قوم کی جامع تعریف یہ ہے کہ جو لوگ مخصوص و متعین جغرافی حدود میں آباد ہوں، ایک مقصد رکھتے ہوں اور سب ایک ہی حکومت کے ماتحت ہوں قومیت اور نسل کے فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے۔ قومیت کا وجود دماغی کیفیت سے زیادہ نہیں برخلاف اس کے نسل ایک واقعیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کی علمی تحقیق و تصدیق ہوسکتی ہے مثلاً سر کی پیمائش، بالوں کی ساخت، آنکھوں کا رنگ وغیرہ

میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے لوگوں کے ایک خاص خیال کو قومیت کہہ سکتے ہیں۔

موجودہ عہد میں قومیت سیاسی زندگی پر حکمراں ہے اور عملی سیاسیات میں لوگ یہ نہیں خیال کرتے کہ واقعتاً وہ کیا ہیں بلکہ وہ کیا خیال رکھتے ہیں۔ رنگ و نسل کے نام پر شاید ایک یورپین اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے لیکن وہ اپنی خیالی نسل کی خاطر (جس کو وہ قوم کہتا ہے) جان فدا کر دینے میں بھی دریغ نہ کریگا۔

قومیت اور مسلمان سید جمال الدین الافغانی کی تعلیمات میں بھی قومی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ سید موصوف بادی النظر میں بین الاقوامی آدمی ہیں لیکن اگر بہ نظر تدقیق دیکھا جائے تو ان کی مثال "قومیت اسلامی" اور "اتحاد اسلام" کو منسلک کرنے والی کڑی کی ہے۔

ترکوں میں اپنی تعلیم کی وجہ سے جذبۂ قومی سب سے پہلے پیدا ہوا۔ قومی رہنماؤں نے عہد ماضی کے قومی کارنامے یاد دلا کر اور مستقبل کا یقین رکھتے ہوئے قوم میں بیداری پیدا کر دی۔ جیسا کہ قاعدہ ہے کہ قومی بیداری کے ساتھ نہضت علوم از خود عمل میں آجاتی ہے ترکوں نے بھی اپنی زبان ترکی کو بہت ترقی دی اور تمام علوم اس میں منتقل کر لیے۔ یورپ کی طرف سے سیاسی دباؤ نے قومیت ترکی کے ارتقا کے لیے اکسیر کا اثر کیا۔

عربی قومیت عرب قوم پرستوں کے ایما سے شام میں جو بغاوت ظہور پذیر ہوئی اگرچہ بہت جلد فرو کر دی گئی لیکن اس نے تمام دنیا کی نگاہیں تحریک "اتحاد عرب" کی طرف متوجہ کر دیں۔ عبدالحمید خاں کے دوران حکومت میں عربوں میں دو متضاد قوتیں عمل کر رہی تھیں۔ اگر ایک طرف قومی امنگیں ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کو مجبور کرتی تھیں تو دوسری طرف جذبۂ "اتحاد اسلامی" ان کو ترکوں کے خلاف کوئی ایسی کارروائی کرنے سے مانع تھا جس سے اسلام کے مفاد عام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

نوجوان ترکوں کے انقلاب کے بعد عربوں کی امیدیں پوری نہ کیں۔ پارلیمنٹ ان کے لیے دراصل فریب نظر تھا۔ چنانچہ عرب وطن پرستوں نے مصر اور شمالی افریقہ کے باشندوں کے ساتھ جو عربی زبان بولتے تھے رشتۂ اتحاد قائم کیا۔ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے پیرس میں کانگریس منعقد کی اور اس کے بعد ترکوں کے خلاف پروپگنڈہ شروع کردیا۔ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کے جذبات بے چینی اور اضطراب کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ مزید برآں اتحادیوں کے سبز باغ دکھانے نے عربوں کو ترکوں کے خلاف جان توڑ کر لڑنے کو آمادہ کیا۔ ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ کا ترکوں سے آمادۂ پیکار ہونا دراصل ترکوں کی شکست کا پیش خیمہ تھا۔

مصر یورپ سے قریب ہونے کی وجہ سے مصر نے وہاں کے خیالات کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ محمد علی نے اپنی گورنمنٹ کے تمام محکموں اور شعبوں میں مغربی طریقے رائج کرائے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین بھی عرصہ تک انھیں اصول کی پیروی کرتے رہے۔ خدیو اسمٰعیل جس کی مسرفانہ زندگی نے یورپ کی مداخلت کے لیے ایک بہانہ مہیا کردیا تھا اپنی مغربیت پر فخر کرتا تھا۔ مصریوں کی قومیت کا جذبہ اس مسرف خدیو کے خلاف پیدا ہوا۔ چونکہ اسمٰعیل نے بے تحاشہ قرض لے کر پورے مصر کو یورپ کی قوموں کے پاس رہن رکھدیا نیز ان کو ہر قسم کی داخلی مراعات عطا کیں۔ اسی بیداری کے زمانہ میں سید جمال الدین الافغانی کی شخصیت نے اپنا اثر قائم کیا۔ فی الواقع مصری قومی تحریک کے اصلی بانی سید موصوف ہیں۔ نہ صرف شورش پسند طبائع نے انکا اثر قبول کیا بلکہ دوراندیش اور اعتدال پسند مصلح محمد عبدہ وغیرہ جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ذرائع ارتقائی میں یقین رکھتے تھے ان کے حاکمانہ اثر سے نہ بچ سکے۔

انگلستان نے بغیر کہے سنے ازخود تمام یورپ کے نمایندہ کی حیثیت سے مصری سیاست میں دخل دینا شروع کیا۔ انگلستان کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر یورپ میں اظہار ناراضگی کیا

گیا۔ لیکن انگلستان نے بالآخر قبضہ کر ہی لیا اور اس اعلان کا اعادہ کیا کہ قبضۂ مصر محض عارضی ہے تاکہ فرانس وغیرہ کی مخالفت کم ہو۔ مصر میں ۱۸۸۲ء میں جو تحریک انقلاب عربی پاشا کے زیر نگرانی ہوئی اس میں اور اس کے بعد ہی فرانس کا انگلستان کی رقابت کی وجہ سے ہمدردانہ رویہ بھی قابل اعتنا ہے۔ اس کے بعد مصطفےٰ کامل نے جو تمام رہنمایان مصر میں اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے ممتاز تھے تحریک آزادیٔ مصر شروع کی۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے صرف ۳۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ مصر کو ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد فرید بیگ جو اگرچہ ان کے شاگرد تھے لیکن اس پایہ کے نہ تھے تحریک آزادی میں پیش پیش ہوئے۔ لارڈ کچنر کے ظلم و تعدی نے ان عیسائی فلاحین کو جو اب تک تحریک آزادی میں شرکت نہ کرتے تھے قوم پرستوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ جنگ عظیم کے آغاز پر خدیو عباس حلمی نے بالاعلان ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب ترکی نے بھی محاربین سے ایک کا ساتھ دیا تو انگریزوں نے عباس حلمی کو برطرف کر کے ان کے بھتیجے حسین کامل کو سلطان نامزد کیا۔ لارڈ ملنر کے کمیشن کے ساتھ میرے خیال میں زاغلول پاشا بہت جلد مصالحت کر لیتے اگر انگلستان واقعی مصالحت کی خواہش کرتا۔ چونکہ انگلستان کی گورنمنٹ نے لارڈ ملنر کی سفارشیں قبول کرنے سے انکار کیا مجبوراً وہ مستعفی ہو گئے۔

ہندوستانی قومیت

ہندوستان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہ سرزمین اپنی گوناگون بوقلمونی کی وجہ سے ہمیشہ سے مشہور ہے باوجود جغرافی حدود ایک ہونے کے ہندوستان کو آج تک سیاسی اتحاد نصیب نہیں ہوا۔ اگرچہ یہ ملک جنگجو قوموں کا گہوارہ ہے بایں ہمہ یہ بیرونی حملہ آور کے مقابلہ کی کبھی تاب نہ لایا۔ مدت مدید سے یہاں متعدد نسلیں پہلو بہ پہلو بستی ہیں لیکن ہمیشہ ایک دوسرے سے علیحدہ اور متنفر رہیں۔ اس لیے ہندوستان جو تقریباً یورپ کے برابر ہے نہ یورپ کا سا مخصوص قومی تباین پیدا کر سکا اور نہ چین کی طرح عام قومی وحدانیت کی تعمیر میں اس کو کبھی کامیابی ہوئی۔ اس قسم کے دونوں رجحانات یہاں ہمیشہ موجود رہے لیکن کسی ایک کو بھی ترقی کے لیے موافق اسباب میسر نہ آسکے۔

ہندوستان کی تاریخ تین بیرونی حملوں سے اثر پذیر ہوئی ہے۔ آرین حملہ ۱۵۰۰ ق م میں اور اسلامی حملہ ۸۰۰ء میں، اور انگریزی حملہ ۱۸۰۰ء میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ جس ملک میں معاشرتی یگانگت اور سیاسی اتحاد مفقود ہوں وہ کیونکر حملہ آور کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے بچ سکے گا۔
یہاں کے لوگوں کا جمود اور بے توجہی اس سے عیاں ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے (۱۸۸۵ء) قیام سے قبل کوئی منظم تحریک آزادی حاصل کرنے کے لیے بیس صدیوں میں نہیں کی گئی۔ اتنے بڑے ملک میں اگر تھوڑا سا ہیجان پیدا ہوا تو اس کو باقاعدہ تحریک نہیں کہہ سکتے۔ دل یہ بھی درست ہے کہ جو آسانیاں اس زمانہ میں موجود ہیں قدیم زمانہ میں بادشاہوں کے استبداد کی وجہ سے میسر نہ تھیں۔
کانگریس عرصہ تک معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ رہی اور ہندوستانی قومیت بہت زمانہ تک ہندو تحریک کے مرادف رہی۔ مسلمان کانگریس کی کارروائیوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے نیز برطانیہ عظمیٰ کی وفاداری کو اپنا طغرائے امتیاز قرار دیتے ہوئے مخالفت کرتے رہے اس میں شک نہیں کہ مشرق میں جو بیداری کی روح پیدا ہو رہی تھی ہندوستانی مسلمان بھی اس کے اثر قبول کرنے سے مستثنیٰ نہ تھے۔
سنہ ۱۹۰۴ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیان مغرب مشرق کیساتھ بڑا ہی خطرناک کھیل کھیل رہا تھا۔ روس و جاپان کی جنگ نے مشرق کو مغرب کے خلاف آمادۂ پیکار کر دیا تھا۔ اس جنگ کے بعد تقسیم بنگالہ کے معاملہ نے اصلی معنیٰ میں ہندوستانی سیاسی تحریک کا آغاز کیا۔
جان مارلے نے اس وقت اپنی حکمت عملی سے ہندوستان کی صورت حالات کو سنبھال لیا۔ انڈین کونسل ایکٹ انھیں کی جانفشانی کا نتیجہ تھا۔ اس کے ذریعے اعتدال پسندوں اور قوم پرستوں کی معتد بہ جماعت مطمئن ہو گئی۔ اگرچہ مسلمانوں نے اپنا علیحدہ سیاسی نظام "مسلم لیگ" قائم کی تھی لیکن آہستہ آہستہ مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہونے لگے نیز عملی حصہ لینے لگے۔
دوران جنگ میں ہندوستان ایسا خاموش رہا جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

۱۹۱۷ء میں مسٹر مانٹیگو ہندوستان گئے اور اپنی مبسوط رپورٹ پیش کی مرکزی اور صوبہ کی گورنمنٹوں کو مراعات بھی دی گئیں اور گورنمنٹ کو ایگزیکیٹو کونسلروں اور وزیروں کے ذریعہ ذمہ دار بنانے کی رسمِ تعارف کی گئی۔

ترکوں کے ساتھ انگریزوں کی بدسلوکی نے ہندوستانی مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا اور وہ کانگریس میں ہندوؤں کے ساتھ شریک کار بن گئے۔

۱۹۱۹ء ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہیگا۔ اسی سال افغانستان سے جنگ چھڑ گئی اور لاکھوں جانیں قحط اور انفلوئنزا کے نذر ہوئیں جب ہندوستان کے سیاسی مطلع نے خطرناک صورت اختیار کرنی شروع کی مسٹر مانٹیگو کی رپورٹ قانون کی شکل میں پارلیمنٹ میں منظور کی گئی۔

جسٹس رولٹ نے اپنے خاص کمیشن کی جو رپورٹ پیش کی جبر و سخت گیری کی پالیسی اختیار کرنے کی سفارش کی اور امپیریل کونسل میں یہ بل انگریز نامزد ممبروں کی مدد سے منظور کیا گیا باوجودیکہ تمام ہندوستانی ممبروں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں پورے ملک میں سوگ منایا گیا اور امرتسر کا مشہور واقعہ انہیں ایام میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد مسٹر گاندھی کے زیر سرکردگی تحریک عدم تعاون شروع ہوئی۔

معاشی تغیر

موجودہ تاریخ عالم کا سب سے زیادہ دلچسپ باب مغرب کی مشرق پر کامیابی ہے سیاسی فتحمندی ہی نہیں بلکہ معاشی بھی اور یہ اور بھی زیادہ اثر رکھنے والی اور دیرپا ہے جس طرح کولمبس اور واسکوڈی گاما کی بحری دریافتوں نے سیاست عالم کی کنجی یورپ کے ہاتھ میں دیدی اسی طرح اٹھارھویں صدی کی ایجادات سائنس نے صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کو معاشی حکمراں بنا دیا۔

مغرب کے مقابلہ میں مشرق کی عدم قابلیت طریق پیدایش نیز سرمایہ کی کمی اور خود دولت کی خاص ذہنی کیفیت کی وجہ سے ہے۔ روپیہ مشرق میں بادشاہ اور کسان دونوں کے نزدیک

ذریعہ تبادلہ نہیں خیال کیا جاتا۔ ان کے نزدیک بہترین صورت دفینہ رکھنا ہے۔ قرض کا رواج ہے لیکن مزید منافع حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ تعیشات کے لیے۔ اس لیے قرض بجائے مزید دولت آفرین ہونے کے تباہ کن ہے۔

معاشرتی تغیر

مشرق کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر رسوم کا ایسا گہرا اثر ہے کہ سطحیں اصحاب بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ مشرق میں باوجود مادی ترقی کے معاشرتی زندگی میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ لیکن یہ معاشرتی زندگی کے حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ ہئیت اجتماعیہ مادی تبدیلی کا ویسا ہی اثر قبول کرتی ہے جس طرح خیالات و اعتقادات کا۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ ترکی، مصر اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ جماعت نے لباس، طرز بود و باش اور شرابخواری یورپ کی تقلید میں اختیار کی ہیں؟ عوام میں بھی مدنی زندگی کی وہی خرابیاں جو یورپ میں موجود ہیں، ان ممالک کے صنعتی شہروں میں پائی جاتی ہیں۔

عام بے چینی

اضطراب ہر تغیر کا اور خاصکر اچانک انقلاب کا لازمی نتیجہ ہے۔ گذشتہ کے تسلسل اوقات کا انقطاع خواہ ناگزیر ہی کیوں نہ ہو تبدیل شدہ حالات کے ساتھ مطابقت کی ضرورت محسوس کراتا ہے جس کا نتیجہ ہیئت اجتماعیہ میں اضطراب و بے چینی ہے اور جبتک کہ مطابقت کلی حاصل نہ ہو جائے ہیجان برابر جاری رہتا ہے۔ ہیجان کوئی غیر معمولی مظہر نہیں ہے! جب تک انسانی سوسائٹی جمود میں مبتلا نہ ہو جائے اس کا پایا جانا ضروری ہے۔ دراصل ہیجان صحت کی نشانی ہے نہ کہ علامت بیماری معمولاً ہئیت اجتماعیہ کی کارگذاری بعینہ فرد واحد کی سی ہے۔ زندگی کی گوناگوں تبدیلیوں کے ساتھ مطابقت حاصل کرنے کے لیے اس میں بھی تخلیق و تخریب برابر جاری رہتی ہیں۔ ہیجان عمیق عدم صحت کی علامت ہے اور اس دشوار حالت کا پیش خیمہ ہے جس کو "انقلاب" کہتے ہیں۔

جنگ عظیم نے ہیجانات اندرونی کے اظہار کا موقعہ بہم پہنچا دیا۔ مشرق قریب اور مشرق وسطےٰ بالشویک اثر سے محفوظ نہ رہے لیکن ان ممالک کے قوم پرست رہنماؤں نے اس مثل کی حقیقت

کو آویزۂ گوش بنایا کہ "شیطان کے ساتھ شوربہ پینے کے لیے بہت بڑا چمچہ درکار ہے"
چنانچہ انھوں نے اصول اشتراکیت سے بیزاری ظاہر کی اور روسیوں کو اپنی ریشہ دوانیوں
میں ویسی کامیابی نہ ہوئی جس کے وہ متوقع تھے۔

غرضکہ مسلمانان عالم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں مغرب کے جدید خیالات
کی اثر پذیری کی وجہ سے اور نیز اپنی ناگفتہ بہ حالت کو سدھارنے کے خیال سے ایک عظیم الشان
ہیجان پیدا ہے جیسا کہ صدیوں کبھی نہ ہوا تھا بادی النظر میں یہ ہیجان بالکل سطحی معلوم ہوتا ہے
لیکن نہیں۔ اس کی جڑیں عمیق ترین خیالات میں پوشیدہ ہیں۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ جب کسی قوم میں اصلاح کے لیے ہیجان اور خواہش دونوں پائی جاویں
اس قوم میں اصلاح ضرور ظہور پذیر ہوتی ہے۔

ان گوناگوں اثرات سے موجودہ تاریک مستقبل کی امید افزا جھلک سے مبدل ہو جاتی
ہے کیونکہ اب تو ہم اپنے روبرو "جدید عالم اسلامی" کی تعمیر دیکھ رہے ہیں۔

یوسف حسین

اسلام اور سرمایہ داری

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا، فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا، فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا، فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا، فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا، اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ، وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِیْدٌ، وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ، اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ، وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ، اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ۔

غارتگروں کے گھوڑے جو دوڑتے ہوئے ہانپتے ہیں، جن کی ٹاپوں سے چنگاریاں اڑتی ہیں، جو گرد اڑاتے ہوئے علی الصباح غارتگری کرتے ہیں اور جماعتوں میں گھس پڑتے ہیں، اس امر حقیقت کا ثبوت ہیں کہ انسان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہے، اسے اس کا اعتراف بھی ہے، اور اسے مال و دولت کی سخت محبت ہے کیا وہ نہیں جانتا کہ جب گوروالوں کو اٹھایا جائے گا اور جب سینوں کے مخفی اسرار معلوم ہونگے اس دن خدا بھی ان کے حالات سے خوب ہی باخبر ہوگا۔

اس سورۂ پاک میں انسان کے دو اخلاقی معائب کا ذکر ہے، (۱) ناقدردانی حق (۲) مال و دولت کی محبت، اسلام جب مال کو سخت ترین گناہ بتاتا ہے، مگر دنیا ہے کہ روپیہ کی بندہ ہو رہی ہے جن چیزوں کو دولت کہا جاسکتا ہے، ان کے لیے ہماری زبانوں پر "مال" کا لفظ مستعمل ہے (مال، میلان دخواہش، کے لفظ سے بنا ہے، مال کا اصلی ترجمہ "قابل رغبت" ہے۔ یہ لفظ ہمارے ان باطل اور ناراست عقیدہ کی تصویر ہے جو مدتوں سے ہمارے ذہنوں میں قایم ہے، یعنی روپیہ، پیسہ، سونا، چاندی وغیرہ چیزیں خدا کی نعمتیں ہیں، اور خداوند عالم جن سے خوش ہوتا ہے انہیں کو دیدیتا ہے، عرب کا عقیدہ تھا کہ آل و مال کی زیادتی خوشنودی الٰہی اور تقرب بارگاہ ایزدی کے امتیازی نشانات ہیں، قرآن مجید نے سورۂ نون میں اس خیال کی تکذیب کی ہے اور فرمایا کہ مال اور دولت خداوند کی خوشنودی کا ثمرہ نہیں بلکہ قادر علیم کی طرف سے ابتلا و آزمائش بنکر نازل ہوتے ہیں۔ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ۔

عرب کی عام زبان نے اس قسم کی چیزوں کو مال (قابل رغبت) خیر (سرمایہ نکوکاری) اور فضلاً من اللہ (خدا کی مہربانی) کے القاب دے رکھے تھے مگر اسلام نے بقدر کفاف کو مستثنےٰ کر دینے کے بعد دولتمندی کو ایک بری شئے قرار دیا۔ عرب نے مال و دولت کا نام خیر (سرمایہ نکوکاری) رکھا تھا۔ شیخ سعدی نے دولت و فقر کا موازنہ کرتے ہوئے، دولتمندوں کو ترجیح دی ہے اور فرمایا کہ دولتمند تو، اطمینان خاطر سے ابت نیک کام کر سکتے ہیں۔ فقیر کو نعمت میسر نہیں۔

پراگندہ روزی پراگندہ دل

تو کے بدولت ایشاں رسی کہ نتوانی ٭ بجز دو رکعت و آں ہم بصد پریشانی

لیکن خدائے اسلام جو تمام اسرار و حکم کا خالق ہے اس باطل خیال کی سخت تردید فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ اگر خدا وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ اپنے بندوں کی روزی فراخ کر دے تو وہ زمین میں فساد مچانے لگیں۔

اسی مضمون کو سورۂ تکاثر میں دوسرے پیرائے کے ساتھ ادا فرمایا

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ

دولت کی بہتات تم کو قبر تک لہو و لعب میں مشغول رکھتی ہے۔ لیکن نہیں عنقریب تم کو نتیجہ معلوم ہو جائیگا۔

(اور تم دیکھو گے کہ ہم کیا سزا دیں گے) دنیا والوں نے مال و دولت اور جاہ و ثروت کے وجود کو رضائے ایزدی کی ضمانت قرار دیا تھا کہ خدائے علیم نے فرمایا۔

وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ وَزُخْرُفًا

تمام لوگوں کے ایک مذہب پر ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو جو لوگ رحمان کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے گھروں کی چھتوں کو چڑھنے کی سیڑھیوں کو اور ان گھروں کے دروازوں کو، اور ٹیک لگانے کے تختوں کو چاندی سونے کی بنا دیتے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہی چیزیں جن کو ہم نے خدا کا فضل قرار دیا ہے ایک گونہ عذاب ہیں،

دنیا جس چیز کے لیے بے چین رہا کرتی ہے وہ درد ہے درمان نہیں، روپیہ جن کو ہم بہت محبوب رکھتے ہیں وہ امراض کا علاج نہیں بلکہ خود مرض ہیں۔

قرآن مجید نے دولت کے متعلق مندرجہ بالا خیالات قایم کرنے کی ہدایت کی ہے، پھر بھی ہر مسلمان پر کسب حلال فرض کیا گیا ہے، اور حکم دیا گیا ہے کہ وَابْتَغُوا فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ اور اللہ کی رضامندی اور اس کے فضل کی تلاش کرو۔

اصل یہ ہے کہ "دولت" بری چیز نہیں اصلی بری "تکاثر" ہے، خدا کی مرضی یہ ہے کہ اس سلطنت کے کسی بندہ کے پاس بہت زیادہ دولت جمع نہ ہو، اسلام کے بہت سے احکام اسی "تکاثر" کی مخالفت پر مبنی ہیں، ہمارا قانون وراثت صرف "تکاثر" کو مٹانے کا ایک آلہ ہے، زکوٰۃ فرض کی گئی ہے تاکہ تکاثر پیدا نہ ہو، جمع مال کی سخت ممانعت ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللّٰهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ○

ہر عیب چین پر افسوس جو آوازے کستا ہے، مال جمع کرتا ہے، اور گن گن کر رکھتا ہے، گمان کرتا ہے کہ مال کی بدولت وہ ہمیشہ زندہ رہیگا ہرگز نہیں۔ ایک نہ ایک دن وہ حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

تم کو کیا معلوم حطمہ کیا چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک آگ ہے، جو دلوں میں بھڑکتی ہے، جو بڑے بڑے ستونوں کی شکل میں انکو گھیرے رہتی ہے۔

اس سورۂ پاک میں، جمع مال کی مذمت بیان کی گئی ہے، اور عرب کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ کثرت اموال ہمیشہ کی زندگی (حیات) کی ضمانت ہے، بلکہ کثرت اموال کا نتیجہ بہت برا ہوتا ہے، مالدار کا نتیجہ ایک دن یہ ہونے والا ہے، کہ اسکی ساری دولت حسرت وافسوس کی جہنمی آگ میں جل کر خاک ہو جائے گی۔

دنیا میں خدا کا پیغام آیا، مگر دنیا نے قبول نہ کیا، لوگوں نے جمع مال کو نہایت عقلمندی کا کام سمجھا
خداوند کی قدرت نے اپنے عزیزی ہاتھ کی زبردست طاقت سے اب دنیا پر ظاہر کر دیا کہ سرمایہ داری
ایک لعنت ہے جسے ہماری بداعمالیوں نے آسمان سے بلایا ہے۔ اور ہر شریف آدمی کا فرض ہے
کہ اسے بیخ و بنیاد سے اکھیڑ پھینکنے کی کوشش کرے۔

سورہ حشر میں خدا نے مال کو یتامے و مساکین میں تقسیم کرنے کی غرض یہ بتائی ہے کہ مال و دولت

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ط — گھوم پھر کر صرف اغنیا میں نہ رہے

اس سے معلوم ہوا کہ خداوند عالم کا منشا ہے کہ اس کے نیکوکار بندے ہر اس جائز تدبیر پر کاربند ہوں جس کی وجہ سے دولت کو اغنیا کے لیئے برکت خزانوں سے نکل کر مساکین اور بے مایہ لوگوں میں چکر لگانا پڑے۔

سود کی حرمت اسلام میں صرف اس لیئے ہے کہ اس سے دولت کا ذخیرہ بے مایہ جیبوں سے نکل کر بے مغاد خزانوں میں جمع ہو جاتا ہے ایک شخص کے بہت زیادہ مالدار ہونے کے بعد یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے، کہ وہ خود اور اس کے اہل خاندان طرح طرح کے اخلاقی معائب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ سورۂ نٓ میں ایک نہایت بدکار آدمی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

وَلَا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّھِیْنٍ ھَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِیْمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ۔	تو کسی ایسے شخص کا کہا مت مان، جو بہت قسم کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے لوگوں پر آوازے کستا ہے، چغلیاں کھاتا ہے، انتہا درجہ کنجوس ہے حد سے گذر ہوا ہے بدکار ہے اکھڑ ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ بداصل بھی ہے

ان تمام برائیوں کا منبع صرف یہ ہے کہ

اِنْ کَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیْنَ	وہ بہت آل و اولاد والا اور دولت مند ہے

اس بنا پر ہر ایمان دار کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ سرمایہ داری کے خلاف اپنی پوری طاقت سے جہاد کرے۔

یورپ کے اشتراکیوں نے، سرمایہ داری سے پیدا ہونے والی برائیوں کا جو علاج سوچا ہے وہ ٹھیک نہیں، سرمایہ داری کی ملعون ماں صرف سود خواری ہے، جب تک دنیا میں سود کا بیوپار قایم رہے گا دنیا کو حقیقی راحت میسر نہیں ہو سکتی۔ جدید تمدن نے "سود" کو ایک ناگزیر چیز بنا دیا ہے بنکوں کا رواج، لین دین میں سود، تبادلہ سکہ میں سود، غرض دنیا کا ہر معاملہ آج کل معاملہ ربا ہو رہا ہے، اشتراکیوں نے سوچا ہے کہ ساہوکاروں کو لوٹ لو، زمینداریوں کا خاتمہ کر دو، بجبر دولتمندوں سے انکی دولت حاصل کر لو، وہ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص صرف خلاف قدرت قوانین کے ماتحت دولتمند ہوتا ہے، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، ہر شخص کو اتنی ہی طاقت اور محنت کی قابلیت نہیں ملی ہے جتنی دوسرے کو، اسی طرح روزی کی کمی و بیشی کل قوانین قدرت پر مبنی ہے، عالم مساوات اقتصادی دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکتی، خدا نے فرمایا

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا — ہم نے دنیا میں ان کے درمیان انکی روزی کو تقسیم
وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ — کر دیا ہے اور ایک کا درجہ دوسرے سے بلند رکھا ہے۔
لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا — تاکہ ایک دوسرے کو اپنا تابع بنا سکیں۔

قدرت کی طرف سے جو اقتصادی فرق مراتب قائم رکھا گیا ہے اوس کو مٹانے کی کوشش کرنا بے سود ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ خدا کی نعمتوں میں سے کسی حصہ کا تنہا مالک ہو جائے۔ اسی طرح کسی خاص طبقہ انسانی کو بھی حق نہیں کہ وہ دوسرے طبقوں کے حقوق کو اپنے حقوق سے کم قرار دے۔

"سرمایہ داری" کی ملعون ہستی کو مٹانے کی سب سے بہتر تدبیر صرف یہ ہے کہ دنیا کی طرز حکومت کو بدل دیا جائے ایک مسلمان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کا صحیح مطلب سمجھے اور لوگوں کو سمجھائے، رسول مقبول نے فرمایا۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ (مسلم) زمین کا مالک اور حاکم صرف اللہ اور اس کا رسول ہے، خدا کے علاوہ کوئی کسی چیز کا حاکم و مالک نہیں ہو سکتا اسی طرح دنیا کی تمام قدرتی چیزیں، جنگل، پہاڑ، کانیں، کنوئیں، دریا، سمندر وغیرہ سب خدا کی ملک ہیں، اور ان چیزوں

میں ہر انسان کا حق مساوی ہے، اس لیے ہمارا سب سے پہلا فرض ہے کہ ان چیزوں کو واقعی
معنوں میں خدا کی ملک یعنی ہر بندہ خدا کے مصرف کی چیز بنا دیں، ان حکومتوں کو دنیا میں قائم
رہنے کا کوئی حق نہیں ہے جو اس اصول کو تسلیم نہیں کرتیں۔

حضرت مسیح جس آسمانی بادشاہت کا اعلان فرماتے تھے جس میں دولتمندی کے لیے کوئی جگہ
نہ تھی اس کو صرف اسلام قائم کر سکتا ہے، جو سود کا سخت مخالف ہے، اور جس کے مختلف مقاصد
میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ دولت گھوم پھر کر صرف اغنیا میں نہ رہنے پائے۔

ابوالجلال ندوی

رفتارِ تعلیم

دو سال کا عرصہ گزرا کہ بابو گوکل چند نے ۴۰ ہزار روپے کی ایک رقم ہندی ساہتیہ سمیلن (انجمن ترقی ہندی) کو عطا کی کہ اس کے منافع سے ہر سال ۱۲۰۰ روپیہ کا انعام ہندی زبان میں سائنس، لٹریچر، فلسفہ یا تاریخ کی بہترین تصنیف پر ان کے بھائی منگل پرشاد مرحوم کی یادگار میں دیا جایا کرے۔ اس سال یہ انعام پہلی بار پنڈت پدما سنہا شرما کو اُن کی ناقدانہ تصنیف پر ملا ہے جو اُنھوں نے ہندی شاعر بہاری پر لکھی ہے۔ یہ دیکھکر قدرتاً ہماری نگاہیں قدر دانانِ اردو کی طرف اٹھتی ہیں کہ کیا ان میں سے بھی کوئی ایسی نظیر قایم کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے؟

پروفیسر جان برنٹ نے اکسفرڈ میں ۱۰ مئی کو "جہالت" کے عنوان پر لکچر دیتے ہوئے یہ بیان کیا کہ موجودہ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ جہالت میں بھی اضافہ ہوا ہے، ان کا خیال ہے کہ آج کل کے نوجوان ۴۰ سال قبل کے نوجوانوں سے زیادہ نادان نظر آتے ہیں۔

عنوان بالا کے تحت میں ناظرین یہ دیکھ کر شاید اجتماعِ ضدین کا گمان کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا آفتابِ علم اپنے نصف النہار پر پہنچ چکا، جب فضلاے یورپ اس یونانی فلسفہ کی طرف مائل ہوئے ہیں جس کو مرزاے مرحوم نے اس طرح ادا کیا ہے۔

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے،
وہ بھی اک عمر میں ہوا معلوم!

جاپان کی ایک تازہ اطلاع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۵۰۰ پروفیسر جاپان کے محکمہ تعلیمات کی طرف سے بغرض تعلیم باہر بھیجے گئے ہیں تاکہ وہ پھر واپس آکر انھی کالجوں میں جواب یونیورسٹی بنائے

جانے والے ہیں زیادہ بہتر کام انجام دے سکیں۔

آل برہما نیشنل ایجوکیشنل کانفرنس میں جو مئی سنہ ۱۹۲۳ء میں بمقام رنگون منعقد ہوئی، ناظم نے دو سال کی کارروائی پڑھکر سنائی جس میں یہ بتایا گیا کہ اپریل سنہ ۱۹۲۱ء سے جب گزشتہ کانفرنس ہوئی تھی، اس وقت تک قومی مدارس کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ آج کل قومی اسکولوں کی مجموعی تعداد ۱۰۹ ہے جن میں قریباً ۱۰ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔

قومی تعلیم پر ایس۔ وی رام مورتی صاحب نے اظہار خیالات فرماتے ہوئے اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایکبار وہ بحری سفر کر رہے تھے کہ جہاز میں ایک مسیحی پادری نے انھیں ایک کتاب دی جس میں مصنف کتاب نے تمامتر زور اس امر پر دیا تھا کہ کوئلہ سے اقتصادی ترقی ہوتی ہے جس پر یورپ کی تہذیب جدید مبنی ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں کوئلہ کی بہتات نہیں ہے تو یہاں آدمیوں کی کیا کمی ہے اور اگر کوئلہ سے قوت پیدا کیجا سکتی ہے تو انسانوں سے بدرجۂ اولیٰ یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ کوئلہ اس وقت تک بیکار محض ہے تاوقتیکہ وہ روشن نہ کیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ انسان میں یہی روشنی اور بیداری پیدا کر کے وہ کام نہ لیا جائے۔ ہندوستان میں تعلیم عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے لوگوں میں قوت پیدا کیجائے۔ ایشیا بھر میں تین چیزیں اکثر پائی جاتی ہیں، جہالت، افلاس اور عدم صفائی اس کے لیے موصوف نے ایک عملی اسکیم پیش کی ہے۔

ہر گاؤں میں جو لوگ نوشت وخواند سے واقف ہیں۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دوسروں کی امانت ہے۔ ہر روز ایک دو گھنٹے جو بیکاری میں گزرتے ہیں، لوگوں کو پڑھانے میں صرف کرنا چاہیے اپنے عملی تجربات کو کتابی صورت میں گاؤں والوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے، ہندوستان کی تاریخ کے موٹے موٹے واقعات بھی ان کو بتانے چاہئیں۔ گاؤں کے اسکول جو اس

طریقہ پر قائم ہوں، ایک پنچایت کے ہاتھ میں ہوں اسی طرح سے ضلع کے مدارس بھی قائم کیے جائیں۔ اس طریقہ پر دس سال تک عمل کرنے سے نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو جائے گا۔

"معلم"

مطبوعات جدیدہ

اسوۂ صحابیات۔ از مولانا عبدالسلام ندوی۔ مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڈہ قیمت عمر

مولوی صاحب کی یہ تازہ تصنیف درحقیقت اُن کی اصل کتاب اسوۂ صحابہ سے ماخوذ اور اُسی کا نتیجہ ہے جس میں صحابیات کے حالات اور خجستہ واقعات اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ اکثر جلیل القدر صحابیات کے بعض واقعات زندگی اور اُن کی عادات و خصائل کے بعض نمایاں پہلو پیش نظر ہو جاتے ہیں اور سلسلہ کلام کسی جگہ بے ربط نہیں ہونے پاتا۔ واقعات کے انتخاب میں لحاظ رکھا گیا ہے کہ زیادہ تر مثالیں معاملات، گھر کے کام کاج، تعلقات باہمی اور آداب معاشرت کی ہوں جو بالعموم ہماری خواتین کے لیے زیادہ موثر اور زیادہ سبق آموز ہیں۔ زبان بھی باوجود ادبی و علمی ہونے کے ایسی دقیق نہیں کہ کم استعداد طلبہ یا خواتین کے لیے بار ہو کتاب کا حجم صرف ۹۶ صفحہ ہے اور مسلم پرنٹنگ پریس، اعظم گڈہ سے مل سکتی ہے۔

انتخاب صحاح ستہ۔ مسلمانوں میں حدیث کی چھ کتابیں مستند اور صحیح قرار پا چکی ہیں۔ بخاری، مسلم۔ ترمذی، ابن ماجہ، ابو داؤد اور نسائی شریف۔ علامہ رزین متوفی سنہ ۵۲۰ھ نے ان کل کتابوں کی احادیث کو بلا سلسلۂ اسناد حذف کر کے ایک جگہ جمع کر دیا۔ اس کے بعد علامہ ابن اثیر جزری متوفی سنہ ۶۰۶ھ نے اسی کتاب کو از سر نو مرتب کر کے اس کا نام جامع الاصول رکھا۔ قاضی القضاۃ شرف الدین نے اس میں سے مکررات کو نکال کر تجرید الاصول کے نام سے اس کو مرتب کیا۔ پھر امام زبیدی شافعی متوفی سنہ ۹۴۴ھ نے اس کے الفاظ مشکلہ کو حل کر کے اس کا نام تیسیر الاصول

رکھا۔ ۱۳۲۳ھ میں مولوی سید ابوالحسن محمد محی الدین صاحب جج ہائیکورٹ حیدرآباد دکن نے
اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام تلخیص الصحاح رکھا۔ اب مولوی نیاز علی صاحب بنشیز
اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس پنجاب نے وہ حدیثیں منتخب کر کے جو مسلم اور غیر مسلم کے لیے یکساں
مفید ہوں انتخاب صحاح ستہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ ترجمہ میں تلخیص الصحاح سے زیادہ مدد
لی ہے۔ کہیں کہیں تشریح کی غرض سے فوائد کا بھی اضافہ کیا ہے لیکن جا بجا اشعار جو اس میں
بھرے گئے ہیں وہ حدیث کی ثقاہت کے منافی ہیں۔ ترجمہ صاف ہے۔ اور کتاب ہر نوع
مفید ہے اسکی ضخامت ۳۶۰ صفحے اور قیمت صرف عہ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط ہے۔
ملنے کا پتہ: ملک فضل الدین تاجر کتب قومی کشمیری بازار لاہور۔

الوراثۃ فی الاسلام۔ اسلامی فن وراثت ائمہ کے زمانہ میں جس طرح مرتب ہو گیا تھا اسی طرح آج تک چلا جاتا ہے
زمانہ مابعد میں علماء و فقہائے نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ہمارے جامعہ کے استاد
تاریخ اسلام مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے اس فن پر محققانہ طریقہ سے بحث کی ہے
اور عربی زبان میں نہایت اختصار اور صفائی کے ساتھ بالکل جدید طرز سے اس فن کو مرتب کیا
ہے۔ پہلے ان بنیادی اور اصولی خرابیوں کو دکھلایا ہے جو اس فن کی ترتیب میں واقع ہوئی
تھیں۔ اس کے بعد قرآن مجید کی صرف چار آیتوں کی جو وراثت سے متعلق ہیں تفصیل کے ساتھ
تفسیر کی ہے۔ اور انھیں سے فرائض کے کل اصول مستنبط کیے ہیں۔ اس کے بعد پھر انھیں اصول
پر اس فن کی نئی تعمیر کھڑی کی ہے۔ مطبع ملیہ علیگڑھ میں ٹائپ میں نہایت عمدہ کاغذ پر یہ کتاب
چھاپی گئی ہے۔ قیمت فی نسخہ ۸؍ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڑھ

ہوم اینڈ ہیو جدید بین الاقوامی زبان پر نئی تصنیف ہے جو حال میں جرمنی سے موصول ہوئی ہے
مطبوعہ تیبنزگ۔ جرمنی

زندہ جاوید

از سیدہ الف۔ ف بیگم حیدرآبادی، عظیم آبادی مطبع انقلاب، قوت باڑی گیا

یہ دو جزو کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں واقعہ کربلا کو نظم کیا گیا ہے اور اس مختصر نظم سے مقصد یہ ہے کہ "حیات ملیہ اسلامیہ کی تفسیر امام الشہداء حضرت حسین علیہ السلام کی سیرت پاک" سے پیش کی جائے۔ ابتداء میں ایک مختصر مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے جو زبان و طرز بیان دونوں کے لحاظ سے دلچسپ ہے لیکن اس کے مطالب و مقاصد میں بجائے شرح و بسط کے اشارہ و کنایہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً "تمام فلسفوں اور تمام افکار کا دائرہ عمل بس اسی قدر ہے کہ جب قید ہستی میں ہمارا ہونا لاعلاج ہے تو پھر ہم اس طور پر گزر کریں کہ ہمارے مابین کشمکش حیات نہ پیدا ہو اور کوئی کسی کو دکھ نہ دے۔" .... اور "سب کو یکساں سہولت دنیا میں رہنے سہنے کی ملے" "یزید نے اسی توازن حیات میں خلل ڈالا" .... اور "بہ ظاہر حضرت حسین کو زک ہوئی، یزید نے فوری غلبہ پایا .... مگر مظلوم حسین کی روح پاک قالب جمہوریت میں روزافزوں جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ فرما ہے اور جب جب اور جہاں جہاں حقوق عوام کی حمایت ہوئی اور ہو رہی ہے اسی زندہ جاوید کی فتح کا ڈنکا بجا ہے اور بجتا رہے گا"

جن اقتباسات کو اوپر پیش کیا گیا ہے نظم انہیں کی تفسیر کی ایک کوشش ہے۔

قیمت فی جلد ۰ء معنفہ سے مل سکتی ہے

جذبات آزادی

از ہلال احمد زبیری ہلال مارہروی قریش اینڈ کو، لال کنواں دہلی۔
قیمت ۲ر

یہ سیاسی نظموں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت خوش سلیقگی سے چھپی تقطیع پر قریش اینڈ کو

سے نے شائع کیا ہے۔ کاغذ سفید اچھا ہے اور لکھائی چھپائی نہایت خوب ہے۔ شہید جفا، بربادی وطن، درونِ نہاں، تمنائے شہادت، فتوحاتِ احرار، فتح سمرنا کی نذر، عنوانات نظم ہیں۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی دیکھنے کے قابل ہے پہلی نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

رہِ حق پہ چل کے جو باوفا ستم و جفا کا شہید ہے | اُسے سوزِ غم بھی سرور ہے اسے روزِ عشرہ بھی عید ہے
مجھے کھینچتے ہیں وہ قید میں مرے امتحان کی عید ہے | مرا بخت آج ہی اوج پر مرے حق میں روزِ سعید ہے

اُدیا بمبئی نیشنل کالج میگزین

گجرات ودیا پیٹھ کے زیر اثر بمبئی قومی درسگاہ دو سال سے قائم ہے جو اگرچہ بمبئی میڈیکل کالج کی طرح مشہور نہیں لیکن بہ اعتبار تعداد طلبہ و اپنی اعلیٰ تعلیم کے اس لائق ہے کہ ملک میں عام طور پر اُس سے اظہار دلچسپی کیا جائے جامعہ ملیہ کی طرح وہاں بھی طلبہ ایک عرصہ تک اپنا ماہوار رسالہ قلمی نکالتے رہے لیکن گذشتہ مارچ سے اُنھوں نے اُدیا نام سے اپنا آرگن مطبوعہ شائع کیا ہے جو ظاہری صورت کے لحاظ سے نہایت ہی عمدہ ہے اور مضامین بھی اگرچہ مختصر ہیں مگر دلچسپی سے خالی نہیں۔ (شمارہ صفحے انگریزی اور اسی قدر گجراتی زبان میں ہیں۔ انگریزی حصہ مضامین میں پرنسپل نیشنل کالج ایم اے (آکسن) کی رپورٹ سالانہ نہایت دلچسپ ہے۔ اور اس قابل ہے کہ قومی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اُس کا بغور مطالعہ کریں۔ طلبہ کے علاوہ بعض اساتذہ کے مضامین بھی ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ بمبئی نیشنل کالج گرین و لاگرانٹ روڈ، بمبئی سے مل سکتا ہے۔

آئینہ

(الہ آباد) اڈیٹر ابوالمعانی سید وحید الدین احمد کڑوی۔ سالانہ چندہ صہ

ماہ جون سے یہ رسالہ مشترک سرمایہ سے جاری ہوا ہے اور اس کے ڈائرکٹروں میں سرتیج بہادر سپرو بھی شامل ہیں جن کی تصویر بھی اس نمبر میں دی گئی ہے۔ حصہ مضامین میں ناول

•وسانے بھی ہیں اور معقول ادبی مضامین بھی جن میں سید مسعود حسن صاحب کا مضمون زبان اُردو کے متعلق اور وحید صاحب کا فسانہ قابل ذکر ہیں۔ رسالہ ہذا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مضامین کا ایک حصہ تمامتر خواتین کے افکار دماغی کا نتیجہ ہے اور بیشتر مضمون نگار رجائے ہوبہی کی ہیں۔ تین غزلیں، دو قصیدے ایک قطعہ دو فسانے، ایک مضمون خواتین کے قلم سے شائع ہوئے ہیں۔ اور ان کی یہ کوشش شعریت، ادب لطیف، اور فسانہ نگاری تک محدود ہے۔ اور مو خرالذکر صنف میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مضمون نگاروں کو فسانہ کی صرف ایک ہی پہلو سے دلچسپی ہے یعنی داستان محبت۔

رسالہ کا حجم تقریباً ۴۸ صفحہ ہے تقطیع "ادیب" مرحوم کی یاد دلاتی ہے۔ حصہ نظم میں اقبال اکبر، جلیل، صفی، ثاقب، صدق جائسی، جوش ملیح آبادی کا کلام ہے۔

"لمعات اکبر" کے عنوان سے حضرت اکبر کا غیر مطبوعہ کلام شائع کر کے "آئینہ" نے نہ صرف الہ آبادی ہونیکا حق ادا کیا ہے بلکہ ایک گرانقدر ادبی خدمت انجام دی ہے، ذیل میں ہم چار شعر نقل کرتے ہیں :-

غم میں ہو جاتا ہی ہے امید فردا سے سکوں — وائے بر حالش جسے امید فردا بھی نہو
محترز فریاد سے ہوں زیر لب کرتا ہوں آہ — آپ کی مرضی ہے شاید یہ کہ اتنا بھی نہو
دل کے ٹکڑے کرتی ہی یارب خلش امید کی — بر نہیں آتی اگر ظالم تو پیدا ہی نہو
پوچھی کر تلقین رہ گئے وہ جس کو اسکو ہی گلہ — اس کے دل سے پوچھئے جس کو کہ پوچھا بھی نہو

مرج البحرین ۔ اڈیٹر حافظ محمد باقر علی امین چشتی القادری دار الاشاعت قاسمی پریس دہلی
چندہ سالانہ دو روپے

یہ تین جزو کا رسالہ ہے جو معمولی کاغذ اور ۲۲ × ۱۸ تقطیع پر دہلی سے شائع ہوا ہے مضامین کا تنوع اور اختصار قابل داد ہے۔ دہلی کے تمام مشہور اہل قلم پہلے نمبر میں موجود ہیں۔

پہلا مضمون تمہیدی ہے جس میں مقاصد رسالہ سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اوس کے بعد حمد و نعت اور تصوف پر تین مضمون ہیں ادبی مضامین نہایت پرلطف اور ایسے مذہبی رنگ سے متاثر نظر آتے ہیں جس میں پند و موعظت پوشیدہ ہے۔ بہ حیثیت مجموعی پہلا نمبر دلچسپ ہے۔

"ناقد"

تلافی مافات

شعر فطرت انسانی کا ایسا پرتو ہے جو خیالات کی وسعت، لطف زبان، و اظہار مطلب کے تمام پہلو اپنی محدود و مختصر دنیا میں بند رکھتا ہے۔ "تلافی مافات" اسی قسم کی ایک نظم ہے جس میں یہ سب خوبیاں یکجا موجود ہیں۔ عابد صاحب کی یہ نظم اُن کوششوں میں شمار ہونے کے قابل ہے جو اپنی جدت طرازی، ندرت تخئیل، و بلند پردازی سے دوسروں کے لیے بھی اک نئی راہ پیدا کر دیتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ بلند ہر شخص کا حصہ نہیں۔ فلسفہ و معرفت کا یہ درس زمین شعر کی رنگینی و دلفریبی میں کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ عابد صاحب اسی طرز میں کچھ اور لطف فرماتے۔

مدیر

ہے جلوہ گاہ صبح ازل عالم خیال — حیرت کے ساتھ ذوق تماشا لیے ہوئے
پیش نظر ہے شاہد لاریب کا جمال — اور دل سے ممکنات کے پردے اُٹھے ہوئے

ہیں بے خبر وصال کی لذت سے کاف و نون — وحدت کو آپ اپنی نظر سے حجاب ہے
شورش سکوں کے پردے میں بیٹھی ہے سرنگوں — ہستی عدم کی گود میں مصروف خواب ہے

لیکن نہاں ہے پردۂ خلوت میں ایک شے — جس کو نہیں قبول کسی طرح یہ جمود
جو جلوہ افگنی کے لیے بیقرار ہے — تخلیق جس کی فطرت اصلی کی ہے نمود

اک بار کر کے شعلۂ قدرت سے کسب نور — یوں ظلمت عدم میں جل اٹھا ہے یہ چراغ
جیسے سیاہئ شب موسیٰ میں شمع طور — جیسے سواد ہجر میں عاشق کے دل کا داغ

اس نور کی کرن کہ ہے ہستی کا موقلم — بھرتی ہے نقش فکر میں صورت کا آب و رنگ
ارض و سما، زمان و مکاں، مہر و مہ بہم — پاتے ہیں بار صفحۂ امکاں پہ بے درنگ

ہے یوں تو اس مرقع میں ہر نقش دلفریب — پر اک طلسم رنگ کی کچھ اور شان ہے
اس کا فروغ حسن ہے اس انجمن کی زیب — گویا نگار خانۂ ہستی کی جان ہے

یہ پیکر جمال، بشر جس کا نام ہے — پہنے ہے کس بناؤ سے ایجاد کا لباس
پر کوئی اہل دل اسے دیکھے جو غور سے — اس ساری بزم میں نظر آتا ہے یہ اداس

شاید یہ بات ہے کہ یہ قدرت کا لخت دل — جو آج تک پلا تھا حقیقت کی گود میں
ہے صدمۂ فراق سے اس درجہ مضمحل — اس پر گراں ہیں عالم صورت کی کلفتیں

کہتا ہے کر کے بارگہ قدس سے خطاب — فریاد اے مجاز و حقیقت کے بادشاہ
کرتی ہے مجھ کو کشمکش آرزو خراب — مجھ سے نہ ہوگا عالم ایجاد میں نباہ

قدرت کہ جس پہ زیست کے اسرار ہیں عیاں — ہوتی ہے یوں زبان تخیل میں نغمہ ریز
غافل حیات عربدہ پرداز ہے یہاں — اس قوت جلیل سے بیکار ہے ستیز

پر شکر کر کہ ایک ابھی باقی ہے آسرا — تجھ کو ملول دیکھ کے آلام زیست سے
عماں بیکراں حقیقت کے آشنا — لائینگے تین گوہر یکتا ترے لیے

سر عظیم جذبۂ وحدت کا ترجماں — جس کو شرف ملا ہے پیمبر کے نام سے
لائیگا تیرے پاس عقیدت کا ارمغاں — اٹھیں گے بندگی کے ترے دل میں ولولے

پھر طالبِ حقیقت ادراک فلسفی — کھولیگا شک کا باب دبستانِ عقل میں
پرخار رہ جو ہے صمنستانِ علم کی — دل اسکی رہروی سے اُٹھائے گا لذتیں
بعد اس کے عندلیب گلستانِ معرفت — کہتے ہیں جسکی نغمہ سرائی کو شاعری
بتلائے گا جگر کو ترے درد کی صفت — تلقین کریگا قلب کو سوزِ خموشی کی
یہ تین کیف بادۂ خمِ الست کے — مل کر ہم بنیں گے محبت کی سرخوشی
کردینگے محو شکوۂ ہستی کو قلب سے — نیرنگ کن فکاں کی حقیقت ہے بس یہی

داتمار مارچ سنہ ۲۳ء

سید عابد حسین

نوائے بہار

حسنِ جمالِ یار دیکھ آئینۂ بہار میں — روئے حسین کہ لالہ ہے دامنِ کوہسار میں
ذکرِ بہار و سیرِ گل یادِ نگار و کیفِ مے — آگئی ان سے تازہ روح پھر دلِ بادہ خوار میں
دل کی فسردگی کا حال پوچھتے کیا ہو دوستو — عمر ہی سب گذر گئی اپنی غمِ بہار میں
حُسن کی آرزو بُری عشق کی بیکسی بُری — کیا کریں چارہ جو مگر دل نہیں اختیار میں
دامنِ دوست اور یہ حوصلۂ طوافِ شوق — ذرے ہماری خاک کے ہیں مگر اس غبار میں
ہمتِ آرزو نہ توڑ یاس کو دل میں جا نہ دے — رہزنِ مدعا ہیں یہ عشق کی رہگذار میں
اہلِ وفا کے واسطے چھوڑ کے مر رہا ہوں میں — ایک فسانہ دلگداز عشق کی یادگار میں
تازگی و شگفتگی دل میں کہاں سے لاؤں میں — روحِ نشاط ہی نہیں اب کے گل و بہار میں

محوی و شاعرانِ عصر ہوش میں آئے اب تو کیا
عمر تو سب گذر گئی ذکرِ گل و بہار میں

محوی لکھنوی

شذرات

سیاسیات مغرب کی چند نمایاں خصوصیات ہیں جن سے "غیر مہذب و غیر سیاسی مشرق" بھی واقف ہوتا جاتا ہے، لیکن اخبارات و جرائد کے صفحات بہت کم ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جنکو اگر تہذیب و سیاسیات کے پردہ میں محض مغربیت کی عشوہ گری کہا جائے تو بیجا نہیں۔ انگلستان کے موجودہ پارلیمنٹ میں تین عورتیں ممبر ہیں جن میں سے کوئی بھی اُس سرگرم جماعت کے ذمہ دار ارکین میں سے نہیں جواب تک حقوق نسوان کے متعلق جدوجہد میں مصروف رہی ہی بلکہ ایک لارڈ کی بیوی اور ایک طبقہ امرا کی خاتون اور تیسری مسیز فلپس ایک مشہور رقاصہ ہے جو حال ہی میں اسٹیج سے نکل کر اب بزم سیاست کی ملکہ بننا چاہتی ہے یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں خواتین اپنے اپنے شوہروں کی جگہ منتخب ہوئی ہیں چونکہ کسی نہ کسی وجہ سے یہ حضرات دارالعوام میں منتخب نہو سکتے تھے یا امید کامیابی نہ رکھتے تھے۔

اگرچہ یہ ایک واقعہ بھی ہمارے سیاسی بزرگوں کے لیے کافی سبق آموز ہے، لیکن جب اس کے دوسرے پہلو پر غور کیا جائے تو مغربیت، کا صحیح رنگ نمایاں ہوجاتا ہے مغربی ممالک میں جنس نازک کے اقتدار کی اس سے زیادہ روشن مثال کیا ہوسکتی ہو کہ جہاں لارڈ اسٹر، مسٹر ونٹرنگھم، اور مسٹر ملٹن فلپس ناکام ہوں وہاں یہ بازی ان خواتین کے ہاتھ رہے جو انھیں کے نام سے پکاری جاتی ہیں اور اس دعوے سے میدان میں آتی ہیں کہ میدان سیاست و موجودہ دور تہذیب میں ناکامی و کامیابی ہماری ذات سے وابستہ ہے۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ واقعہ ہے کہ حقوق نسوان کی حمایت، غریب کام

کرنے والی لڑکیوں کی حفاظت و اعانت، تربیت اطفال، ازدواج و طلاق اور اسی قسم کے دوسرے اہم و پیچیدہ مسائل کا بار آج مسز فلپس کے نازک کندھوں پر ڈالا جاتا ہے جن کو برسوں سے معمولی لباس کی گرانباری کے بھی برداشت باقی نہیں اور جن کو اپنے آرٹسٹ دماغ کو عملی و کاروباری بنانے میں معلوم نہیں کتنے ہی دشوار گزار و کٹھن منازل طے کرنا ہوں گے جن کے لیے وہ قدم جو صرف "اوپیرا" کی ہموار و منور زمین ہی کے عادی ہوں کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے۔

کیا حقوق طلب عورتیں اپنی نمایندگی کے لیے، تھیٹر، گھوڑ دوڑ کے میدان، مانٹی کارلو، اور ریویسریا کے تفریح گاہوں کو درسگاہِ سیاست قرار دیتی ہیں جہاں سے وہ اپنی "حمایت کرنیوالیوں" کو حاصل کیا کرینگی؟ معاملات سیاسی میں عورتوں کی مساویانہ شرکت اور حقوق طلبی غلط ہو یا صحیح، لیکن یہ یقیناً غلط ہے کہ عورتیں اپنے حق انتخاب کا صحیح استعمال نہ کریں اور غلطی کی یہ انتہا ہو کہ میدان سیاست و بزم سرود کا امتیاز ہی اُٹھ جائے۔

انسداد مینوشی کا مسئلہ اب علمی حلقے سے گزر کر عملی میدان میں منازل ارتقائی طے کر رہا ہے گزشتہ چند ماہ میں امریکہ و سلطنتہائے یورپ کے مابین بار بار اختلافات رونما ہوئے ہیں، اسباب تجارت و جہازوں کی تلاشی لی گئی، بیرون امریکہ شراب کی مقدار ممنوعہ کو جائز قرار دینے پر ردوکد کی بحث ہوئی اور بعض مرتبہ یہ معاملات سیاسی خطرہ کے نام سے بھی تعبیر کیے گئے خود ہندوستان میں بھی گزشتہ دو سال میں مسئلہ انسداد نے بڑی کامیابی حاصل کی اور مسٹر پسی فٹ جانسن چپکے ہی چپکے آئے اور دل ہی دل میں خوش ہو کر چلے گئے۔ سلطنت ترکی نے انسداد کے متعلق قطعی احکام نافذ کر دیئے ہیں اور اب یہ تحریک حدود مصر میں بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی رہنمائی زیادہ تر خواتین مصر کے ہاتھ میں ہے۔

ہندوستان میں انجمن آرائی و انجمن سازی اگرچہ بہ حیثیت فن کے مغربی عشوہ گروں

کے درجہ کمال تک نہیں پہنچی ہے پھر بھی گزشتہ چند سال میں اس نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ ایشیا، کی برکت کہئے یا ہندوستانیوں کی خدا ترسی کہ اس خاص شغل کی ابتدا بھی بہبود خلایق و اصلاح قوم سے کی گئی اور پھر رفتہ رفتہ ترقی کے وہ مدارج بھی طے ہونے لگے جو آج دوسرے ملکوں میں نظر آتے ہیں مثلاً اہل حرفہ، تجار، صاحبان علم، ماہرین سیاست، سیر و تفریح، ورزش اور کھیل، غرض ہر قسم کی انجمنیں ہندوستان میں موجود ہیں گو "انجمن محافظ دندان" ابھی تک سننے میں نہیں آئی حالانکہ یورپ میں اسکا بھی وجود ہی نہ صرف وجود ہے، بلکہ ایک معاصر کے بیان کے مطابق اُس کے صدر نے یہ ہولناک و عبرت انگیز پیغام بھی پہنچایا ہے کہ اگر لوگوں نے اپنے دانتوں کی طرف سے یسی ہی بے پروائی برتی تو کچھ عرصہ کے بعد سب اپنے دانتوں سے محروم ہو جائیں گے!

لیکن یورپ و ہندوستان میں ایک عظیم الشان اختلاف ہے یورپ خواہ اپنی انجمنوں کے مقبول و دلچسپ بنانے کے لیے کیسے ہی ذرائع کیوں نہ استعمال کرے (اور بلاشبہ بعض ذرایع قابل اعتراض بھی ہوتے ہیں) اُس کے نزدیک یہ انتہا درجہ کی بدمذاقی ہے کہ "دانتوں کی انجمن" سے اقتراعیات کے مقاصد میں مدد لی جائے یا "ایکٹروں کی جماعت" وآئی۔ایم۔سی۔اے (مسیحی جماعت) کا پرچار شروع کر دے۔ بخلاف اس کے ہندوستان کی بعض جدید الشیوع و معتدد جماعتیں اسی مقصد سے قائم ہوئی ہیں اور اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ایسا کریں گی بھی یا نہیں اس لیے کہ میدان عمل میں ہنوز کوئی قدم نہیں اُٹھا ہے اور اگر آغاز سے انجام کے متعلق کوئی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے، تو شاید توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے کہ کچھ کریں!

ہمارا مقصد ایک اُس جماعت سے ہے جو سندھ کے بعض تعلیم یافتہ حضرات سے تبلیغ تصوف کے لیے قایم کی ہے اور مقاصد میں سیاسی اتحاد و حصول سوراج کو جگہ دی ہے اور دوسری وہ انجمن جو ہماری ہی صوبہ میں حلقہ الشیوخ کی حیثیت سے پیدا ہوئی ہے

لیکن مقاصد وعزایم کا ہم کو علم نہیں۔

حکومت ملیہ انگورہ کی جدید اصلاحات کی فہرست بفضل خدا روز بروز ترقی پذیر ہے۔ اقتصادی آزادی کے لیے جس جرٔت و استقلال سے حکومت ترکی نے کوشش کی ہے اوس کی متعدد مثالیں اِن صفحات میں پیش کی گئی ہیں۔ حال میں اطلاع ملی ہے کہ وائے ایم۔سی۔اے (مسیحی نوجوانوں کی انجمن) کو قسطنطنیہ میں کام کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ وائی۔ایم۔سی۔اے عیسائیوں کی مشہور و مقتدر جماعت ہے جس کی شاخیں تقریباً تمام دنیا میں نہایت خوبی سے اپنا کام کر رہی ہیں اور اگرچہ اُن کے مقاصد سے سیاسیات کو قطعی تعلق نہیں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ کے مسموم سیاسی آب وہوا، اور سازشوں کی کثرت نے اس غیر سیاسی جماعت کو بھی "مذہبی دستبرد" میں اعانت پر آمادہ کیا اور اُنھوں نے اپنی کوششوں کو محض رفاہ عام تک محدود نہیں رکھا بلکہ مغربی اقتدار کی حمایت اور ترقی میں بھی اون ذرائع سے کام لیا جو خلق خدا کو آرام اور مظلوم دنیا کو امن و سکون پہنچانے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔

صوبہ بہار میں عظیم آباد (پٹنہ) ادبی حلقوں میں اپنے شعرا کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں۔ علاوہ مشاعروں کی گرم بازاری، شعر و سخن کی مجالس کے علمی تصانیف بھی یہاں سے شایع ہوئی ہیں اور کتب خانوں کے لیے تو سرزمین بہار دور و نزدیک مشہور ہے۔ حال میں ایک انجمن ترقی اُردو پٹنہ میں قایم ہوئی ہے جس کے مقاصد میں علاوہ قیام کتب خانہ و دارالمطالعہ کے مفید و مستند ادبی تصانیف کی اشاعت بھی ہے۔ ہم کو ارکان انجمن کے مقاصد سے دلی ہمدردی ہے اور توقع ہے کہ وہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کے تجربوں اور مفید مشوروں سے بھی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرینگے جنھیں غالباً سب سے زیادہ اہمیت اُس کے استقلال کو حاصل ہے

جس کے بغیر اوس کی کامیابی قطعاً ناممکن تھی۔

اس نمبر میں "تعلیم و آزادی فکر" کے عنوان سے ایک بلند پایہ مضمون ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے جو ہمارے محترم پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب کے وسیع مطالعہ و اصابت رائے کا نتیجہ ہے ۔ ذاکر صاحب ایم اے۔ او کالج کے اون مایۂ ناز فرزندوں میں تھے جنھوں نے اپنی "مادرِ تعلیمی" سے بغاوت کا حق ادا کیا اور اس عرصہ میں قومی تعلیم سے جس قدر گہری دلچسپی کا اظہار کرتے رہے اس کی حقیقت سے کچھ وہی لوگ خوب واقف ہیں جن کو خوش قسمتی سے اُنھیں جامعہ میں مصروف خدمت دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ تقریباً ایک سال سے آپ کا قیام جرمنی میں ہے اور وہاں علاوہ اپنے خاص مضمون معاشیات کے آپ کا زیادہ وقت مسئلۂ تعلیم اور فن طباعت کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے جس کو وہ ہماری امانت سمجھ کر ہم کو عنایت فرماتے رہتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُنھوں نے ہم (جامعہ) سے کس قدر لیا ہے اور ہمیں کیا کیا کچھ دیا ہے، بلکہ

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

کے مصداق اگر ہم ذاکر صاحب کو قرار دیں تو خوف ہے کہ اُن کی برہمی کی ہم تاب نہ لاسکیں گے اس لیے صرف اُن کی خاطر اس مصرعہ کو 'ہم' اور 'دہ' کی تفریق سے جدا کیے دیتے ہیں۔

ہنوز سطور ہذا کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ ہم کو جرمنی سے وہ دیوان غالب ملا جو جامعہ ملیہ نے اپنے مطبع کاویانی میں چھپوایا ہے۔ اور جس کی خوبی و دلکشی کا صحیح اندازہ صرف اُس کے دیکھنے ہی پر منحصر ہے۔ غالب اوج کمال کی بلندیوں پر اس قدر بلند و بالا ہے کہ اُس کے مرتبہ کا پہنچنا مشکل ہے لیکن جس دیوان کو آج ہم اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں وہ بھی فن طباعت کی اُس اونچی چوٹی پر رکھنے کے قابل ہے جس کی رفعت تک اردو کی کسی دوسری کتاب کی رسائی نہیں اور یہ اک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ہمارے ذاکر صاحب کی اُس دلچسپی کا جو آج کل اون کو فن طباعت سے ہو گئی ہے۔

[illegible]

کے

[illegible] کتابیں

(۱) [illegible]	[illegible]
(۲) [illegible] حصہ (۱) از مولانا محمد اسلم جیراجپوری	قیمت ۸/
(۳) ایضاً حصہ (۲) ۔ ۔ حصہ سوم (۳)	۱۲/
(۴) مبادی معاشیات - از پروفیسر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب	۸/
(۵) [illegible] از مولانا نیاز فتحپوری	(زیر طبع)
(۶) انتخاب کلام میر - مرتبہ مولوی نور الرحمن بی اے	[illegible]
(۷) [illegible] شیخ السعدی - (از [illegible] صاحب)	قیمت ۱۲/
(۸) [illegible] الملک - حکیم اجمل خان صاحب	۱۲/
(۹) [illegible]	[illegible]
(۱۰) [illegible]	[illegible]

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ [illegible]

دیوان غالب اردو

جس طرح نظم اردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہے اس کے متعلق بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بہتر اردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سرخ جلد پر سنہرا کام ہے اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہے اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دئیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جو شروع میں درج ہے اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہے ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہونچ سکے بہرحال درخواست خریداری بھیج دیجئے تاکہ نام درج رجسٹر ہوجائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہو۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

نوٹ: بہ گذشتہ ڈاک سے پہلا اڈیشن موصول ہوگیا ہے

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد ۲	ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۲۳ع		نمبر ۲
نمبر شمار	**مضامین**	**مضمون نگار**	**صفحہ**
۱	جرمنی کی تعلیمی زندگی	سید عابد حسین صاحب بی اے	۶۱
۲	مرزا کرمانی	مولوی ابوالحسنات صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۶۹
۳	جہانگیر و نورجہاں	سعید انصاری صاحب متعلم جامعہ	۷۹
۴	معاشی تاریخ ہند	عبدالحمید خاں صاحب متعلم جامعہ	۹۱
۵	اقطاب نگورہ	جناب توحیدی صاحب	۹۹
۶	رفتار تعلیم	"معلم"	۱۰۸
۷	مطبوعات جدیدہ	"ناقد"	۱۱۲
۸	کلام اقبال	ڈاکٹر اقبال	۱۱۷
۹	جامعہ ملیہ	سید نواب علی ایم اے	۱۱۸
۱۰	شذرات	مدیر	۱۱۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۲۳ء نمبر ۲

جرمنی کی تعلیمی زندگی

(۱) جدید فلسفۂ تعلیم کی تاریخ

(ڈاکٹر فریڈرش ایرنسٹ رایش نے خاص جامعہ کے لیے تحریر فرمایا)

یہ مضمون ایک سلسلہ کا پہلا نمبر ہے جو خاص جامعہ کے لیے جرمنی کے ایک نوجوان ماہر تعلیم ڈاکٹر ایرنسٹ رایش نے تحریر فرمایا ہے۔ ڈاکٹر ایرنسٹ رایش وکرسڈورف کے مشہور مدرسہ میں معلم ہیں۔ یہ مدرسہ اپنی نوعیت میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور جرمنی میں ایک جدید تعلیمی تجربہ ہے۔ خود اس مدرسے کے اصول اور طریق عمل پر بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس سلسلہ میں ایک مضمون عنایت فرمایا ہے۔ جو ان شاء اللہ آیندہ ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔ اس سلسلہ مضامین سے ناظرین کرام کے سامنے جرمنی کی تعلیمی زندگی کا ایک اجمالی نقشہ پیش ہو جائے گا جو اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ایک جرمن ماہر تعلیم کے قلم سے نکلا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے ملک کے لئے اپنی موجودہ تعلیمی کشمکش میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ترجمہ کے لئے ہم اپنے کرم فرما جناب سید عابد حسین صاحب بی۔ اے متعلم دارالفنون برلن کے ممنون احسان ہیں۔ مدیر

جرمنی، فرانس، اور انگلستان مغربی یورپ کی تعلیمی زندگی کے تین مخصوص نمونے پیش کرتے ہیں۔ انھیں فرانس کے نظام تعلیم میں سب سے زیادہ مرکزیت (یعنی پیرس میں تعلیمی نظم ونسق کا مرکز ہونا) اور انگریزی طریقہ میں سب سے زیادہ آزادی (یعنی معاملات تعلیمی کا شخصی رجحان پر چھوڑ دینا) ہے۔ جرمنی میں نظم ونسق تعلیمی کا طریقہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ طرز تعلیم ہر جگہ کم وبیش یکساں رکھا گیا ہے، لیکن اس کا حل وعقد مرکزی دار الحکومت کے نہیں بلکہ مختلف ریاستوں کی مقامی حکومتوں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ طرز عمل میں مختلف ریاستوں کی مقامی خصوصیات کے لحاظ سے کچھ اختلاف بھی نظر آتے ہیں۔

اہل یورپ کی امتیازی خصوصیت تاریخ کے متعلق ان کا رویہ ہے۔ ان کے نزدیک زمانہ حال کے حالات وخیالات کا سچا علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ ان کے معرض وجود میں آنے کے طریقہ سے یعنی ان کی تاریخی رفتار سے بھی واقفیت ہو۔ اس اعتبار سے یورپ کا رویہ گویا روبہ قفا ہے۔ یہاں تک کہ سیاسی انقلاب کے کٹر حامیوں کا بھی بغیر اس کے کام نہیں چلتا کہ زمانہ گزشتہ کی تصویر اپنے (مثلاً اشتراکی) رنگ میں کھینچیں اور پھر اسے اپنے معنی پہنائیں۔ لیکن اہل یورپ کی یہ تاریخی پس بینی محض پردۂ خود فریبی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ان کی طبیعت اور ان کی کارگزاریوں کی حقیقی سیرت پر ہے۔ البتہ بالکل حال میں غالباً مشرقی فلسفہ کے اثر سے غیر تاریخی طرز خیال کی علامتیں دن بدن بڑھتی نظر آتی ہیں۔ یہاں کی تعلیمی تاریخ کا تعلق صرف مغرب سے ہے اور چند دن کی بات ہے کہ مشرقی تعلیمی تجربات مثلاً ٹالسٹائے اور ٹیگور کی کوششوں کی طرف توجہ منعطف ہوئی ہے۔ تعلقات تاریخی کی وسعت کے اعتبار سے جرمنی کی تعلیمی زندگی سب سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ فرانس میں تو اس پر زیادہ تر ۱۷۸۹ء کے انقلاب اور نپولین اول کے اثرات کا پرتو ہے اور انگلستان میں یہ کہیں قرون وسطی سے متعلق ہے اور کہیں بلا روایات۔

جرمنی کی یونیورسٹیاں مثل تمام مغربی یورپ کے دار العلوموں کے قرون وسطی یعنی بارھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی کے ختم تک عالم وجود میں آئیں۔ ان یونیورسٹیوں کے قیام

کی تحریک اس زمانہ کے فلسفہ سے ہوئی جو عقلی طریقہ سے فلسفۂ یونان اور کلیسا کے اصولوں میں تطابق کی کوشش کرتا تھا اور جسے عام طور پر "اسکولاسٹک" (Scholastic) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں سب سے مشہور پیرس میں تھی۔ ادھر کولون اور اسٹراسبرگ کے دارالعلوم جرمنی میں بہت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن جب پندرہویں صدی کے آخری حصہ میں قرون وسطیٰ کے مجموعی تعقل عالم کی عمارت مسمار ہوگئی تو ان یونیورسٹیوں کے سر بھی قضا منڈلانے لگی کیونکہ (Scholastic) کی ساری طاقت اب ختم ہو چکی تھی۔ اس موقعہ پر یونیورسٹیوں پر ایک دوسرے انداز خیال کا تسلط ہو گیا جو خود اسی عہد قدیم کا نام لیوا تھا جسے "ہومانزم" (Humanism) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر پندرہویں اور سولہویں صدی میں یہ یونیورسٹیاں اپنے عالم شباب تک پہونچیں۔ پھر خود کلیسائی تجدید سے جو (Lutue) لوتھر اور میلانکتون (Melanchton) کے ہاتھوں عمل میں آئی اس سے بھی یونیورسٹیوں کو کچھ نہیں تو اتنی تقویت تو ضرور پہونچی کہ بزرگ ترین (Humanist) فاضل اراسمس (Erasmus) راٹرڈمی کے یونانی علوم میں فضل و کمال سے۔ لیکن تجدید کلیسا کی تحریک سے عقائد کا تضاد یونیورسٹیوں تک پہونچا، چنانچہ اب تک کیتھولک اور پروٹسٹنٹ یونیورسٹیاں الگ الگ ہیں یہاں تک کہ ایک ہی ریاست میں دونوں موجود۔ مثلاً بادن میں فرائی برگ کیتھولک یونیورسٹی ہے، بخلاف اس کے ہائیڈلبرگ پروٹسٹنٹ۔ ہومانزم کے اثر سے بتدریج مغربی علوم و فنون، یعنی قانون، طب اور فلسفہ علوم دین سے علیحدہ ہو گئے، لیکن آج تک یونیورسٹیوں کی اسناد اور دفتری کاروبار کا لاطینی زبان میں ہونا اس کا شاہد ہے کہ یونیورسٹیوں کے تمدن کا مورث اعلیٰ کون عہد ہے۔ اس طرح آج تک جرمن یونیورسٹیوں کی روایات کی بنیاد (اگرچہ اس حد تک نہیں جیسے انگلستان میں) زمانہ پیشیں پر اُس سے زیادہ ہے جس قدر کہ جدید صنعتی اور فلسفیانہ اسپرٹ کے مطابق ہونا چاہیے تھی۔ پہلے پہل سترہویں صدی یعنی مشہور فلسفی لائبنز (Leibnitz) کے زمانہ میں لوگوں کو ڈولتے ڈلتے یہ بہت

ہوئی کہ یونیورسٹی کی کرسی سے جرمن زبان کا استعمال کریں۔ یونیورسٹیوں کو اپنے ارتقا میں تین مدارج طے کرنے پڑے۔ پہلے یہ کلیسا کی لونڈی بنی، پھر قدیم یونان وروما کی تعلیم کی خردہ فروش اور آخر میں اعلیٰ مغربی تعلیم کا جامع مرکز کیونکہ آج کل خود دینیات تعلیم دنیوی کا ایک جز بن گئی ہے۔ اگر انیسویں صدی میں سائنس کے داخلہ اور صنعتی یونیورسٹیوں کے قیام سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو سترہویں صدی کے بعد یونیورسٹی میں کوئی نمایاں تغیر نہیں ہوا۔

قرون وسطیٰ کی تمام تر درسی تعلیم مذہبی حیثیت رکھتی تھی اور کلیساؤں اور خانقاہوں میں اس کا مقام تھا۔ معاشرتی مدارج کے لحاظ سے یہ امیروں کی تعلیم تھی۔ عوام شہری اور کسان کسی باقاعدہ مدرسہ میں تعلیم نہ پاتے تھے، ان کی تعلیم عموماً جاہل آدمیوں کے سپرد ہوتی تھی جو خود بھی مشکل سے لکھ پڑھ سکتے تھے اور اپنا کم مایہ علم قینچی کے ذریعے شاگردوں کے گلے اتارتے تھے۔

لوتھر نے آکر تعلیم کو عوام تک وسعت دینے کی تحریک کی۔ اس نے قرون وسطیٰ کی خانقاہ کی تعلیم پر الزامات لگائے۔ کہ "راہبوں نے اپنے شاگردوں کو اس طرح مقید رکھا ہے جیسے پنجرے میں چڑیاں بند کی جاتی ہیں" اس نے تمام شہروں کے سرپنچوں، مجلس انتظامی کے اراکین، اور میر مجلسوں کو ایک تحریر بھیجی (۱۵۲۴ء) تاکہ وہ پبلک مدارس قائم کریں جس میں عوام کم سے کم انجیل پڑھنا سیکھ سکیں۔ اس طرح تعلیم عوام کی ابتدا پھر مذہب سے ہوئی اگرچہ بنیاد ادارہ کا انجیل اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی بیاض و اصول ایمان پر مبنی تقوی زمانہ پیشین کے کلیسائی اور راہبانہ عقائد سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن لوتھر شروع ہی سے اپنی عملی جدوجہد میں مدرسوں کے خیال سے بہت متاثر معلوم ہوتا ہے۔ "ہمیں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے عمدہ مدارس کی ضرورت ہے تاکہ مرد ملک اور قوم پر بخوبی حکمرانی کرسکیں اور عورتیں گھر بار۔ بال بچوں اور نوکروں چاکروں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرسکیں"، تاہم ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک مدت درکار تھی۔

سب سے پہلے اعلیٰ طبقوں کی تعلیم ہومانی (Humanistic) مدارس میں جن کے جانشین مدارس ہمارے نزدیک موجود ہیں ان مصلحین اور جیسوئیٹ لوگوں (Jesuits) کے اہتمام میں

ہوتی رہی۔ ان میں لاطینی زبان کا درس سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اسکول کی زبان لاطینی تھی، مدارس کے تماشہ گاہوں میں تماشے لاطینی میں ہوتے تھے۔ اس تعلیم میں سب سے زیادہ توجہ کتابی سبق یعنی تدریس پر کی جاتی تھی نہ کہ اس چیز پر جو انسان کو انسان بناتی ہے یعنی تعلیم و تربیت۔ یوں بھی جرمن اسکولوں نے تعلیم کے حقیقی مسائل کو کچھ دن پہلے تک ہمیشہ درسیات کے پردہ میں پوشیدہ رکھا۔ چنانچہ جرمن مدارس صنعتی تعلیم میں تو ہمسایہ ملکوں پر بہت ترجیح رکھتے تھے لیکن یہاں وہ حقیقی مردم آفرین تعلیم نہ تھی جس پر انگلستان اور امریکہ کے مدارس بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔

سترہویں صدی میں اعلیٰ مدارس کی اصلاح کے لئے دو پہلوؤں سے معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ ایک طرف تو درس و تدریس سے لاطینی زبان کو خارج کرنے اور جرمن زبان کو اس کے شایان شان جگہ دینے کی کوشش شروع ہوئی اور دوسری طرف اس کی منطقی خشونت اور سختی پر حملہ شروع ہوا۔ ان دونوں مقاصد کے لیے لڑنے والے راٹکے (Ratke) اور کامینیس (Commenius) تھے، جنھوں نے تجربہ کے لیے خود اپنے مدارس قائم کیے۔ مار پیٹ اور بیجا سختی کے ذریعہ تعلیم دینے کے خلاف اس اُصول کی تلقین شروع ہوئی کہ "ہر چیز بغیر جبر کے" "ہر چیز قدرت کے نظام قانون کے مطابق"، اس طرح تعلیم کا ایک جدید مطمح نظر قائم ہوا جس کی بنیاد بہتر درسیات اور آسان طرز تعلیم پر تھی۔ اس موقع پر میرے نزدیک جزوی تفصیل کی بہ نسبت نشو و نما کی عام رفتار کا دکھانا زیادہ اہم ہے۔ اس مذکورہ بالا معرکہ آزادی کے بعد عوام کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نئے سرے سے اُٹھایا گیا۔ اس بار بھی اس کی کفیل پروٹسٹنٹ مذہب کی وہ کلیسائی تحریک تھی جو عقائد جمود کے خلاف بلند ہوئی۔ دیہات کی خاموشی میں رہنے والے مذہبیں (Pietists) نے اس نئی تعلیمات کی بنیاد ڈالی جس نے دینیات اور جرمن زبان کے درس کے ساتھ دستکاری اور علم الاشیاء کو بھی مدرسہ میں داخل کیا۔ چنانچہ بلا پس و پیش کہا جا سکتا ہے کہ ان مدارس میں وہ تخم بویا گیا جس کا پھل ہمارے زمانہ کے اوبر ریال شولے (Oberrealschule) ہیں یعنی وہ مدارس جن میں تعلیم کا جزو غالب سائنس ہے۔ اس تعلیم میں

بس ایک چیز کی کمی تھی یعنی ہنسی خوشی اور کھیل کود کی جو بچوں کے سن کے لیے مناسب ہوں۔
اس کی وجہ یہ کہ بچہ کی ذات کی گہری واقفیت ابھی حاصل نہ کی گئی تھی۔ یہ واقفیت اٹھارہویں صدی کا الہام وانکشاف تھی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس شدید عقل پرست صدی کا حریف کہا جائے کہ نئی تعلیمات کا درس سرد مہرانہ اور خشک معقولیت پر مبنی نہیں بلکہ اس کی رگوں میں ایک نہایت شدید احساس کا خون دوڑتا ہے۔ اس حقیقی و تعلیمی صدی میں "فطرت" کا نعرہ گونجتا ہے جسے سب سے پہلے راٹکے (Ratke) ڈرتے ڈرتے زبان پر لایا تھا۔ انگریز لاک نے اس درس کی بنیاد رکھی فرانسیسی روسو نے اپنے مہتم بالشان تعلیمی ناول میں اس کی تکمیل کی اور المانی سوئزرلینڈ کے پستالوزی نے اپنی قلمی اور عملی جدوجہد سے اس کی تائید کی۔

انسان کے خاطی اور عاصی ہونے کے خلاف روسو بہ بانگ دہل کہتا ہے کہ "انسان قدرتاً نیک ہوتا ہے، تمدن نے اسے خراب کر دیا ہے" روسو ہی کے زمانہ سے یورپ کی جدید تمدنی یاس مشربی شروع ہوتی ہے۔ روسو خراب شدہ دنیا کو مخاطب کر کے کہتا ہے "واپس چلو، لوٹو، اسی ابتدائی بدی سے محفوظ فطری زندگی کی طرف!" کہ یہی اس کے نزدیک خداشناسی کی زندگی ہے۔ بچے کے دماغ میں علوم و فنون کا ٹھونسنا اسے برباد کرنا ہے۔ پس پبلک مدارس سے دور رہنا چاہیئے۔
ایک شاگرد کے لیے ایک اُستاد درکار ہے جو اپنے آپ کو بس اسی کے لیے وقف کر دے یہاں تک کہ وہ بیس سال کی عمر تک پہونچ جائے اور یہ اس انسانی پودے کو مضر اثرات سے بچاتا ہے اور اسے اپنے آپ بڑھنے اور پھلنے پھولنے دے۔ انسان کے کردار کے لیے درست وہ چیز ہے جو قلب اور جذبات سے پیدا ہو نہ وہ جس کا تقاضا عقل و فہم کریں۔

ہر بچے کے لیے علٰحدہ اتالیق کی تجویز کو روسو عملی جامہ نہ پہنا سکا لیکن اس سے پستالوزی نے کام لیا۔ اس نے باوجود خارجی مصائب کے ہمیشہ غریب ترین لوگوں کے بچوں کے لیے پدرانہ شفقت کے ساتھ تعلیمی جماعت قائم کی چنانچہ جرمن دیہاتی مدرسوں نے آج تک اس کے مشفقانہ طرزِ تعلیم سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہی نہیں، اس سے بڑے بڑے مشاہیر نے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً فروبل

(Froebel) نے خرد سال بچوں کی تعلیم میں، گوئٹے (Goethe) نے اپنے ناول "ولہلم مائسٹر" (Wilhelm Meister) میں جہاں اس نے ایک تعلیمی حکومت کی تجویز پیش کی ہے (جس کا بنیادی قانون خود اختیاری ادب ہے) اور فشٹے (Fichte) نے قومی تعلیم کے خیالات میں۔ یہ الفاظ مختصر پستالوزی ہماری فطرت کی قوت مجموعی یعنی ہماری "انسانیت"، ہماری "آدمیت" کی ایسی تربیت چاہتا ہے جو واضح مطمح نظر پر مبنی ہو۔

پستالوزی سے کچھ عرصہ پہلے ہی جرمن میں "حب الناس" کی تعلیمی رو نما ہو چکی تھی۔ اس کے متبعین اعلیٰ تعلیم میں روسو کے اصول پر عمل پیرا تھے اور بہ حیثیت محبان انسانیت انھوں نے اپنے خاص نمونہ کے مدارس کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان مدارس نے محض مادی اور خارجی علم کو توپشت ڈالا، اور تربیت قلب پر زیادہ توجہ کی اور طالب علم کے لیے بہت وسیع آزادی بہم پہونچائی۔ بہت سے خیالات جدیدہ کو ہم اُن کے مدارس میں اچھی ترقی یافتہ شکل میں موجود پاتے ہیں۔

جذبات کی اس رو نے اگرچہ تعلیمات کو بھی اپنی قوت اور اہمیت سے بہت کچھ حصہ دیا تاہم اسے خود بھی منظم اور مرتب ہونے کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ یہ کام کانٹ (Kant) کے عقلی خیالات نے انجام دیا اور اس کے بعد ہربارٹ (Herbart) نے اگرچہ اس کی استدلالیت نے اس تحریک کو کچھ نقصان بھی پہونچایا۔ ساری کی ساری انیسویں صدی خیالات تعلیمی کی توسیع میں صرف ہوئی اور یہ اس طرح کہ قدیم تعلیمات انفرادی کے بجائے جدید تعلیمات اجتماعی یعنی خودمیت اجتماعی کی تعلیم کا مسئلہ روز بروز زیادہ قوی ہوتا گیا۔ ہمارے معاصرین میں سے ماربرگ کے مشہور فلسفی ناٹورپ (Natorp) نے اس مسئلہ پر اور اس کے نظری اُصولوں پر خاص طور سے بحث کی ہے۔ بہت سی علامتیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ بیسویں صدی کو بھی تعلیمی اعتبار سے ایک مخصوص اہمیت حاصل ہوگی۔ چنانچہ جرمنی میں آج ہر طرف جدید تعلیمی تجاویز کی بھرمار ہے جن کا ذکر میں اگلے مضامین میں کروں گا۔

ایک مختصر سے مضمون کی حدود میں مختلف مذاہب تعلیمی کی تاریخ کا محض ایک بیرونی خاکہ ہی

دیا جاسکتا تھا لیکن امید ہے کہ تربیت عقلی و ذہنی کے مقابلہ میں تربیت قلبی و جذباتی کی ترجیح کا نکتہ واضح ہوگیا ہوگا، نیز یہ امر کہ قرون وسطیٰ سے لیکر جب بچہ کی ذاتی قدر سے بہت کم واقفیت تھی اور تصویروں تک میں اسے گویا ایک بڑے آدمی کو چھوٹا بنا کر ظاہر کیا جاتا تھا، بچہ کی کیفیات دماغی کے انکشاف تک کیا تغیر ہوا ہے، تربیت و تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت نے محض مضامین درسی کے مقابلہ میں کس طرح اپنے کو آگے بڑھایا ہے اور میدان تعلیم میں جو اصلاً انفرادی تھا شعور اجتماعی کس طرح داخل ہو چلا ہے۔

بس اب ایک بات اور قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ اگر اٹھاویں صدی نظریات تعلیم کی پیدائش میں بہت پیش پیش تھی، تو انیسویں صدی کی خصوصیت امتیازی سرکاری مدارس کی تنظیم کو بتایا جاسکتا ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی نے اگر تعلیمی فلسفی پیدا کیے تو انیسویں نے اس کے مقابل مدارس کے محنتی عہدہ دار اور متدین منظم۔ یوں تو "مذہبیت" کے اثر سے ۱۷۱۷ء ہی میں پروشیا کے اندر ۵ سے ۱۲ سال تک بچوں کے لیے تعلیم لازمی ہوگئی تھی، بادشاہ وقت نے تقریباً دو ہزار مدارس قائم کرادیئے تھے، لیکن جدید مدارس کے قیام کا باضابطہ کام، مختلف نمونوں کی تکمیل، امتحانات اور نصاب کی تنظیم، اساتذہ کی تعلیم، یہ سب انیسویں صدی ہی میں عمل میں آئے۔ چند اہم واقعات درج ذیل ہیں:-

۱۷۸۸ء میں پروشیا میں میٹرک کا امتحان جاری کیا گیا تقریباً اسی زمانہ میں جدید ہومانسٹک (Humanistic) تحریک کے باعث گمنازیم (جرمنی میں ایک خاص قسم کے مدارس کا نام ہے، مختلف اقسام کی مضامین میں ہوگی) زیادہ بارآور ہوئے۔

۱۸۰۹ء میں وہ جامع حیثیات اور ہمہ داں عالم ولیم ہمبولٹ برلن میں وزارت داخلہ اور تعلیم پر مامور ہوا۔

۱۸۱۰ء میں فوقانیہ مدارس میں درس دینے والے اساتذہ کے لیے امتحان کے قواعد شائع ہوئے ۱۸۱۷ء میں وزارت تعلیمی کا بجائے خود ایک مستقل عہدہ قائم کیا گیا، نصاب تعلیم تیار ہوئے اور ان میں ترمیم و تنسیخ برابر جاری رہی یہ تمام کارروائیاں زمانہ جنگ عظیم تک جاری رہیں۔ پھر یہاں پہونچکر جدید تعلیمی اصلاحات کا باب شروع ہوا۔ اس ساری داستان میں ایک چیز برابر محسوس ہوتی ہے یعنی احساس تاریخی کی روز افزوں شدت۔

مرزا کرمانی

مرزا رضا کرمانی سید جمال الدین افغانی کے ان خاص معتقدین میں سے تھے جو انقلاب ایران کے بانی کہے جاتے ہیں۔ ناصر الدین شاہ فرمانروائے ایران کا قتل انھیں کے ہاتھ سے عمل میں آیا اور بیان یہ کیا جاتا ہے کہ اس کا علم سید موصوف کو بھی تھا۔

(مدیر)

قدرت کی بہترین طاقتیں عموماً کبھی کبھی ظہور پذیر ہوتی ہیں اور جو طاقت جس قدر دیر میں نمایاں ہوتی ہے اسی قدر اس کے نتائج مفید اور خوشگوار ہوتے ہیں۔ نسیم سحر کے جھونکے روز چلتے ہیں لیکن ان سے کوئی موسمی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ آندھیاں سال کے خاص خاص اوقات میں چلتی ہیں اور انھیں کے ساتھ ساتھ برق و سحاب کا قافلہ بھی چلتا ہے جو بظاہر مہیب اور خوفناک نظر آتا ہے لیکن دنیا کی کھیتیاں انھی سے سرسبز و شاداب ہوتی ہیں۔

مادی دنیا کی طرح غیر مادی دنیا میں بھی قدرت اسی اصول پر عمل کرتی ہے مثلاً سیاسی دنیا میں تملق، خوشامد، چاپلوسی، عجز، درماندگی اور طوع و رضا کی نمائش روزانہ ہوتی رہتی ہے اور معمولی سے معمولی حکام کی چوکھٹ بھی سجدہائے نیاز کا بہترین ذخیرہ اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے لیکن ان سے شخصی، انفرادی اور جزوی فوائد کے سوا کوئی قابل یادگار نتیجہ نہیں نکلتا مگر بہترین اخلاقی طاقتیں یعنی عزم و استقلال، صبر و ثبات، جوش، ازخود رفتگی، ایثار و قربانی، شجاعت و دلیری ایک باوقار اور ضابط النفس شخص کی آغوش روح میں پرورش پاتی رہتی ہیں اور جس طرح آندھیاں دامن کوہ سے اٹھکر تمام دنیا میں زلزلہ ڈال دیتی ہیں اسی طرح اس عظیم الشان آدمی کے اندر اور طاقتوں کا طوفان اٹھتا ہے اور جبر و استبداد، ظلم و جور اور قساوت و سنگدلی کی بنیادوں کو دفعۃً متزلزل کر دیتا ہے۔ سیاسی اصلاح میں اس شخص کو باغی، فتنہ گر اور مفسد کہا جاتا ہے لیکن قومی دنیا میں اسی شخص کا نام قوم پرست، جاں نثار ملک اور محب وطن ہے اور کسی قدر بے پروائی

کے ساتھ کبھی کبھی اسی کو "انقلاب کوش" بھی کہہ دیتے ہیں۔

یہ مفسد، یا محبِ وطن، یا انقلاب کوش، انسان جب اپنے مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے اٹھتا ہے تو جبر و استبداد اور ظلم و جور کی تمام طاقتیں اس کے مقابلہ میں صف بستہ ہو جاتی ہیں اور فریقین کی آویزش و کشمکش اپنے معمولی درجے سے شروع ہو کر نہایت خوفناک حد تک پہنچ جاتی ہے اور جب تک ان کے ترکشِ عمل و قوت کے تمام تیر ختم نہ ہو لیں یا ان میں سے ایک فنا نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی بھی فتح و شکست کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور یہ آویزش ختم نہیں ہوتی۔ فریقین اپنے کام کو تدریجی طور پر بڑھاتے اور پھیلاتے ہیں مثلاً استبداد سب سے پہلے ترغیب و تحریص کے ذریعے اس کا مقابلہ کرتا ہے وہ اس کے سامنے ہر قسم کے اعزاز و اکرام، جاہ و منصب اور خطاب و امتیاز کو پیش کرتا ہے۔ اب اگر اس کی انقلابی روح اپنے اندر استقامت، استقلال، پختگی، اور کمال نہیں رکھتی تو وہ اسی جام سے مدہوش ہو کر اپنے مقاصد کو فراموش کر جاتا ہے لیکن یہ روح کامل ہے اور اپنے اندر استقلال و استقامت رکھتی ہے تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس منزل سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

اس ناکامی کے بعد استبداد فوراً اپنی دوسری قوتوں کی طرف توجہ کرتا ہے اور جس روح پر مال و زر، اعزاز و اکرام اور منصب و امتیاز کے ذریعے فتح حاصل نہ کر سکا تھا اب خشم و عتاب، تشدد و سخت گیری، بند و زنداں اور دار و رسن کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ حملہ پہلے سے کسی قدر سخت ہوتا ہے لیکن انقلابی روح کی یہ پختگی و استقامت اس کو بھی آسان کر دیتی ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ استبداد کی دردناک سختیاں انقلاب کوش انسان کی جسمانی کمزوری و اضمحلال کا ذریعہ بن جائیں لیکن وہ اس کے مقاصد کی بالیدگی اور ترقی کو نہیں روک سکتیں۔ تشدد اور سخت گیری خود استبداد کے لیے زہر قاتل ہے لیکن انقلابی روح کے لیے آبِ حیات۔ انقلاب کی روح ہنگامی طور پر دبائی جا سکتی ہے لیکن فنا نہیں کی جا سکتی۔ یہ وہ پودا ہے جو ایک بار جم کر برگ و بار لائے بغیر خشک نہیں ہوتا۔ فقید الشرق سید جمال الدین افغانی نے کس قدر صحیح لکھا ہے کہ

"انعدام صاحب نیت اسباب انعدام نیت نیست" صاحب عزم و نیت کو فنا کر دینا اس کی نیت کو فنا کرنے کا ذریعہ نہیں ہے
میرزا احمد رضا کرمانی فنا کر دئے گئے لیکن ان کا مقصد فنا نہیں کیا جا سکا۔ مرزا سے مرحوم کی موت نے تمام ایران میں حریت و انقلاب کی روح پھونک دی اور جو کچھ اپنی زندگی تک صرف وہی کہتے تھے ان کی موت کے بعد ہر شخص کہنے لگا۔

لیکن آؤ، ہم یہاں ان واقعات کی تشریح سے الگ ہو کر صرف مرزا مرحوم کی انقلابی روح کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ اپنے اندر کیا خصوصیات رکھتی تھی؟

نظام عالم کی مشین خیالات، عقائد اور ایمان ہی کے کل پرزوں سے چلتی ہے۔ جو عقیدہ بھی دنیا میں پھیلا دیا جائے اور لوگ اس کو قبول کر لیں، وہی نظام عالم کے قیام و بقا کا ذریعہ یقین کر لیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ سے استبداد کا وجود اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے۔ غالب و فاتح اقوام نے استبداد کو برحق سمجھ لینے پر مفتوح و مغلوب قوموں کو مجبور کیا اور رفتہ رفتہ اقوام عالم میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا اور وہ استبداد کو جائز و برحق سمجھنے لگیں۔ لیکن ایک طویل زمانہ گزر جانے کے بعد آہستہ آہستہ ہر شخص یہ محسوس کرنے لگا کہ ہر ذی روح جو زندگانی اور حیات کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ وہ اپنے اندر کچھ خاص قوتیں رکھتا ہے اور یہ اس کی فطرت و طبیعت کا اقتضا ہے کہ اس کو ان قوتوں کے بڑھانے ان کو اپنے صحیح موقع پر عمل کرنے اور ہر طرح تکمیل کو پہنچنے کا پورا موقع ملے۔ اس احساس کے ساتھ اس نے استبداد کے طرز عمل پر غور کیا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ اس کے اس فطری اقتضا کے بالکل مخالف ہے۔ اس کو زندگی کی ہر منزل میں قدم قدم پر یہ علانیہ نظر آیا کہ اس کو اپنی قوتوں کے بڑھانے اور تکمیل تک پہنچانے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ اس احساس نے دنیا کی ہوا بدل دی اور خیالات میں عام انقلاب پیدا ہو گیا تو اس عام عقیدے کے خلاف دوسرا عقیدہ پیدا ہوا یعنی اب استبداد کی جگہ حریت، آزادی اور مساوات نے لے لی لیکن جانتے ہو کہ جن عظیم الشان انسانوں نے انسانیت کے اس مخفی و ضعیف احساس کو تیز، قوی اور مشتعل کر کے دنیا میں بڑے بڑے انقلابات برپا کیے، ان کے آئینہ اخلاق کا نمایاں جوہر کیا تھا؟

(۱) صبر و استقلال اور ہر قسم کی مصیبت کو خوشی سے برداشت کر لینا۔

"جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ تم اپنے عقائد کے لیے نہایت خوشی سے مصائب برداشت کرتے ہو اور اپنے مذہب کی خاطر موت کو قبول کرنا پسند کرتے ہو تو وہ اُس وقت یہ یقین کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ تم میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک کسی بات کی سچائی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ یہ دیکھ نہ لے کہ لوگ اس حقیقت کے لیے جان دینے پر آمادہ ہیں۔ خطرات کا مقابلہ، قید کی زنجیریں اور پھانسی یہ تینوں دلیلیں لوگوں کو سچائی کا یقین دلا سکتی ہیں۔ اگر تم ان مصیبتوں کو خوشی سے برداشت کرنے سے انکار کرو گے تو گویا تم دوسرے اشخاص کو اپنے مذہب میں لانے کے تمام ذرائع کو اپنے ہاتھ سے کھو دو گے" (ٹالسٹائے)

مرزا رضا نے اپنے عقائد و خیالات کی خاطر نہایت خندہ پیشانی سے مصائب برداشت کیے تم نے ان کے بیان میں پڑھا ہو گا کہ ان کی جائداد و املاک سے ان کو محروم کر دیا گیا لیکن وہ اس پریشان حالی میں بھی اپنے مقاصد کی طرف سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہ ہوئے۔ ان کو بار بار قید و بند کی سختیاں برداشت کرنا پڑیں لیکن ان کی پیشانی ہمت پر نہ بل تھا نہ شکن۔ ان کو وحشیانہ جسمانی تکلیفیں پہنچائی گئیں مثلاً ڈنڈے اور کوڑے لگائے گئے لیکن اس حالت میں بھی ان کی زبان حق گوئی سے باز نہ رہی۔ بیوی اور بچے دنیا میں بڑی چیزیں ہیں اور ان کے لیے انسان ہر قسم کی کفر بے ایمانی پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن مرزا رضا نے اپنے اعلیٰ ترین مقاصد کے مقابلہ میں ان متاع ہائے گرانمایہ کو بھی کوئی وقعت نہ دی۔ اپنی زندگی کے پیہم مصائب کا ایک نمایاں نتیجہ اُنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کی بیوی نے ان سے طلاق لے لی۔ ایک بچہ اپنے والدین کے آغوش محبت سے جدا ہو کر غیر کے سایۂ رحم و شفقت میں پناہ لینے پر مجبور ہوا اور ایک کمسن اور محبوب بچے نے بیکسی و کس مپرسی کے عالم میں سر راہ جان دی۔ لیکن ان تمام مصائب شدائد کے باوجود مرزا رضا کے صبر و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ مصائب کی سختیاں جتنی بڑھتی گئیں، ان کا عزم و استقلال، صبر و ثبات بھی اور زیادہ ترقی کرتا گیا۔ سچ ہے دنیا کی مصیبتیں ایک بلند پایہ انسان کے اخلاقی قوتوں

کو تکمیل تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور قدرت اسی ذریعے سے ان کے اخلاقی معیار کو بلند سے بلند تر کرتی ہے۔

(۴) مقاصد کے ساتھ عشق و شیفتگی

لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ غیر معمولی صبر و ثبات، یہ ناممکن فنا ضبط و استقلال کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے تو جواب یہ ہوگا کہ مقاصد کے ساتھ عشق و شیفتگی سے۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو گی ناممکن ہے کہ انسان جانکاہ مصیبتوں کے لیے تو کیا کسی معمولی سے معمولی مصیبت کو بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہو۔ دنیا میں جن عظیم الشان لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتوں کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا، وہ سرتاپا عشق و شیفتگی کا پیکر مجسم تھے۔ مرزا رضا نے بھی آزادی کی راہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور جس جانبازانہ طریقے سے انجام دیے ہیں، ان میں بھی اپنے مقاصد کے ساتھ اسی جذبۂ عشق و شیفتگی کو دخل تھا۔ وہ قطعاً ان لوگوں میں سے نہیں جن کو خوف و ہراس نے دلیر اور بہادر بنا دیا ہو۔ مصائب شدائد کے مقابلہ میں ان کی دلیری اور بہادری اپنے عظیم الشان مقاصد کے ساتھ عشق و شیفتگی کا نتیجہ تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ چاہتے تو ایران سے باہر قسطنطنیہ میں اطمینان و عزت کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ان کے بیان کے گزشتہ صفحات میں تم یہ پڑھ چکے ہو کہ جب وہ قسطنطنیہ گئے تو نہایت عزت و احترام کے ساتھ سید جمال الدین افغانی کے یہاں رہتے تھے لیکن وہ اس اطمینان و احترام کے طالب نہ تھے۔ وہ اپنے عظیم الشان مقاصد کے آگے ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ اگر قسطنطنیہ میں اس عزت و احترام کی زندگی بسر کرتے تھے تو پھر ایران کیوں چلے آئے کہ یہاں اگر زید، عمر، بکر سے امن و امان کے لیے درخواستیں کرنا پڑیں تو انھوں نے صاف طور پر کہا کہ

> "ہاں میں یہاں آیا اور امن و امان کا طالب رہا۔ لیکن میرے آنے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اپنے مقصد (قتل نائب السلطنت یا قتل شاہ) کو عمل میں لاؤں۔"

کیا ان الفاظ کے پردہ میں مقصد کے ساتھ عشق و شیفتگی کا وہ حسن جلوہ آرا نہیں ہے جس نے ان کو دنیا اور دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ناصر الدین شاہ کا قتل ہے جس کے ذریعے انھوں نے تمام ایران کو نہ صرف نہایت خوفناک اور وحشیانہ مظالم سے نجات دلائی بلکہ ایک حد تک اس کو تباہی و بربادی سے بچا لیا۔ اگر قتل فی نفسہ کوئی قابل تعریف اور پسندیدہ عمل نہیں لیکن کیا ایک سفاک، خونریز اور قاتل انسان کا قتل بھی جرم ہے۔ اور اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر الہامی شریعتیں بھی قتل قصاص کے جواز کی بنا پر مورد الزام قرار پائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل میں عامل کی نیت کو دیکھنا چاہیے۔ مرزا احمد رضا نے اپنی نیت کو ایک سوال کے جواب میں ان الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے۔

"مغرب (یورپ) کی تاریخ پر نظر ڈالو جب تک کسی بڑے مقصد کے لیے قتل اور خونریزی عمل میں نہ آئی وہ مقصد پورا نہ ہوا"

مرزا رضا نے بھی ایک بڑے مقصد (آزادی ایران) کی خاطر اور اس مقصد کے ساتھ عشق و شیفتگی کے جذبہ میں آ کر ناصر الدین شاہ کو قتل کیا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ظالم و سفاک انسان کو قتل کر کے ایک قوم اور ملک کو زندہ کر دینا کوئی جرم ہے۔

(۳) قناعت و استغنا۔

دنیا میں اس قسم کے جتنے جانباز و سرفروش گزرے ہیں ان سب کے آئینۂ اخلاق کا مشترک جوہر قناعت و استغنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان میں قناعت و استغنا نہ ہو وہ کبھی جانبازانہ خدمت کے لیے اپنے کو پیش نہیں کر سکتا۔ وہ شخص جس نے مال و زر کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہو، صرف زر و مال ہی کا پرستار ہو کر رہے گا۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایک نادار و حریص انسان ایک دولتمند انسان کے آگے انتہائی عاجزی و فروتنی کے ساتھ کیوں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا اصلی و حقیقی مقصد حصول زر قرار دے لیا ہے اور یہ اس کو صاف

طور پر نظر آتا ہو کہ وہ دولتمند انسان اس کے اس مقصد زندگی کا مالک ہے۔ اس لیے وہ اس امید پر کہ شاید اس ذریعے سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو، اس کے آگے ہر طرح کی ذلت و بے عزتی کو اپنی انتہائی عزت و سربلندی سمجھکر بخوشی برداشت کرلیتا ہے۔ بخلاف اس کے جس شخص نے سونے اور چاندی کے انبار اور تودہ خاک کو برابر سمجھ لیا ہو وہ ایک گدا کو جس طرح بے نیازانہ نگاہ سے دیکھے گا، اس سے کہیں زیادہ بے پروائی کے ساتھ ایک شاہنشاہ دوراں پر بھی اس کی نظر پڑے گی۔ وہ دنیا کے بڑے سے بڑے دولتمند انسان کی عزت و احترام کے لیے اپنے اندر کوئی جذبہ نہ پائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے شخص کی زندگی دولت و امارت کے ساز و سامان سے خالی ہوگی۔ اور وہ تنگ خیال مفلس کہا جائے گا لیکن کیا افلاس کوئی عیب ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ افلاس فی نفسہ کوئی عیب نہیں یہ صرف اس وقت مذموم ہے جب کاہلی، بے اعتدالی تن آسانی یا بیفکری اس کا سبب ہو۔ مگر اس دلیر، جفاکش، جانباز اور پرستار حق و صداقت انسان کے لیے جو ان اوصاف کے ساتھ ساتھ قانع اور بے نیاز بھی ہو، افلاس درحقیقت بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کی دلیل ہے۔

مرزا احمد رضا بھی دنیا کے ایسے ہی بلند حوصلہ اور عالی ظرف لوگوں میں تھے۔ ان کی زندگی ان کی تنگحالی و پریشان حالی کی ایک بردست شہادت ہے۔ انھوں نے انتہائی عسرت و افلاس میں زندگی بسر کی لیکن اپنی قبائے قناعت کو حرص و طمع کے گرد و غبار سے آلودہ ہونے نہ دیا بلکہ اس سے کچھ اور زیادہ یہ کہ غیر تو غیر اپنے دوستوں کا رہین منت ہونا بھی گوارا نہ کیا۔ ان کے بیان میں تم نے پڑھا ہوگا کہ بہت سے ایرانی ان کے ساتھ خدمت ملک و ملت کے لیے ہم قول و ہم عہد ہوئے تھے لیکن جونہی مرزا رضا گرفتار کرلیے گئے، بہتوں نے اپنی اپنی راہ لی اور خوف سے چھپے چھپے رہنے لگے۔ مرزا رضا نے باوجود مصائب و شدائد ان میں سے کسی ایک کا نام ظاہر ہونے نہ دیا۔ اس اخفاء راز کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہوگئی تھی کہ مرزا صاحب آزادی کے بعد اگر ان کے پاس جاتے تو وہ یقیناً شکریہ کے طور پر ان کی بڑی مدد کرتے اور اس طرح مرزا رضا کے پاس مال و دولت کا خاصہ سرمایہ جمع ہوجاتا۔ لیکن اس نازک اور سخت نازک موقع پر مرزا رضا کی

قناعت پسندی، بلند نگاہی سے ان کو جس فیصلہ پر آمادہ کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

دیدم نامرد ہستند۔ گرسنگی خوردم و ذلت کشیدم وست پیش احدے دراز نکردم

میں نے دیکھا یہ لوگ نامرد ہیں۔ اس لیے مصیبتیں برداشت کیں، بھوکا رہا۔ لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔

(۴) اخفائے راز

روح انقلاب کا ایک ممتاز خاصہ اخفائے راز بھی ہے۔ یعنی یہ روح رکھنے والے اشخاص انتہا درجہ اپنے راز کو مخفی رکھتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو استبداد کی ذکی الحس اور خوفناک قوت کے مقابلہ میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ بہت واضح اور ظاہر امر ہے اس لیئے اس پر کچھ زیادہ لکھنا محض تضیع اوقات۔ تمام دنیا کی انقلاب پسند جماعتوں کا ابتدائی اور اساسی اصول اخفائے راز رہا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کی انقلاب پرست جماعتوں میں یکساں طور پر اس کو بنیاد کار قرار دیا گیا ہے۔ مرزا احمد رضا نے بھی انتہا درجہ رازداری کا ثبوت دیا۔ مذکورہ بالا واقعہ کے علاوہ تم کو وہ واقعہ یاد ہوگا کہ جب وکیل الدولہ کے گھر پر ان سے اصرار کیا گیا کہ اپنے ہمخیالوں اور ساتھیوں کے نام بتائیں تو اس نازک اور تنگ حالت سے نکلنے کے لیے مرزا رضا نے اپنا پیٹ چاک کیا اور ہر طرح کی مصیبت برداشت کی لیکن اپنے ساتھیوں میں سے ایک کا بھی نام نہ بتایا۔ مرزا رضا کے اس زبردست کیرکٹر کی شہادت ناظم الاسلام کرمانی مصنف تاریخ "بیداری ایرانیاں" ذیل کے لفظوں میں دی ہے:-

در فتوت و مردانگی مسلم و متفق علیہ است چہ در حبس آنچہ کردند یکنفر از آشنایاں و دوستاں خود را اکبر ندو نام نیک خود را در صفحہ روزگار باقی گزارد

ان کی جوانمردی و مردانگی مسلم تھی، ان کے استقلال و پامردی پر ہر شخص کو اتفاق تھا، کیونکہ قید خانہ میں ان پر کیسی کچھ سختیاں کی گئیں لیکن انھوں نے اپنے دوستوں میں سے کسی کا نام ظاہر نہ کیا اور اس طرح دنیا میں اپنی نیکنامی چھوڑ گئے

(۵) فخر و ناز

کمال کی داد چاہنا انسان کا فطری جذبہ ہے اور اپنے کمال پر فخر و ناز کرنا اس جذبہ کی تسکین کی

"میں آیا، میں نے دیکھا، اور میں فتحیاب ہوا"

کیا ان الفاظ کے پردہ میں کمال پر فخر و ناز کی روح نہیں پائی جاتی؟ واقعہ یہ ہی کہ دنیا کے ہر صاحب کمال نے اپنے کمال کی داد چاہی ہی اور یہ کوئی معیوب امر نہیں۔ یہ صرف اسی حالت میں معیوب ہی جبکہ بیجا طور پر فخر و ناز کا اظہار کیا جائے۔ جس قول کی تائید عمل سے ہوتی ہو وہ یقیناً بیجا فخر و ادعا کے اثر سے باہر ہوگا اور ایک عمدہ کارنامہ کا اظہار خواہ کسی قدر بلند و شاندار الفاظ میں کیا جائے ہرگز معیوب نہیں کہا جا سکتا۔

مرزا رضا نے بھی جابجا اپنی حیثیت، اپنی شخصیت، اور اپنے قابل فخر کارنامہ پر اظہار فخر کیا ہی۔ مثلاً

"ہاں جبکہ بحمد اللہ یہ بڑا کام (قتل شاہ)، قضا و قدر کے حکم سے میرے ہاتھوں عمل میں آیا"

"بڑے تعجب کی بات ہی میں ایک ضعیف العقل انسان کے ساتھ ایسی صحبت رکھوں جس میں وہ گفتگوے صحبت کی مناسبت سے کوئی شعر پڑھے"

"یقین کرو میں حاجی احمد کو ایک سفیہ انسان سمجھتا ہوں۔ میری جیسی حیثیت کا شخص جو اس قسم کے بڑے کام کرنا چاہتا ہو، وہ ہرگز ایسے لوگوں سے اپنی قصد و نیت کو ظاہر نہیں کر سکتا"

"اس کے بعد ہی بادشاہ آئے اور پھر پیش آیا جو کچھ پیش آیا۔ میں نے ایران اور اہل ایران کی یہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہی!"

بے شبہ ان الفاظ کے پیکر میں فخر و ناز کی روح موجود ہی۔ لیکن کون کہہ سکتا ہی کہ مرزا احمد رضا مرحوم کے لیے بھی یہ فخر فخر بیجا ہی۔

مرزا رضائے مرحوم کی یہی وہ اخلاقی خوبیاں تھیں جنھوں نے ان کی انقلابی روح کو پختہ و مستحکم تر کر دیا

تھا۔ چنانچہ انھوں نے استبداد کے انتہائی ظلم موت تک کو نہایت خوشی خوشی برداشت کرلیا۔
انسان کے تمام محامد و محاسن میں اگر سب سے اول درجہ دیا جاسکتا ہی تو اخلاقی محاسن ہی کو دیا جاسکتا ہی۔ یہ وہ فضیلت ہی جس کو تمام انسانی فضائل پر تفوق حاصل ہی۔ بلکہ سچ تو یہ ہی کہ انسان کے اخلاقی فضائل دوسری بہت سی فضیلتوں کا سرچشمہ ہیں۔ اخلاقی محاسن اپنے اندر کچھ ایسی حقانیت و صداقت رکھتے ہیں کہ دشمن و دوست سب کو ان کا اعتراف کرنا پڑتا ہی۔ دیکھو مرزا رضا نے ناصر الدین شاہ کو قتل کیا باپ کے قاتل پر کس بیٹے کو رحم آسکتا ہی؟ مظفر الدین، شاہ مقتول کا لڑکا ہی، حکمران وقت ہی، وہ ایک مرزا نہیں بلکہ ایسے ایسے سیکڑوں اشخاص کو آن کی آن میں قتل کرا سکتا ہی لیکن بایں ہمہ وہ مرزا رضا کے قتل کو ٹال جاتا اور ان کو چھوڑ دینا چاہتا ہی۔ اس کے ارکان حکومت اصرار کرتے ہیں، قتل قصاص پر اس کو ابھارتے ہیں مگر اخلاقی فضائل کا کس قدر قوی اثر ہی کہ وہ اب بھی اس کے لیے آمادہ نہیں نظر آتا اور اپنے مشیروں کو اس اعتراف آمیز جملہ میں جواب دیتا ہی کہ

ایں شخص قابل کشتن نیست	یہ شخص قتل کیے جانے کے قابل نہیں ہی

بہرحال بالآخر مرزا رضا کو موت آنا تھی، آئی اور دنیا میں آج تک وقت آجانے پر کس نے اس کے پنجہ سے رہائی پائی ہی۔ وجود بجائے خود عدم کا پیغام ہی لیکن بعض موتیں ایسی موتیں ہوتی ہیں جن پر ہزاروں زندگیاں قربان کر دی جاتی ہیں۔ ہم بغیر کسی شک و تذبذب کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرحوم مرزا رضا کی موت بھی اس قسم کی موت تھی۔

ابوالحسنات ندوی

جہانگیر و نور جہاں

ایک تاریخی غلطی کا ازالہ

مسٹر بینی پرشاد، اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ ہند، الہ آباد یونیورسٹی کی ایک محققانہ تصنیف "تاریخ جہانگیری" کے نام سے انگریزی زبان میں حال میں شائع ہوئی ہے۔ فاضل مصنف نے "نور جہاں" کے عنوان سے ایک باب میں جہانگیر اور نور جہاں کے متعلق بعض مشہور واقعات کی تغلیط کی ہے۔ "زیب النساء" اور "مضامین عالمگیر" کے قارئین کے لیے ہمارے خیال میں یہ بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، لہذا مصنف کے ذرائع معلومات سے کام لے کر یہ بحث روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے ناظرین جامعہ کی ضیافت طبع کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

تاریخ کے بعض واقعات کچھ اس طرح مسلم اور صحیح سمجھے جاتے ہیں کہ ان کے متعلق نہ صرف معمولی تعلیمیافتہ اور متعلمیں مدرسہ یقین رکھتے ہیں بلکہ اہل علم اور اساتذۂ فن بھی کسی قسم کے شک و شبہ کے روادار نہیں۔ اسی قسم کے واقعات میں جہانگیر و نور جہاں کے درمیان زمانۂ ولیعہدی عاشقانہ تعلقات، اکبر کا نور جہاں کی شادی جہانگیر کے بجائے شیر افگن کے ساتھ کرا دینا اور پھر موخر الذکر کا جہانگیر کے ایما سے قتل کیا جانا ایسے واقعات ہیں، جو آج بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ اور جنھیں الفنسٹن اور اس قبیل کے دوسرے انگریزی مورخین نے اپنی تصانیف کا مایہ افتخار سرمایہ بنا لیا ہے۔ اس واقعہ پر تفصیل سے بحث کرنے اور نقلی و عقلی دلائل سے غلط ثابت کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ پہلے وہ سادہ واقعات جو عام طور پر مشہور ہیں ایک بار نظر کے سامنے آجائیں۔

واقعات جو عام طور پر مشہور ہیں مرزا[۱] غیاث بیگ، مغربی تاتار کا ایک غریب تعلیمیافتہ، شریف النسل شخص تھا۔ ایک خاتون سے محبت ہوگئی اور بالآخر اس سے شادی کر لی۔ تنگدستی اور افلاس سے عاجز آکر اس نے ہندوستان کا رخ کیا، ایک گھوڑے پر اپنی بیوی کو بٹھایا اور

---

[۱] یہ پورا قصہ ڈاؤ کی "تاریخ ہند" اور دوسری انگریزی تصانیف نیز فارسی تاریخوں میں ملتا ہے۔

خود پاپیادہ ہمراہ ہولیا۔ تھوڑا بہت جو کچھ بھی سرمایہ تھا، راستہ ہی میں ختم ہو گیا۔ مجبوراً فقر و فاقہ پر گزرنے لگی۔ تین دن کی فاقہ کشی کے بعد اس کی بیوی کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ تھوڑی دیر وہ اس انتظار میں رہے کہ شاید کوئی مسافر ادھر آجائے اور ان کی کچھ دستگیری کرنے لیکن آخر کار شب کے خوف سے وہ اس صحرائے لق و دق کو چھوڑ کر آگے بڑھے۔ 'اقتضائے بشریت' اور اقتضائے ضرورت میں کچھ دیر بحث و تکرار رہی لیکن انجام کار انھوں نے اس نوزائیدہ بچے کو پتوں سے چھپا کر ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ ابھی تھوڑی دور بھی نہ گئے تھے کہ ماں کی ماماتا نے بچہ کو یاد کیا، گھوڑے سے اُتر آئی اور بے اختیار پکاری "بچہ! بچہ!" باپ بچہ کو لینے کے لیے اُلٹے پاؤں پھرا اور کیا دیکھتا ہے کہ بچہ کے گرد ایک کالا سانپ حلقہ باندھے بیٹھا ہے۔ اس نے بچہ کو موت کے منہ سے نکالا اور لا کر ماں کی گود میں رکھ دیا۔ غرض بہ ہزار دقت وہ لاہور پہونچے۔ خوش قسمتی سے کسی ایک دوست کی معرفت دربار شاہی تک اُس کی رسائی ہو گئی اور جلدی کسی اونچے منصب پر جگہ مل گئی۔

لڑکی کا نام اُنھوں نے مہرالنسا رکھا جو اپنے سن شعور کو پہنچکر حسن و جمال، موسیقی و مصوری، شعر و سخن میں تمام خواتین مشرق پر فوقیت لے گئی۔ مہرالنسا نے شہزادہ سلیم کے کشور دل پر بھی قابو پانا چاہا اور بالآخر ایک دعوت کی تقریب میں سلیم اس کے دام محبت میں آ ہی گیا لیکن اس کی شادی ایک ایرانی امیر شیر افگن کے ساتھ کر دی گئی۔ جہانگیر جب تخت حکومت پر جلوہ افگن ہوا تو اس نے مہرالنسا کو شیر افگن کے پنجہ سے چھڑانے کی تدبیریں کیں۔ بالآخر ایک ملاقات کے بہانہ سے بنگال کے گورنر قطب الدین نے اس کو مار ڈالا اور مہرالنسا امرائے شاہی کے ہاتھ آئی۔ اس نے ان سے کہا کہ جب میرے شوہر کو اپنی شکست کا پورا یقین ہو گیا تو اس نے یہ وصیت کی تھی کہ میں بلا تامل بادشاہ کی خواہشات پر راضی ہو جاؤں۔ لیکن بادشاہ نے اپنے رضاعی بھائی قطب الدین کے غم میں اس کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا لیکن کچھ عرصہ مہرالنسا کا جادو چل ہی گیا اور جہانگیر اس کے بس میں ہو گیا۔

واقعہ بہ روایت دیگر | تغیر الفاظ اور اختلاف جزئیات کا لحاظ کیا جائے تو یہ واقعہ متعدد طریقوں سے

نقل کیا جا سکتا ہے لیکن تمام روایتوں میں صرف ایک روایت ایسی ہے جو نوعیت کے اعتبار سے مذکورۂ بالا بیان سے بہت کچھ مختلف ہے اور جو انگریزی مدارس کی درسی کتابوں کے ذریعہ عام طور پر مشہور ہے۔ مذکورالصدر روایت میں عشق و محبت کا اظہار نور جہاں کی جانب سے ہے لیکن اس روایت میں اُنس و شیفتگی کا اظہار تمام تر جہانگیر کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس بنا پر زمانۂ ولیعہدی میں جہانگیر کا نور جہاں پر عاشق ہونا، اکبر کا نور جہاں کی شادی جہانگیر کے بجائے شیر افگن سے کرا دینا، عہد حکومت میں جہانگیر کے ایما پر شیر افگن کا قتل کیا جانا اور پھر نور جہاں کا اپنے عزیز شوہر کے سوگ میں کئی سال گزار دینا اور بالآخر جہانگیر کے اصرار سے شادی کرنے پر مجبور ہونا یہ تمام واقعات اس سلسلۂ روایت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بہر حال اس سے غرض نہیں کہ اقدام عشق کس کی جانب سے ہوا اور آیا نور جہاں جہانگیر سے روٹھی یا یہ اس سے ناراض رہا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کی مدافعت کر کے دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا ہمیں منظور نہیں بلکہ سرے سے واقعہ کی اس نامکمل صورت کو مٹانا مقصود ہے اور ان جزئی واقعات کی تغلیط کرنی ہے جنھوں نے ایک سادہ واقعہ کو بدل کر اسے حسن و محبت کا افسانۂ رنگیں اور جور و ستم کی داستانِ خونیں بنا دیا ہے۔ اور جو کچھ بیان کیا گیا وہ عام روایت کی رو سے ہے جو بہ اختلاف جزئیات ہر خاص و عام کی زبان پر ہے اور جو تمام انگریزی تصانیف اور بعض بعد کی فارسی تاریخوں میں مذکور ہے۔ اسی کے متوازی ہم مصنف کی تحقیق کی رو سے اصل واقعہ کو بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں اور پھر جہاں ہر دو روایات میں فرق یا تناقض نظر آئے گا، اس پر آگے چل کر بحث کریں گے۔

اصل واقعہ مصنف کی تحقیق کی رو سے

نور جہاں کے جد امجد خواجہ محمد شریف تاتار سلطان بگلر بیگی خراسانی کے وزیر تھے سلطان کی وفات کے بعد وہ قزاق خاں (جانشین سلطان بگلر بیگی) کے عہد میں بھی اپنے عہدہ پر معمور رہے۔ اس کے انتقال کے بعد شاہ طہماسپ کے زمانہ میں وہ اسی جگہ سے منتقل کر دیا گیا۔ ۱۵۷۷ء میں اس کا خود انتقال ہو گیا اس کے بعد اس کا ستارۂ اقبال بھی ڈھلنے لگا۔ اس کے بیٹے مرزا غیاث الدین محمد کو جو عام طور پر غیاث بیگ کے نام سے مشہور

ہیں۔ ایران کی زمین تنگ معلوم ہوئی اور اُنھوں نے ہندوستان کا قصد کیا۔ اپنے دو بیٹوں محمد شریف اور ابوالحسن، اپنی لڑکی اور بیوی کو جو اس وقت حاملہ تھی، ہمراہ لیکر ایک بڑے تاجر ملک مسعود کے کارروان کے ساتھ روانہ ہوا۔ ایران سے ہندوستان تک کا راستہ ایسا پُرخطر اور غیر محفوظ تھا کہ بڑی سے بڑی جماعت کی بھی رفاقت سفر حفاظت جان ومال کی ضامن نہیں ہو سکتی تھی۔ ابھی نصف راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ غیاث بیگ کا سارا مال اسباب بجز دو خچروں کے لٹ گیا۔ قندھار پہنچکر اس کی بیوی کے لڑکی پیدا ہوئی۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ غریب چہ وبچہ کی اس حالت میں پرداخت و پرورش بھلا کیونکر ممکن تھی۔ ملک مسعود کو ان کی اس حالت پر رحم آیا اور اس نے ان کی تمام ضروریات کی کفالت کر لی۔ اس بنا پر دونوں میں دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ ہندوستان پہنچکر ملک مسعود نے غیاث بیگ کو شہنشاہ اکبر کے دربار میں روشناس کرایا اور وہ فوراً خدمات شاہی کے سلسلہ میں لے لیا گیا۔

غیاث بیگ مرزا غیاث بیگ جس کی زندگی میں ولادت بچہ نے ایک نیا دَور پیدا کیا، ایک تعلیم یافتہ شخص تھا۔ ذہانت کے ساتھ ساتھ محنت وجفاکشی کی بھی عادت تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کافی اثر اور عزت پیدا کر لی۔ سنہ ۱۵۹۵ء تک ہ سہ صدی کے منصب پر پہنچ گیا اور اخیر میں دیوان کابل کے عہدہ پر معمور کر دیا گیا۔

مہرالنسا اسی دوران میں وہ چھوٹی لڑکی تھی جس کا نام مہرالنسا رکھا گیا سن بلوغ کو پہنچی اور ایک ایرانی نوجوان مسمیٰ بہ علی قلی استاجلو کے ساتھ بیاہ دی گئی۔

شیرافگن علی قلی، ایران کے بادشاہ اسمٰعیل ثانی (سنہ ۱۵۷۶ء سے سنہ ۱۵۷۸ء) کا سفرچین تھا۔ سلطان کی وفات یا قتل کے بعد اسے اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ ایک مدت کی بادیہ پیمائی کے بعد وہ قندھار کے راستہ ملتان پہنچا اور وہاں عبدالرحیم خانخاناں کی فوج میں شامل ہو گیا جو اس وقت تھٹہ فتح کر رہی تھی۔ اس مہم میں علی قلی نے اپنی دلیری اور پامردی کی بدولت کافی شہرت حاصل کر لی۔ خانخاناں کی نظر جب اس پر پڑی تو اس نے اپنی مراسلت میں شہنشاہ سے تذکرہ کیا

اوراس کے لیے ایک عہدہ حاصل کر لیا۔ اس مہم کے ختم ہونے پر ۱۵۹۴ء میں خانخاناں اسے اپنے ہمراہ لاہور (جو اس وقت سلطنت مغلیہ کا پایہ تخت تھا) لے گیا اور اسے حلقہ خواص میں متعارف کیا۔ کچھ عرصہ بعد غیاث بیگ کی لڑکی سے اس کی شادی ہو گئی۔ ۱۵۹۹ء میں وہ شہزادہ سلیم کے اسٹاف میں داخل کر لیا گیا جو اس وقت میواڑ کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔ علی قلی نے ایک بار ایک شیر مارا اور اسی ہمت و دلیری نے شہزادہ کی زبان سے اسے "شیر افگن" کا لقب لایا۔ نیز اس کارنامہ پر شہزادہ اس سے بیحد خوش ہوا۔ بغاوت میں اس نے جہانگیر کا ساتھ دیا لیکن پھر چھوڑ کر اکبر کے پاس چلا گیا اور تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے اس کی بے وفائی سے چشم پوشی کی اور بردوان (بنگال) میں جاگیر دیکر ایک بڑے عہدہ پر مقرر کر دیا۔

شیر افگن کا قتل

بنگال اس زمانہ میں بدامنی اور شورش، بغاوت و سازش کا منبع تھا اور تمام ناراض شدہ افغانیوں کا مرکز۔ جہانگیر کو شیر افگن کے متعلق بغاوت کا شبہ ہوا، قطب الدین خاں کو جو مان سنگھ کی بجائے ۱۶۰۶ء میں بنگال کا گورنر مقرر ہوا تھا، یہ حکم ملا کہ شیر افگن دربار میں حاضر کیا جائے اور بہ صورت عدم حاضری قطب الدین کو سزا دینے کا اختیار بھی دیا گیا۔ مارچ ۱۶۰۷ء میں قطب الدین، بردوان کو روانہ ہوا اور کہلا بھیجا کہ شیر افگن اس سے آ کر ملے۔ شیر افگن مع دو آدمیوں کے گورنر کی ملاقات کو آیا۔ خیمہ میں داخل ہوتے ہی لشکر شاہی کو حکم ہوا کہ اسے ہر چہار طرف سے گھیر لیں۔ یہ دیکھ کر وہ بہت غصہ ہوا اور قطب الدین سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ قطب الدین یہ بتانے کے لیے آگے بڑھا، شیر افگن غصہ میں تو تھا ہی، تلوار نیام سے کھینچی اور گورنر پر ایک وار کیا، پھر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ انبہ خاں کشمیری نے ایک ہاتھ مارا گو خود بھی زخم کاری کھایا۔ بیچارے شیر افگن پر تمام سپاہی ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ انبہ خاں تو اسی دم ختم ہو گیا لیکن قطب الدین کوئی بارہ ۱۲ گھنٹہ تک زندہ رہ کر دم توڑا۔ اس واقعہ نے جہانگیر پر اس قدر گہرا اثر ڈالا کہ وہ اس کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔

جہانگیر و نورجہاں کی شادی

شیر افگن کے قتل کے بعد اس کی بیوی مہرالنسا اور لڑکی جس کا نام

لاڈلی بیگم تھا، دونوں دربار شاہی میں چلی آئیں۔ یہاں آکر مہرالنسا سلطان سلیمہ بیگم کی خدمت میں مقرر ہوئی۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں اتفاقیہ جہانگیر کی نظر اس پر پڑ گئی اور اخیر مئی تک دونوں میں شادی ہوگئی، یہ ہے حقیقت اس مشہور و معروف شادی کی۔

فن تاریخ اور محکمۂ قضا | یہ صحیح ہے کہ فن تاریخ اور محکمۂ قضا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مورخ کا واقعہ نگار قلم اور جج کا فیصلہ کن بیان دونو ایک نہیں ہو سکتے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ تاریخ میں اکثر ایسے بحث طلب متنازعہ فیہ مسائل آتے ہیں جہاں مورخ کو جج کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے، اس بنا پر عام تاریخی روایتیں اور ہمارا تحقیق کردہ بیان دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ان کے پڑھنے کے بعد اختلاف واقعہ اور تناقض روایت کے لحاظ سے حسب ذیل چار تنقیحات قائم کی جا سکتی ہیں:-

۱۔ آیا جہانگیر کے زمانۂ ولیعہدی میں جہانگیر و نورجہاں کے درمیان عشق و محبت کے تعلقات تھے؟

۲۔ آیا اکبر نے جہانگیر کو شادی کرنے سے باز رکھا اور نورجہاں کی شادی شیر افگن کے ساتھ کرا دی؟

۳۔ آیا جہانگیر نے شیر افگن کو قتل کرایا اور اس غرض سے کہ اس کی بیوی ہاتھ آئے؟

۴۔ آیا نورجہاں نے جہانگیر کی شادی کے متعلق متعدد درخواستوں کو ٹھکرایا؟

معاصرانہ تاریخیں | تنقیحات بالا پر عقلی دلائل سے بحث کرنے سے قبل دیکھو کہ معاصرانہ تاریخیں کہاں تک ان واقعات کی تائید کرتی ہیں۔ بلاشبہ سب سے پہلے جس تاریخ کا نام زبان پر آئے گا وہ تزک جہانگیری ہے جو اواخر سولہویں صدی اور سترہویں صدی کے ابتدائی نصف صدی کی مستند ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے، جہانگیر نے اس میں شیر افگن کے بعض حالات اور اس کے قتل کا تذکرہ کیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس نے نورجہاں سے شادی کرنے کی غرض سے اس کو قتل کرایا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ انسان اخلاق کے اس بلند درجہ تک ابھی تک نہیں پہنچا ہے کہ وہ اپنے معائب کو اسی صحت و صداقت کے ساتھ بیان کرے جس خوبی سے وہ اپنے محاسن کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ بھی کیا ضرور تھا کہ جہانگیر ضمناً بھی

شیر افگن کے قتل کا ذکر کرنا ہی اپنے دامنِ اخلاق پر ہمیشہ کی بدنامی کا دھبہ لگانے کے لیے سامان خود ہی مہیا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ معتمد خان نے تزک کی تکمیل شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں کی۔ کامگار حسینی کی تصنیف میں بھی شاہجہاں کو بہت کچھ دخل تھا۔ شاہجہاں اور نورجہاں کے تعلقات جس قدر کشیدہ تھے وہ بھی آپ سے مخفی نہیں، ایسی صورت میں ناممکن تھا کہ ہر دو مورخین اپنے آقا شاہجہاں کی خوشنودی اور پاسداری کے خیال سے اس قسم کا کوئی واقعہ جو نورجہاں اور جہانگیر کے اخلاق پر برا اثر ڈال سکے لکھنے سے باز رہتے لیکن صراحتاً یا کنایتاً اس قتل اور متعلقہ واقعات کا کوئی ذکر نہیں۔ عبدالحمید لاہوری اور شاہجہانی کے دوسرے مورخین نورجہاں کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن اس کو کوئی نہیں لکھتا کہ نورجہاں نے اپنے سابق شوہر کے "قاتل" کے ساتھ "مجبور ہو کر" شادی کی۔

یورپین مورخین

ممکن ہے ہمارے معترضین حضرات اس کے مقابل میں یہ پیش کریں کہ درباری مورخین نے جہانگیر کی ذاتی بدنامی سے پورے خاندانِ مغلیہ پر دھبہ لگنے کے اندیشہ سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ اولاً تو ان مورخین سے اس دور اندیشی اور پیش بندی کی توقع رکھنی بعید از قیاس ہے، دوسرے اگر انھوں نے ایسا کیا بھی ہے تب بھی یہ حالات یورپین سیاحین اور تجار کے قلم سے کیونکر چھوٹ سکتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مشرق و مغرب میں آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا اور یورپین اشخاص تجارت، سیاحت، سفارت نیز دیگر اغراض سے ہندوستان آتے رہتے تھے اور کبھی کبھی طویل قیام بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ہندوستانیوں کے عادات و اطوار، رسم و رواج، سیاست و معاشرت غرض ہر چیز ان کی نظر میں عجیب غریب معلوم ہوتی، جس کا ذکر وہ عموماً اپنے خطوط یا تحریروں میں کرتے رہتے تھے معمولی سے معمولی واقعہ بھی اگر سن پاتے تو اس کا ذکر بھی کسی طرح کر دیتے تھے۔ شہزادہ سلیم اور اُس کی سوتیلی ماں، نورجہاں اور اس کے سوتیلے بیٹے کے درمیان ناجائز تعلق کی کہیں سے اڑتی پڑتی سن لی اور اس کو فوراً لکھ لیا۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ نورجہاں و جہانگیر کے یہ واقعات جس کے لیے انھیں کافی مواد بھی مل سکتا تھا، ان کے قلم سے بچ نکلتا۔ نورجہاں کے ابتدائی حالات، اس کے شوہر کا قتل، جہانگیر کے ساتھ شادی اور آخر زمانہ حکومت میں اس کا ہمہ گیر اثر ان میں سے ہر ایک کا

ذکر ان یورپین مصنفین کے ہاں ملے گا لیکن اس کا کہیں نہیں پتہ چلتا کہ ہر دو کے درمیان ابتدائے عشق و محبت کے تعلقات تھے اور اس وجہ سے جہانگیر نے شیر افگن کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کیا۔ ہاکنس جو ترکی زبان سے بخوبی واقف تھا، شیر افگن کے قتل سے کچھ عرصہ بعد شاہی دربار میں پہنچا، منصبداروں کے زمرہ میں داخل ہوا، بہت سی ملاقاتیں پیدا کیں اور جہانگیر سے شادی ہونے کے کچھ عرصہ بعد چلا گیا لیکن اس مفروضہ داستان عشق و محبت اور اس مصنوعی قتل کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ سر طامس رو بسلسلہ سفارت ۱۶۱۶ء میں یہاں آیا بعض تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے امرائے سے ملا۔ خود جہانگیر کی معیت میں مانڈو اور احمد آباد تک سفر کیا۔ اس عرصہ میں اور اس طرح کے قیام میں جہانگیر اور نور جہاں کے یہ واقعات اس کے کانوں تک پہونچنے سے رہ نہ گئے ہوں گے۔ سر طامس رو نے جہانگیر، نور جہاں اور شاہجہاں وغیرہ سب کے حالات سے بحث کی ہے، ناممکن تھا کہ ان واقعات سے چشم پوشی کرتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے خوشامد یا خوف کے خیال سے ایسا کیا ہو جبکہ اس کو اپنے مقصد میں بھی جہانگیر کی طرف سے ناکامی ہوئی اور جس کی جرأت اخلاقی اور خودداری کا یہ حال کہ دربار شاہی میں پہنچتا ہے تو آداب سلام کے خلاف اس کا سر نیاز زمین سے جا نہیں لگتا بلکہ معمولی طریقہ کے مطابق سلام کرتا ہے۔ ایڈورڈ ٹیری بھی کئی برس دربار مغلیہ میں مقیم رہا اور اس وقت جبکہ نور جہاں کے اثر و اقتدار کا عین شباب تھا لیکن وہ صرف اس قدر لکھتا ہے کہ جہانگیر نے "نور جہاں[۵۱] کو ایک معمولی خاندان سے رتبہ اعلیٰ پر گویا فرش سے عرش پر پہنچا دیا"۔ ۱۶۲۳ء میں پیٹرو ڈیلا ویل نے گو اپنا سفر مغربی سواحل تک محدود رکھا لیکن شاہی دربار کے یہ حالات اس سے مخفی نہ رہے ہوں گے وہ اپنے سفرنامہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

"وہ[۵۲] (نور جہاں) ایک ایرانی کپتان کی بیوی تھی جو مغلیہ خدمات کے سلسلہ میں تھا۔ اپنے شوہر کی

---

۵۱ "مشرقی ہند کا سفر" صفحہ ۴۰۴، مصنفہ ایڈورڈ ٹیری

۵۲ "سفرنامہ پیٹرو ڈیلا ویل" حصہ اول صفحہ ۵۳

وفات کے بعد اُسے نہ جانے کیسے ایک بہتر موقع ہاتھ آ گیا جیسا اکثر نوجوان مسلمان عورتوں کو ملتا ہے؟ شاہ تسلیم نے اُسے دیکھ لیا اور دونوں میں محبت ہو گئی"

گو تاریخی حیثیت سے یہ بیان قابل وقعت نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے پیش کرنے سے مقصود صرف یہ تھا کہ صاحب سفرنامہ نے اس واقعہ کا ذکر بھی کیا تو مبحوث فیہ مسائل کی تصدیق کے کیا معنی اسکی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ سر طامس ہربرٹ جہانگیر کے اخیر زمانہ حکومت میں آیا، اس نے جہانگیر کے عہد حکومت کے بہت سے حالات قلمبند کیے۔ پیٹر منڈی نے اپنے سفرنامہ میں یورپ اور ایشیا کے حالات ۱۶۰۰ء سے ۱۶۶۷ء تک کے لکھے ہیں اور وہ خود بھی ۱۶۲۸ء سے ۱۶۳۴ء تک ہندوستان میں موجود تھا، جہانگیر اور نور جہاں کے حالات دونوں نے تحریر کیے ہیں لیکن ان واقعات کے متعلق ان میں سے کسی کے ہاں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ برنیر ایک عرصہ کے بعد آیا اور اس نے جو اپنا سفرنامہ لکھا ہے اس میں جہانگیر کے اخلاق، نور جہاں کے اثر، شاہجہاں، جہاں آرا اور روشن آرا کے متعلق بہت سی افواہیں نقل کی ہیں لیکن ان نام نہاد تاریخی واقعات کی طرف کوئی اشارہ نہیں غرض ان یورپین مورخین کے سفرناموں اور تحریروں میں شروع سے آخر تک چراغ لیکر ڈھونڈھو لیکن جہانگیر اور نور جہاں کے درمیان عشقیہ تعلق اور اس کی وجہ سے اول الذکر کے ایماء سے نور جہاں کے شوہر شیر افگن کے قتل کا سراغ کہیں نہیں پاؤ گے۔ یہ مغربی مصنفین ہندوستان کی بری بھلی ہر بات پر گوش بر آواز رہا کرتے تھے، ناممکن تھا کہ یہ واقعات ان کے قلم سے بچ جاتے۔

واقعات کی تحقیق فن درایت کی رو سے

جہاں تک روایت کا تعلق تھا، خواہ وہ درباری مورخین کی رہی ہو یا غیر ملکی سیاحین و مصنفین کی، ہم نے ہر چند چھان بین کی ان واقعات کا کہیں نہیں پتہ چلتا۔ آیئے سگے ہاتھوں درایت کی کسوٹی پر بھی پرکھیں۔ سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ جب جہانگیر و نور جہاں میں شادی کی ٹھہر گئی تھی تو اکبر کو اس سے انکار کر کے شیر افگن کے ساتھ کرا دینے کی کیا وجہ تھی؟ ہمارے گزشتہ بیان سے آپ نے اندازہ کیا ہو گا کہ مرزا غیاث (الملقب بہ شیر افگن)، کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کے ہاتھ میں کبھی حکومت

ایران کا قلمدان وزارت رہ چکا تھا۔ گردشِ ایام سے مرزا غیاث کو ہندوستان آیا لیکن اقبال نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا اور وہ حرم شاہی کا "افسر مطبخ" (جو بے شبہ حکومت مغلیہ میں ایک معزز اور ممتاز عہدہ سمجھا جاتا تھا) مقرر کیا گیا۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اکبر نے شادی کے معاملہ میں مداخلت کی ہو جبکہ سلاطین مغلیہ میں شادی کے متعلق نسل و قوم کا چنداں لحاظ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ امر ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کی منظورِ نظر اس سے چھوڑا کر شیر افگن سے منسوب کی جاتی اور جہانگیر و شیر افگن کے تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوتی۔ برعکس اس کے دیکھا جاتا ہے کہ ۱۵۹۹ء میں اکبر جیسا دور اندیش حکمراں اسی شیر افگن کو میواڑ کی مہم میں جہانگیر کے ہمراہ کرتا ہے۔ اس حالت میں تم کس سے انکار کروگے، شہنشاہ اکبر کی دور اندیشی سے یا نفسِ واقعہ کی صحت سے؟ نہ صرف یہی بلکہ آگے چل کر دیکھو کہ اس کے ساتھ کیا کچھ سلوک کرتا ہے۔ کنایۃً یا صراحۃً اس مہم میں جہانگیر کے رویہ کی کوئی شکایت نہیں معلوم ہوتی بلکہ خود شیر افگن جہانگیر کی بغاوت میں اس کا ساتھ چھوڑ کر اکبر سے مل جاتا ہے لیکن جب وہی جہانگیر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو انتقام کی بجائے اس کے اعزاز و اکرام میں مزید اضافہ کرتا ہے اور "شیر افگن" کا لقب خود اس کی شہادت دیتا ہے۔ جہانگیر کو شیر افگن کا "قاتل" بتانے والے مورخین نہ جانے اس کا کیا جواب دیں گے؟ تیسرے یہ کہ نور جہاں جیسی عالی نسب اور شریف و پاکباز عورت اگر یہ سمجھتی ہوتی کہ جہانگیر کا ہاتھ اس کے عزیز شوہر کے خون سے لال ہے تو وہ کبھی اس کی رفیقِ حیات بننے پر آمادہ نہ ہوتی۔ اس نے جہانگیر کے ساتھ جس انس و محبت، اخلاص و وفاشعاری کی زندگی گزاری، وہ خود اس کی عفت و عصمت کی ایک بین دلیل ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ بنگال میں قطب الدین خاں کا تقرر گورنری اس مصلحت خاص سے کیا گیا تھا کہ شیر افگن کو قتل کر کے نور جہاں حاصل کی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو کی بغاوت ختم ہونے پر جہانگیر نے بعض سابق حکاموں کو جو اس کی پالیسی کے موافق نظر نہ آتے تھے علاحدہ کر دیا۔ راجہ مان سنگھ سابق گورنر بنگال اسی وجہ سے وہاں سے ہٹائے گئے اور ان کی

جگہ پر قطب الدین کا تقرر عمل میں آیا۔ رہا شیر افگن کا قتل اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے اس زمانہ کی بنگال کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ اس وقت بنگال کی سیاسی فضا شورش، بغاوت اور خفیہ سازشوں سے پُر تھی۔ سترہویں صدی کی ایک شخصی حکومت میں ان جرائم کا انسداد قتل و گردن زدنی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور پھر ایک ایرانی جانباز سے جو ایک بار بغاوت کے سلسلہ میں بے وفائی کا ثبوت دے چکا ہے، یہ کچھ بعید نہ تھا کہ ایسی فضا میں وہ کردہ کوئی دن علم بغاوت بلند کر دے، ایسی حالت میں اگر شیر افگن کے قتل کی یہ وجہ سمجھی جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر مانع ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سلسلہ میں دیگر اشخاص کا خون ہوا یا خود شیر افگن کی سزا کا کوئی اور استعمال کیا جا سکتا تھا، بہرحال ان کا ذمہ دار اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ قطب الدین کا طرز عمل ہے۔ خاوند کے انتقال کے بعد نور جہاں کا دربار شاہی میں آنا لازمی امر تھا کیونکہ اس کے باپ اور بھائی اب تک یہاں بڑے بڑے عہدوں پر موجود تھے۔ یہاں مینا بازار[1] میں جہانگیر کی نظر نور جہاں پر پڑی اور پھر بعد میں اس کا حرم شاہی میں داخل کیا جانا یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں۔

یہ واقعات کیونکر اور کیسے مشہور ہوئے

روایۃً آپ نے دیکھ لیا کہ معاصرانہ تاریخوں میں ان واقعات کا کہیں نشان نہیں۔ درایت کے در بار سے بھی یہی حکم ملا کہ واقعات کسی طرح قرین قیاس نہیں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مروجہ تاریخوں میں یہ اس قدر جلی حروف میں کیسے نظر آ رہے ہیں؟ جہانگیر سے تقریباً دو نسل گزر جانے تک ان واقعات نے تاریخ میں جگہ نہیں پائی تھی۔ اس کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل واقعہ کے شرارے نے رفتہ رفتہ کوہ آتش فشاں کی صورت اختیار کر لی۔ شیر افگن کے قتل کے بعد نور جہاں کا حرم شاہی میں داخل ہونے نے دو صدی بعد تاریخ کی غبار آلود فضا میں یہ شبہ ضرور پیدا کر دیا ہوگا کہ شیر افگن کے قتل سے جہانگیر کا مقصد حصول زن تھا۔ اس کے لیے یہ امر ثابت کرنا ضروری ہوا

---

[1] ایک قسم کا بازار لگا کرتا تھا جس میں نفیس اور عمدہ اشیاء سے دکانیں مزین ہوتی تھیں۔ شہزادیاں اور امراء کی خواتین کاندار ہوتی تھیں اور شہزادے و امراء خریدنے آتے۔ خرید و فروخت میں جو لطف مذکور ہوتی وہ ان کے عیش پسندی کا ایک طریقہ تھا۔

کہ جہانگیر و نورجہاں میں ابتدا ہی عشق و محبت کے تعلقات تھے۔ اس کے باوجود بھی نورجہاں، جہانگیر کی بجائے شیر افگن سے منسوب ہوئی، اس کی تاویل اس سے بہتر اور کیا کی جا سکتی تھی کہ شہنشاہ اکبر مانع رہا اور اسی نے شیر افگن سے شادی کرادی۔ یہ ہیں ان واقعات کی تصنیع کے متعلق نفسانی تحقیق۔ رہی یہ بحث کہ یہ واقعات کن ذرائع سے رائج ہوئے اس کے لیے تاریخی سراغ رسانی یہ پتہ دیتی ہے کہ محمد صادق تبریزی کے بیان پر خافی خاں، سجن رائے اور دیگر مصنفین نے حاشیہ آرائی کرتے ہوئے یہ تمام واقعات نقل کیے ہیں کہ کس طرح شہزادہ سلیم اور مہرالنساء دونوں باہم کھیلا کرتے تھے اور جب سلیم نے اُسے اپنی آغوش میں لیا تو کس طرح مہرالنساء نے اسکی شکایت حرم سرا کی دوسری شہزادیوں سے کی اور کیسے یہ خبر اکبر کے کانوں تک پہنچی اور اس نے غصہ ہو کر شادی کو روک دیا پھر کس طریقے سے جہانگیر نے قطب الدین کی وساطت سے نورجہاں کے حاصل کرنے کی کوشش کی وغیرہ وغیرہ یہ قصہ طبع انسانی کے لیے جس قدر دلچسپ ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلم سے نکلتے ہی آتش صحرا کی طرح ہر چہار طرف پھیل گیا۔ سترہویں صدی کی ابتدائی نصف میں اس کا کہیں پتہ نہیں لیکن بعد کی تصنیفوں میں صاف نظر آنے لگا۔ فارسی مورخین اس کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ راجپوت بھاٹوں نے اس کی مزید تائید کر دی۔ اختتام صدی کے قریب اطالوی سیاح منوسی نے اس پر خوب رنگ آمیزی کی۔ اٹھارہویں صدی میں ڈاؤ وغیرہ نے اس کے بقیہ خدوخال کو بھر کر ایک اچھا خاصہ مرقع بنا دیا۔ انیسویں صدی میں الفنسٹن نے خافی خاں سے لیکر بعد کے مورخین کو دیا اور یہی آج عام طور پر زینت دہ تاریخ ہے اور بچہ بچہ کی زبان پر رائج، تصویر کا ایک طرف وہ پہلو سامنے آتا ہے اور دوسری جانب یہ رخ دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکل پڑتا ہے کہ

ع۔ کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

سعید انصاری، متعلم جامعہ

معاشی تاریخ ہند

کا

ایک ورق

"یہ مختصر سا مضمون اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ یورپی سوداگروں کی جمعیت ہندوستان میں بحیثیت تاجر مقیم تھیں اور انجام کار ایسٹ انڈیا کمپنی (انگلستان کی ایک سوداگر جماعت) ایک عرصہ کے بعد نہ صرف تاجروں کی حیثیت سے رہی بلکہ جیسا کہ معلوم ہے رفتہ رفتہ منافقانہ و جارحانہ حکمت عملی کے ساتھ ایک حکمراں جماعت بن گئی۔ اس کا عہد عروج جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) سے شروع ہو کر عہد تخت نشینی ملکہ وکٹوریہ (۱۸۳۷ء) تک جبکہ حکومت ہند تاج انگلستان (کراؤن آف انگلینڈ) کو منتقل ہوتی ہے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ عرصہ اسّی برس کا تاریخ ہند میں بلحاظ تباہی صنعت و تجارت و افلاس عامہ ایک حیرت انگیز و خوفناک عہد ہے جس کی مثال کسی ملک کی تاریخ بھی آسانی سے نہیں پیش کر سکتی۔"

مورخین تاریخ ہند نے جو زیادہ تر انگریز ہی ہیں ہندوستان میں برطانیہ کے سیاسی و فوجی کارناموں و حسن انتظام کی مدح سرائی میں نہایت قابلیت کے ساتھ اعلیٰ معلومات کا ایک کثیر ذخیرہ بہم پہونچایا ہے لیکن تاریخ باشندگان ہند، اُن کی تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور نیز اُنکی اقتصادی حالت کے متعلق تقریباً خاموشی ہی اختیار کی ہے۔

سلطنت برطانیہ کی ترقی مشہور ولیم پٹ (۱۷۵۶ء-۱۷۶۱ء) کے عہد وزارت میں ہوئی۔
فریڈرک اعظم حلیف انگلستان نے پرشیا (جرمنی) کو زیر کیا اور فرانس کو شکست دی۔
وولف نے ۱۷۵۹ء میں کوبلیک (کناڈا) فتح کیا اور تمام کناڈا فرانسیسیوں سے لے لیا۔
کلایو نے ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فتح حاصل کی اور جنرل آیر کوٹ نے فرانسیسیوں کو ۱۷۶۱ء میں شکست دی۔ اس قلیل عرصہ میں انگلستان یورپ کی ایک طاقتور سلطنت شمار کی جانے

گی۔ اور ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اب ایک تجارتی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ ہندوستان کے سیاسی اُمور میں بھی کسی نہ کسی طرح حصّہ لینے لگی۔ بنگال اور مدراس کے نوابوں اور راجاؤں کا لڑائی میں (جو اکثر انہیں کے ہتھکنڈوں کا نتیجہ ہوتی تھیں) ساتھ دیا اور انجام کار ایک دوسرے کو آپس میں لڑا کر اُن کو سخت نقصان پہونچایا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔

آجکل قحط و گرانی کا غیر مختتم سلسلہ اور افلاس عامہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ سرے سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہندوستان کبھی خوشحال بھی رہا ہے یا نہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ ملک غیر زرعی ہے یا یہاں کے باشندے کاہل الوجود واقع ہوئے ہیں؟

یہ نہایت فخر کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بہت سے احسانات کیے ہیں جو دوسرے ممالک میں دیگر حکومتوں کے ماتحت حاصل نہیں۔

اوّل تو ایک ملک کی بہبودی کے لیے جو چیز سب سے بڑی نعمت ہو سکتی ہے امن و امان ہے۔

دوم۔ نظام حکومت ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہے کہ غیر ممالک کے حملہ کا اندیشہ قریب قریب بالکل ناممکن ہے اور اندرونی فتنہ و فساد کا بہت ہی کم خطرہ ہے۔

سوم۔ اعلیٰ و بہترین قوانین بنائے اور جابجا عدالتیں قائم کیں۔

چہارم۔ ہندوستان کی قدیمی تہذیب کو مغربی تہذیب علوم و فنون جدیدہ سے منور کر دیا۔

پنجم۔ ہر شخص کو اس کا فطری حق یعنی آزادی دی اور اشیائے آسائش اور وسائل آمد و رفت ریل و ڈاکخانہ وغیرہ قائم کیے۔

آجکل ہندوستان کا ہر ایک شخص جاہل سے جاہل بھی جانتا ہے کہ ان تمام احسانات سے وہ کس قدر متمتع ہوا ہے اور دیگر ممالک کے مقابلہ میں وہ کس قدر خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں کیا کسی مصنف نے ایمانداری کے ساتھ اس سبب کے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان اس قدر مفلس کیوں ہے؟ اور ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک پندرہ ملین آبادی جو

انگلستان کی آبادی کا نصف ہی کیوں فنا ہوگئی؟ قحط اس کا سبب بتایا جاتا ہے۔ کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی پیداوار کے تناسب سے بہت بڑھ گئی تھی اور کبھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ کاشتکاروں کی عدم واقفیت اور لاپرواہی اس کا سبب ہیں اور مہاجنوں کی بڑھتی ہوئی شرح سود وغیرہ اس کا باعث ہے۔ لیکن اگر واقعی جواب حاصل کرنا ہو تو مندرجہ ذیل امور میں تلاش کیجئے۔

(۱) ناقابل برداشت ٹیکس مالگزاری۔ اس کے حصول کے مختلف طریقہ اور غیر محل خرچ۔

(۲) تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ کی تباہی اور برطانیہ کی خودغرضی کی پالیسی۔

(۳) نظام حکومت میں عدم اختیارات۔

(۴) انگلستان کے لیے اصول امتناعی قانون تجارت اور ہندوستان کے لیے آزاد تجارت

(۵) قرضہ ہند

(ان میں سے ہر ایک پر ایک طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے لیکن اس وقت یہاں ہندوستان کی تجارت صنعت و حرفت ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ اوائل اور مابعد کی حالت پر نظر ڈالنا مقصود ہے کیونکہ کسی ملک کی ترقی و بہبودی کا دارومدار زیادہ تر اسی پر ہوتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور بنگال ایسٹ انڈیا کمپنی انگلستان کی ایک تجارتی جماعت تھی جو دیگر یورپین اقوام کی تجارتی جماعتوں کی طرح ہندوستان میں آئی تھی۔ یوں تو ہندوستان کی زرخیزی اور کثیر پیداوار نے ہر ایک کو گرویدہ کر لیا تھا لیکن انگلستان کی جماعت کامیاب ہے۔ فرانسیسی اور ڈچ (ہالینڈ کے باشندے) کمپنیاں نیست و نابود ہوگئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے صرف ساٹھ ہزار پونڈ کے سرمایہ سے تجارت شروع کی تھی اور ایک صدی کے اندر ہی اندر نہ صرف بے انتہا منافع اٹھایا بلکہ اپنی حکومت کی بنیاد بھی ڈال دی اور یہاں کی فرمانروا بن گئی۔ بنگال اور جنوبی ہند کے نوابوں اور راجاؤں سے شروع میں تو چند مراعات حاصل کیں اور بعدہٗ جارحانہ پالیسی سے کام لینا شروع کر دیا۔

بنگال کے نواب میر قاسم نے انگریزوں کو اندرون تجارت کی آمد و رفت پر محصول معاف کردیا اور کلکتہ میں ایک فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دیدی اور ان کی درخواست پر اُس کی حفاظت کے لیے انگریزوں کی ایک جماعت کے رکھنے کا بھی حکم دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کو آہستہ آہستہ دست درازی کا خوب اچھا موقع ہاتھ آیا۔ جن جن طریقوں سے عوام اور ملازمین نواب کو پریشان، ذلیل و رسوا کیا اُس کی داستان بہت طویل ہے۔ نواب میر قاسم نے اس کو روکا تو انگریزوں نے میر جعفر سے مل کر اُس کو تخت سے معزول کر دیا۔ اس کے صلہ میں میر جعفر نے ۲۲۳۸۹۷۵ پونڈ عطا فرمایا اور کلائیو نے علاوہ اس کے ایک اعلیٰ جاگیر اور ۳۱۵۰۰ پونڈ حاصل کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ان سے بھی بگڑ گئی اور میر قاسم دوبارہ تخت نشین ہوئے۔
اس مرتبہ کمپنی نے ۲۰۰۲۶۹ پونڈ حاصل کیا لیکن کمپنی نے دست درازی بدستور جاری رکھی۔
میر قاسم نے تنگ آکر کمپنی کے ساتھ پھر سختی شروع کی۔ نتیجہ ظاہر تھا میر قاسم معزول کر دیے گئے اور میر جعفر پھر نواب بن گئے۔ اس دفعہ ۵۰۰۱۶۵ پونڈ کمپنی کو ملا اور بعدہٗ ۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور ۲۳۰۲۵۶ پونڈ اور ملا۔ غرضکہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں بنگال کے نوابوں سے ۵۹۴۰۴۹۸ پونڈ وصول کیا اور ہمیشہ کے لیے بنگال دیوالیہ ہو گیا۔ یہ کمپنی بہت مالدار ہو گئی اور ۱۷۶۵ء میں شاہ دہلی سے دیوانی کا فرمان حاصل کر کے بنگال کی مالک بن گئی۔

اب کمپنی کو پورے اختیارات حاصل تھے اور تجارت کو جائز و ناجائز طریق سے بے انتہا فروغ دیا جس کی وجہ سے مقامی کاریگروں کو بے حد نقصان پہونچا اور ان کے وجوہ سے قحط پڑ گیا۔
۱۷۷۰ء میں بنگالہ کی ایک تہائی آبادی موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ اموات اس کثرت سے ہوئیں کہ لوگوں میں ہمدردی کا مادہ قریب قریب مفقود ہو گیا تھا۔ اور مابعد ہیسٹنگز نے کڑہ اور الہ آباد بھی حاصل کر لیا اور نواب اودہ کو ۵۰۰۰۰۰ پونڈ کے عوض دے دیا (یہ قبضہ عارضی ہی تھا)۔
روہیلوں کے خلاف نواب اودھ کو ایک فوجی دستہ دیکر ۴۰۰۰۰۰ پونڈ وصول کیا۔
جنوبی ہند میں بھی یہی بازار گرم تھا۔ اور ملکی قبضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ

مقامی تجارت کی تباہی کی کوشش بھی شروع ہو جاتی تھی۔ اور انگریزی مال جو ساخت میں بھدا اور کمزور ہوتا تھا بازاروں میں بکنے لگا۔ لوگ مجبوراً خرید کرتے تھے اور زیادہ گراں ملتا تھا۔

کمپنی کی تجارت

اٹھارہویں صدی عیسوی تک ہندوستان نہ صرف ایک اعلیٰ زراعتی ملک تھا بلکہ دنیا کے بہترین تجارتی ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ خاصکر کپڑے کی تجارت کے لیے دنیا میں اس سے بہتر کوئی ملک نہ تھا۔ جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا یہاں کا اونی۔ سوتی۔ ریشمی زربفت غرضکہ ہر قسم کا کپڑا تمام ایشیا۔ یورپ حتی کہ امریکہ کے بازاروں میں بکثرت جاتا تھا۔

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد جو واقعات و تغیرات وغیرہ ظہور پذیر ہوئے اُس کی تیزی رفتار حیرت انگیز ہے۔ انگلستان کو جو اسی عہد میں مختلف قسم کی ایجادیں کر رہا تھا۔ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اُن کے لیے خام اشیاء خاصکر روئی وغیرہ حاصل کی جائے۔ ہندوستان اس کے لیے نہایت موزوں نظر آیا۔ اب کیا تھا انگلستان میں سیکڑوں کارخانے کھل گئے۔ ہندوستان میں کپڑے کی تجارت تو بالکل ختم ہوگئی اور روئی بہت زیادہ پیدا کرنے لگا۔ یہاں سے ایجنٹوں کے ذریعہ روئی بہت سستی خرید کی جاتی تھی اور انگلستان سے سوتی مال تیار ہو کر آنا شروع ہوگیا اور بہت گراں فروخت ہوتا تھا۔

ان وَسٹ مینٹ

ہندوستان کی اقتصادی حالت یونہی کیا کم خراب تھی کہ ایک نئی اسکیم کا نفاذ اور ہوگیا جس کو انوسٹمنٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۸۱۲ء میں دارالعلوم (انگلستان) میں جو رپورٹ پیش ہوئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کی مالگزاری کا ایک حصہ خام اشیاء کے خرید کے لیے علٰحدہ کر لیا جاتا ہے جو انگلستان بھیجدی جاتی تھیں اور حکومت انگلستان اُس کو گراں فروخت کر کے کثیر منافع حاصل کرتی تھی۔ ہزاروں جہاز یہاں کی تمام اشیاء سے بھرے ہوئے انگلستان جاتے تھے۔

ہندوستانی تجارت کی تباہی | کمپنی کے انگریز ملازمین ہندوستان میں اپنے گماشتوں کے ذریعہ
مقامی اشیاء سستی خرید کرتے اور مہنگی فروخت کرتے۔ حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی ان کے
قبضہ میں تھیں۔ جو اشیاء کہ انگریز فروخت کرتے ہندوستانی اُن کو نہیں بیچ سکتے تھے۔ یہ کوئی
سرکاری قانون نہ تھا لیکن بُری طرح انسانیت سوز سزائیں دے کر زیر کر لیا تھا۔ اور کپڑا وغیرہ
تو ولایتی ہی فروخت ہونے لگا تھا۔ ہندوستان کے تاجر جو کچھ بھی اپنا مال باہر ملکوں میں
بھیجتے اُن پر محصول اتنا زیادہ تھا کہ فائدہ تو درکنار مال کی قیمت بھی مشکل سے ملتی تھی اور برخلاف
اس کے ولایتی مال پر بہت کم محصول لیا جاتا تھا۔ تباہ کرنے کی کوئی صورت نہ چھوڑی۔ مقامی
کاریگروں پر محصول لگا دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملازمین کمپنی نے یہاں کارخانہ کھولے اور
کاریگروں کو جو محصول ادا نہیں کر سکتے تھے طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اور اگر یہ نہیں
ہوتا تو کم تنخواہوں پر (جو ضرورت زندگی کے لیے ناکافی ہوتی تھیں) ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔
خام ریشم بہت تیار ہوتا تھا جو انگلستان بھیجدیا جاتا تھا۔ انوسٹ منٹ کا روپیہ ۱۷۹۳ء سے
۱۸۱۳ء تک ۲ ۷ ۶ ۴ ۳ ۱ ۵ ۲ پونڈ ہوا۔ اس زمانہ میں (مزو) نے اپنی شہادت میں پارلیمنٹ
انگلستان کے سامنے بیان کیا کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو گئی ہے ہندوستانی
جس کی ماہواری اوسط آمدنی ۶ شلنگ یعنی تین روپیہ ہے وہ کیونکر انگریزی مال خرید سکتا ہے
۱۸۱۳ء میں چارٹر کی رو سے کمپنی کا اجارہ موقوف کر دیا اور انفرادی تجارت کا عام استحقاق
حاصل ہو گیا۔ ایچ ایچ ولسن مشہور مورخ لکھتا ہے کہ ۱۸۱۳ء کے پارلیمنٹ کے مباحثات میں ہندوستانی
لوگوں کی اقتصادی ترقی کے لیے کوشش کی گئی لیکن تاجران انگلستان نے اس کی بہت
سخت مخالفت کی کیونکہ اس سے ان کو اپنے مفاد کا خطرہ تھا اور وہ کامیاب ہو گئے۔
۱۸۱۳ء کے چارٹر کی رو سے کمپنی کے ہندوستانی تجارتی حقوق بالکل منقطع ہو گئے لیکن
چین اور دیگر جزائر سے ہنوز باقی تھے۔ کمپنی نے مدراس۔ بمبئی اور بنگال سے روئی بہت
زیادہ خرید کی۔ انوسٹ منٹ سے ۸۰۰۰ گٹھے ۲۵۰ پونڈ وزنی خریدے اور ۱۸۲۸ء میں

۸۶ ملین پونڈ وزنی روئی خریدی جس کی قیمت ایک ملین اسٹرلنگ پونڈ (۱۵ ملین روپیہ) ہوئی
انگلستان کو غلہ۔ شکر۔ چاء۔ شورہ۔ لوہا۔ چاندی۔ سونا۔ تانبا وغیرہ بکثرت جاتا تھا۔
وہ اشیاء جو انگلستان کو ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۹ء تک گئیں۔

روئی	۱۶۰	سے	۱۲۷،۰۲۴	تک گٹھے گئے
سوتی کپڑا	۱۴۸۱۷	″	۱۰۴	″ ″ ″ ″
ریشم خام	۲۱۳	″	۷۰،۰۰۰	″ ″ ″ ″
ریشمی کپڑا	۱۵۵۸	″	۴۶۹	″ ″ ″ ″
نیل	۱۲۸۱۱	″	۲۷،۰۰۰	صندوق گئے

نقشہ بالا سے معلوم ہوگا کہ انگلستان کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ کس قدر گئی اور باقی اشیاء کس قدر کم گئیں۔

نیل:- یورپین پلانٹرز جن کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی ہندوستانی کاشتکاروں کو زر پیشگی بطور ٹھیکہ دے کر ایک مقررہ آراضی پر نیل کی کاشت کراتے تھے۔ اگر کاشتکار اس کام سے فراغت پا کر اپنی ذاتی زمین جوتتے تو سخت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ کوڑے لگوائے جاتے تھے زمینیں۔ کھیتیاں وغیرہ ضبط کر لی جاتی تھیں۔ بڑے بڑے جرمانے کیے جاتے تھے۔ جیلخانہ میں لمبی لمبی سزائیں کاٹتے تھے اور اسی حالت میں کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیے جاتے تھے۔ بعض ہندوستانی بھی نیل کی تجارت کرتے تھے مگر وہ مخالفانہ کارروائیوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے۔ ان انگریز پلانٹروں میں سے اکثر بہت ہی کم سرمایہ رکھتے تھے۔ جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی تجارتی ایجنسی ہاؤس سے قرض دیا جاتا تھا۔ بنگال میں جیسور کرشنا گڑھ اور ترہٹ میں ۴۰۰ سے زائد فیکٹریاں قائم تھیں۔ نیل کی کاشت دہلی تک کرائی جاتی تھی۔ ۱۸۰۵ء میں ۹۰۰،۰۰۰ پونڈ وزنی نیل انگلستان گیا۔ جس وقت کلکتہ میں آ کر نیل جمع ہوتا تھا تو ۲،۴۰۳،۰۰۰ پونڈ قیمت کا ہوتا تھا۔ اور انگلستان میں ۴،۶۰۰،۰۰۰ پونڈ کو

فروخت ہوتا تھا۔ نیل کی کاشت اس کثرت سے ہوئی کہ سینٹ ڈامنگو جو انقلاب فرانس سے بیشتر ممالک کو نیل مہیا کرتا تھا اب تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ سب کچھ غریب ہندوستانی مزدوروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی اور محنت شاقہ کا نتیجہ تھا جس کو انگریز صاحبان اپنی حلال روزی سمجھتے تھے۔

۱۸۳۷ء میں جب کمپنی کی حکومت مستحکم ہو گئی تو ایک چارٹر کی رو سے تاج انگلستان کو منتقل ہو گئی۔ ملکہ وکٹوریہ تخت پر جلوہ افروز ہوئیں۔ اور ہندوستانی تاریخ کا نیا باب شروع ہو گیا۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کمپنی کے عہد گزشتہ سے بالکل مختلف ہے۔

محمد عبد الحمید خاں۔ متعلم جامعہ

اقطابِ انگورہ

علامہ فتحی بے وزیر داخلہ انگورہ

۴؍ اگست ۱۹۱۴ء کا دن جبکہ جنگ عظیم کا آغاز ہوا، اپنے اندر بصیرت و عبرت کے بہت سے مظاہر پوشیدہ رکھتا تھا، چنانچہ جس طرح دنیا کے امن و سکون میں جنگ جرمنی نے ایک تعفن ڈالدیا اُسی طرح مارچ ۱۹۱۶ء میں رُوسی قوم کا انقلاب و بالشویزم تحریک نے کائنات عالم کو چونکا دیا، مغرب کی یہ دونوں تحریکیں "قومیت" کے نقطۂ نظر سے اپنی اپنی جگہ نہایت دقیع اور منفعت بخش تھیں، لیکن اسی کے ساتھ ان دونوں تحریکوں نے سوسائٹی کے لیے جو تباہ کن اثرات پیدا کیے اُس کے نتیجہ میں بلجیم کی عبرت انگیز تباہی شمالی فرانس کی اندوہناک بربادی، یوگوسلافیہ کی دلگداز بربریت اور مملکت روسیہ میں خونریز طوائف الملوکی اور قتل عام کے مناظر انسان کو ہمیشہ آبدیدہ کرتے رہیں گے، ظاہر ہے کہ ان دونوں عیسوی تحریکوں نے جس طرح انسانی سوسائٹی کو ہلاکت بار گڑھے میں دھکیل دیا، اُس کے مقابل ۲۰؍ مارچ ۱۹۲۰ء کی وہ ایک کمزور تحریک جو انگورہ سے شروع ہوئی انسانی سوسائٹی کے لیے ایک حیاۃ آفریں پیغام لیکر آئی، مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے جس تحریک کا آغاز کیا، کون جانتا تھا کہ اس تحریک کے ذریعہ ایشیا کی ان گنت آبادی میں عروج و ارتقاء، اور "نظم و جامعیت" کی ایک نئی روح پیدا ہو جائے گی؟ مگر چند سالہ واقعات نے بتلا دیا کہ تحریک انگورہ نے اناطولیہ کے ویرانوں سے لیکر حدود پشاور تک لاتعداد بنی نوع بشر میں حیاۃ کامرانی، عزت و خودداری، اور نظم و وحدت کے وہ ولولے پیدا کر دئیے جن کے ذریعہ سے مشرق کا دھندلا اُفق از سرِ نو جگمگا اٹھا،

سیاست شناس دماغ جانتے ہیں کہ ترکان انگورہ نہ صرف اناطولی میدانوں میں سرگرم عمل تھے بلکہ اُن کی یہ نہایت محتاط تحریک قفقاز و ترکستان اور خیوا و افغانستان میں بڑی

سرعت سے کام کر رہی تھی، ہز اکسلنسی انور پاشا، نوری پاشا، خلیل پاشا اور جمال پاشا
اس بیدار کُن تحریک کے ممتاز ترین لیڈر تھے، جن کی حیرت انگیز جد و جہد اور سیاسی و رزمی
نے آج سارے مشرق کو مغرب کے مقابل لاکھڑا کر دیا ہے، اور اسی طرح ایشیائے کوچک میں
جن ترکی دماغوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اُن کے باعث مغرب کی وہ خطرناک
تحریک ہمیشہ کے لیے ملیامیٹ ہوگئی جو پورے ایشیا کو چٹ کر جانے کے لیے پاؤں پھیلا رہی
تھی، لہذا بربنائے حالات کہا جاسکتا ہے کہ آج مشرق میں حیاۃ و کامرانی کا جو چمکیلا آفتاب
طلوع ہو رہا ہے وہ ترکان انگورہ ہی کے دم قدم کا نتیجہ ہے، اور ایشیائے کوچک میں جو میدان
کارزار گرم ہوا تھا وہ انسانی موت و زندگی کا ایک متضاد مظاہرہ تھا جس کے ذریعہ بعض
اقوام عرصۂ دراز کے لیے فنا ہوگئیں اور بعض نے ایک نئی زندگی حاصل کی، بارے اس کشمکش
کی آخری ساعت ۲۴ رجولائی ۱۹۲۳ء کو "لوزان" میں ختم ہوگئی اور ایک معاہدہ کے ذریعہ
مغرب نے مشرق کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ تسلیم کرلیا اور بہ ہمہ وجوہ تسلیم کرلیا ضرورت
ہے کہ آپ کے سامنے اُن ارباب بست و کشاد اور اصحاب فکر و عمل کے سوانح لائے جائیں
جنھوں نے انگورہ کی بلندیوں سے پورے ایشیا کو نہضت و بیداری اور استقلال و خود داری
کا روح پرور پیام پہونچایا،

کسے خبر تھی کہ ایشیا کا وہ "مرد بیمار" جو یورپ میں اپنی تلخ و ناکام زندگی کے آخری سانس
لے رہا تھا اپنے آغوش میں ایسے نوجوان و ہونہار فرزند بھی رکھتا ہے جو ایک دن اپنی شجاعت
و سیاست سے دانایان فرنگ کے چھکے چھڑا دے گا، لیکن جب "لوزان" میں حکیمان انگورہ
کی ایک بالغ نظر جماعت نے عقلائے فرنگ کو بساط سیاست پر دے پٹکا تو دنیا نے معلوم
کرلیا کہ سیاست و دانش آموزی دانایان فرنگ ہی کی جائداد نہیں بلکہ اُس سے ارباب
انگورہ بھی بدرجہ وافر بہرہ اندوز ہو چکے ہیں اور اُن کا ایک سپاہی جو عمر کے تیئس ۲۳ سال
میدان جنگ و قتال میں گزار چکا ہے وہ سیاسیات کے نکات و غوامض پر بھی حاوی ہے

اور اچھی طرح حاوی ہے،

ترکی میں کئی فتحی بے گزرے ہیں، ایک فتحی بے وہ ہیں جو جنگ بلقان میں ہوائی جہاز سے گر کر شہید ہوئے، دوسرے فتحی بے جنگ طرابلس میں سرگرم عمل رہ چکے ہیں، لیکن ہمارے فتحی بے کا نام نامی احمد فتحی بے آف قازان ہے، آپ کا سلسلۂ خاندان قازان کے ایک ممتاز بادشاہ سے ملتا ہے آپ کی عمر ۴۴ برس کی ہے، آپ "ترکی" فارسی، عربی، فرنچ، اور "انگریزی" زبان میں کامل مہارت رکھتے ہیں، آپ زبردست اور ممتاز ادیب ہیں، علامہ فتحی بے عام ترکی مدبرین کی طرح ترکی اجتماعی زندگی میں ایک سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوئے لیکن خداداد قابلیت کی وجہ سے بہت جلد آپ کیپٹن بنا دیئے گئے، اور کوئی چار سال تک آپ فوج میں معقول خدمات انجام دیتے رہے، اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپ شاہی باڈی گارڈ کے افسر اعلیٰ رہے، پھر انتظاماً آپ ارض روم بھیج دیئے گئے جہاں آپ کو ایک سال تک رہنا پڑا، فتحی بے نے فوجی لائین میں جو خدمات انجام دیں اُن کے ساتھ ہی ساتھ آپ کی انتظامی قابلیت نے آپ کو ترکی وزارت کی نظروں میں زیادہ وقیع بنا دیا یہ وہ زمانہ ہے کہ آپ "انقلابی" خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھے، آپ کے ایک دوست جو ۱۹۱۳ء میں ترکی وزیر مال تھے انھوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ وہ ملازمت ترک کر کے ترکی میں انقلابی جماعتیں مرتب کریں، چنانچہ فتحی بے نے ملازمت سے استعفا دیدیا، مگر سلطان المعظم نے اسے منظور نہ کیا اسی عرصہ میں مملکت فرانس میں ترکی سفارت بدل گئی اور آپ فرانسیسی سفارت میں بحیثیت ملٹری اٹاچی پیرس بھیج دیئے گئے، جہاں آپ کامل دو برس تک ترکی سفارت خانہ میں فرائض انجام دیتے رہے، پیرس کے قیام میں فتحی بے نے علاوہ فرنچ زبان کے فرانسیسی رائے عامہ اور سیاسیات کا فی مطالعہ کیا، اس کے بعد آپ سالونیکا میں کمانڈر مقرر ہوئے، یہ وہ زمانہ ہے جب سلطان المعظم اعلیحضرت حضور مغفور سلطان عبدالحمید خاں سالونیکا میں نظر بند تھے، جب سلطان مرحوم نے نظر بندی سے تنگ آ کر احتجاجاً فتحی بے سے شکایت کی تو ممدوح نے یہ نہایت قیمتی مشورہ دیا کہ آپ زمانہ نظر بندی میں اپنی سوانح اور عہد حکومت کے

حالات لکھیئے، اس کے بعد فتحی بے مملکت بلغاریہ میں ترکی سفیر مختار کی حیثیت سے بدل دیے گئے، اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ترکی وزارت نے فتحی بے کی سیاسی علو مرتبت کو پہچان کر انہیں یہ جلیل القدر سیاسی عہدہ تفویض کیا، جب آپ صوفیہ میں سفارت کے عہدہ پر مامور ہوئے تو موجودہ ترکی کے مجدد مارشل مصطفےٰ کمال پاشا آپ کے ملٹری اتاچی مقرر ہوئے، صوفیہ میں ان دونوں انقلابی خیالات کے آدمیوں کا ایک جگہ جمع ہونا ملک و قوم کے لیے نہایت مفید تھا، اگرچہ مارشل مصطفےٰ کمال پاشا سے فتحی بے کی ملاقات سالونیکا میں ہو چکی تھی لیکن اس قربت نے دونوں کے عزائم میں مزید تقویت پیدا کر دی، اب فتحی بے ممدوح کا اصل عہد سیاست شروع ہوتا ہے یعنی آپ "انجمن اتحاد و ترقی" کے سکرٹری منتخب ہوئے ظاہر ہے کہ انجمن اتحاد و ترقی کی نظامت ایک بادشاہ کی حیثیت رکھتی تھی، جہاں تمام امور جہاں بانی اور داخلی اصلاحات کے فرائض انجام دینے پڑتے تھے چنانچہ فتحی بے نے اس عہدہ کا چارج لیتے ہی اس قدر محنت و قابلیت سے کام لیا کہ دوسرے ترکی مدبرین آپ کی سیاست دانی پر ششدر رہ گئے، آپ کی محنت و سرگرمی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ ایک مرتبہ آپ نے رومانوی سفیر سے خفیہ ملاقات کی جس کا سلسلہ کامل پانچ گھنٹہ رہا، اس کے بعد آپ ترکی صدر اعظم سے ملنے گئے جہاں آپ کو شام ہو گئی، پھر آپ سیدھے دفتر تشریف لے آئے جہاں آپ رات بھر کام میں مصروف رہے اور اس تمام عرصہ میں آپ نے صرف دو مرتبہ چا پی، جب بلغاری فوجوں نے ایڈریانوپل پر چڑھائی کی تو فتحی بے چالیس ہزار جرار لشکر کے ساتھ گیلی پولی میں مصروف کارزار ہو گئے گویا یہ دوسرا موقع تھا جب آپ ملک و ملت کی مدافعت کے لیے سیاسیات سے نکل کر فوجی لائن میں کام کرنے لگے، گیلی پولی میں تنہا فتحی بے ایسا عظیم الشان کمانڈر تھا جس نے بلغاری فوجوں کو ایڈریانوپل پر حملہ کا موقع ہاتھ نہ آنے دیا غرض یہ اور اسی قسم کی متعدد جنگی و سیاسی خدمات تھیں جن کے ذریعہ ترکی میں ممدوح کی گوناگوں قابلیتوں کا شہرہ ہو گیا، اور آپ ترکی کے مسلمہ لیڈر مان لیے گئے، جب جنگ فرنگ کا آغاز ہوا اس وقت آپ عارضی طور پر بصرہ کے لفٹنٹ گورنر تھے، لہذا جب برطانی فوجوں نے مقام "قرنہ" پر حملہ کیا تو آپ نے ان کی پرزور مدافعت کی

لیکن کافی سامان رسد اور کمک کے نہ ملنے پر آپ کی فوجوں کو ہتیار ڈال دینا پڑا، اور آپ شام میں مارشل جمال پاشا کے پاس چلے آئے، آپ کے اس معرکہ کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے جو اطلاع شائع ہوئی تھی وہ یہ ہے، دہلی ۹ دسمبر ۱۹۱۴ء سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ فتحی بے گورنر بصرہ نے شمالی بصرہ کے مقام "قرنہ" میں کمانڈ کرتے ہوئے ہتیار ڈال دئیے"، اُس وقت آپ شام و کردستان میں علی احسان پاشا کے ساتھ فوجیں بھرتی کرتے رہے یہاں تک کہ جب مارشل عزت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے تو فتحی بے ترکی کے وزیر داخلہ بنائے گئے جو آپکی سرکاری خدمات کا آخری عہدہ تھا،

۱۹۱۴ء کا وہ خونریز سال شروع ہوا جس میں ترکی قوم کی تباہی و بربادی اور ہلاکت و خسران کے نہایت ہی صبر آزما زمانہ تھا، جب اکتوبر ۱۹۱۸ء میں مشہور معاہدہ میوڈرس مرتب ہوا اُسی وقت فتحی بے ایوان حکومت کے رکن رکین تھے لیکن حقیقت میں یہ ایوان حکومت فتحی بے ایسے سچے خیرخواہ ملک و وطن کے لیے ایک قید خانہ سے زیادہ تکلیف دہ تھا کیونکہ ایک طرف تو قومی سیاسیات کا تقاضہ تھا کہ ملک و ملت کی رہنمائی اور خدمت سے خود کو کسی طرح علیحدہ نہ کیا جائے لیکن سیاسی ماحول خصوصاً اتحادیوں کی مداخلت روز بروز آپ کو دل برداشتہ کرتی جاتی تھی، یہ حالات آخر ۱۹۱۸ء کے ہیں جبکہ آپ مارشل احمد عزت پاشا اور مارشل رضا پاشا کے ساتھ کام کرتے تھے لیکن آپ بڑی جرأت سے اُس پالیسی کے مخالف تھے جو اتحادیوں کے مفید مطلب بعض ملت فروش ترکی وزرا اختیار کر رہے تھے، یہاں تک کہ فتحی بے نہایت جرأت و دیانت سے ملک و قوم کی خدمت میں مصروف رہے، ادھر انگورہ تحریک کا آغاز ہو چکا تھا جب ترکی دار المبعوثین میں احرار انگورہ کے خلاف تجاویز سوچی گئیں تو آپ نے نہایت دلیری سے ان کی مخالفت کی، بس یہی وجہ تھی کہ اتحادیوں نے آپ کی حریت پسندی اور وطن پرستی کا اندازہ کرتے ہوئے اوائل ۱۹۲۰ء میں آپ کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ آپ کی نظر بندی محض ترکان احرار

کی حمایت میں تھی اور اسی طرح آپ کے تمام وہ رفقاء بھی گرفتار کرلیے گئے تھے جو آپ کے خیالات کے مویدتھے، ان معزز رفقاء میں سعید حلیم پاشا صدر اعظم، کوچک جمال پاشا، حسین رؤف پاشا، کرنل قرہ وصاف پاشا، ڈاکٹر عمر لیسیم پاشا، ڈاکٹر جلال نوری بے ایڈیٹر "جون ترک"، شاہزادہ ابراہیم آفندی، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں فتحی بے اور آپ کے رفقاء کی یہ وہ مقتدر جماعت تھی جو ڈیڑھ دو سال مالٹا میں نظر بند رہی چونکہ اس جماعت میں ہر شخص علم و فضل میں ممتاز مرتبہ رکھتا تھا بالخصوص علامہ فتحی بے ایسا فاضل روزگار ادیب مالٹا میں بیکار نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ ممدوح نے بعض نادر الوجود انگریزی کتابوں کا ترجمہ شروع کر دیا، علامہ فتحی بے کی یہ خدمت ایسی تھی جس پر تمام یورپی اخبارات نے علامہ ممدوح کی علمی مرتبہ پر مقالات لکھے تھے، علامہ فتحی بے نے ان انگریزی کتابوں کو ترکی زبان میں ترجمہ کرکے ثابت کر دیا کہ وہ ایام تعطیل میں بھی اپنی قوم کی خدمت سے غافل نہیں۔

اگست ۱۹۲۱ء میں معرکہ سکاریہ کے بعد ترکان انگورہ کی جنگی و سیاسی پوزیشن نہایت مستحکم ہو چکی تھی، اتحادیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے خود اندرون قسطنطنیہ ترکان احرار کے موئدین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا کہ اسی دوران میں علامہ فتحی بے مالٹا سے رہا ہو کر انگورہ پہونچ گئے، علامہ ممدوح کی سیاسی قابلیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب آپ مالٹا سے رہا ہو کر انگورہ جانے والے تھے اسی وقت سے انگورہ پارلیمنٹ نے علامہ ممدوح کے لیئے وزارت داخلہ کی کرسی خالی کرکے آپ کو وزیر داخلہ نامزد کر دیا تھا، جس وقت یہ حضرات انگورہ پہونچے تو تمام اعیان حکومت نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا، خود رئیس جمہوریت مارشل مصطفیٰ کمال پاشا مع اپنے جنگی اسٹاف کے اسٹیشن پر موجود تھے، علامہ فتحی بے اگرچہ دو سال کی نظر بندی اور قید کی تکالیف سے چور ہو رہے تھے مگر حب الوطنی کا جوش اس قدر غالب تھا کہ آپ نے انگورہ پہونچتے ہی وزارت داخلہ ایسی اہم ذمہ داری کو قبول فرمالیا، اور نہایت قابلیت سے فرائض انجام دینے لگے ادھر حضرت حسین رؤف پاشا صدر اعظم انگورہ مقرر ہوئے، ان حضرات کے تقرر سے یورپ کے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اور اخبارات

نے صاف صاف لکھدیا تھا کہ اب انگورہ گورنمنٹ کا ترقی کن دور شروع ہو گیا ہے علامہ فتحی بے اُس وقت سے لیکر اِس وقت تک برابر وزیر داخلہ کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

فروری ۱۹۲۲ء میں جب حضرة بکر سمیع کا مصالحانہ وفد انگلستان میں ناکام رہا، تو انگورہ گورنمنٹ نے اتمام حجت کے لیے وسط ۱۹۲۲ء میں پھر ایک سیاسی مشن یورپ روانہ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ اتحادیوں کو جنگ ترکی و یونان کے التوا اور مصالحت کے لیے آمادہ کیا جائے، لہذا اس اہم سیاسی مقصد کے لیئے انگورہ گورنمنٹ نے علامہ فتحی بے ہی کو منتخب کیا جن کی انگریزی دانی اور فرنچ آگاہی ترکوں میں مشہور تھی، علامہ فتحی بے اس سیاسی مشن کو لیکر جب انگلستان پہونچے تو انگلستان میں لارڈ کرزن ایسے عالی دماغ اور سیاست آگاہ شخص نے فتحی بے سے ملنے کی درخواست نامنظور کر دی کیونکہ مآل اندیش لارڈ کرزن سمجھتے تھے کہ ترکان انگورہ بالآخر یوناں سے شکست کھائیں گے، جب لارڈ کرزن نے فتحی بے سے ملنا نامنظور کیا تو یہ سیاست آگاہ اور ترکی کا عظیم الشان جنگی و سیاسی ماہر انگلستان سے مسکراتا ہوا چلدیا اور پیرس پہونچکر اُس نے انگورہ کے چیف آف دی اسٹاف کو تار دیدیا کہ بڑھو اور بزدل یونانی افواج پر ٹوٹ پڑو۔

حضرۃ فتحی بے کی انگلستان میں موجودگی کو عام طور پر سمجھا گیا تھا کہ انگورہ گورنمنٹ نے آپ کو انگلستان و فرانس اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ان دونوں عیسوی حکومتوں کی منت سماجت کرکے کسی طرح یونانیوں سے پیچھا چھڑالیں لیکن اصلیت اس کے بالکل خلاف تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ ترکان انگورہ کو اتحادیوں سے نہ کبھی پہلے کوئی توقع تھی نہ اس وقت اُنھیں صلح و امداد کی توقع پیدا ہوئی تھی البتہ یہ انگورہ گورنمنٹ کی بے مثل سیاسی چال تھی کہ اُس نے فتحی بے ایسے جنگی و سیاسی لیڈر کو دول اتحاد کے دارالحکومتوں میں بھیجا تا کہ وہ وہاں یونانیوں کے حق میں دول اتحاد کی رائے عامہ کا اندازہ کریں اور معلوم کریں کہ اگر ترکی لشکر یونانیوں پر حملہ آور ہوں تو دول اتحاد کی رعایا اُس وقت کیا طرز عمل اختیار کریگی؟ یہ تھا وہ اہم سیاسی مقصد جس کے حصول کے لیئے فتحی بے یورپ تشریف لائے تھے اور گو لارڈ کرزن کے نہ ملنے پر انگریزی حلقوں میں خوشیاں منائی گئیں مگر فتحی بے

نے اس چند روزہ خموش قیام میں یہاں کی حالت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ہی انگورہ گورنمنٹ کا وہ عظیم الشان اور تاریخی حملہ شروع ہو گیا جس نے یونانیوں کا استیصال کامل کر دیا۔

جب ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو یہ حملہ فتح سمرنا کی کامیابی پر ختم ہو گیا تو انگورہ کی وزارت داخلہ کے لیے نظم و انصرام اور داخلی بندوبست کا ایک عظیم الشان سلسلہ شروع ہو گیا، دہانہ سکاریہ سے لیکر اسکی شہر افیون قرہ حصار، اور اسمہ، وسمرنا تک تمام برباد شدہ علاقہ اور غیر منتظم اور پراگندہ رعایا کا حفظ و اجتماع، تجارتی کاروبار کی اصلاح، برباد شدہ آراضی کو قابل کاشت بنانا آبپاشی، سلسلہ رسل و رسائل، شہروں میں سیاسی و انتظامی محاکم کا انعقاد سرکاری اور غیر مصافی عمارتوں کی تعمیر مدارس و مکاتب کا افتتاح، ریلوے لائن کی تعمیر و درستی ٹیکس و محاصل کا انصرام وغیرہ یہ تمام اہم داخلی معاملات وزارت داخلہ ہی سے متعلق تھے لہذا فتح سمرنا کے بعد ہی علامہ فتحی بے بحیثیت وزیر داخلہ ان مہمات مسائل کی اصلاح کے لیے سرگرمی اور پوری محنت کے ساتھ مصروف عمل ہو گئے حکومت انگورہ کی اس سرکاری رپورٹ میں جو نومبر ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں پڑھی گئی ان خدمات کے مفصل اعداد و شمار بتلائے گئے ہیں اور یہی وہ اعداد ہیں جو فتحی بے کے متجر دماغ اور عملی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں، اس رپورٹ میں وزارت داخلہ انگورہ کی خدمات کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

"وزارت داخلہ نے امن و انتظام کو قائم کرنے کے بعد اپنے افسر مقرر کیے جو قوانین کی تنفیذ اور اجراء کریں، چونکہ محکمہ تفتیش دو سال قبل توڑ دیا گیا تھا اس لیے بعض لوگوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی اس بناء پر پھر محکمہ تفتیش (خفیہ) قائم ہو گیا، جس نے نہایت جانفشانی سے اپنے کاموں کو انجام دیا، اس محکمہ نے (۹۴) افسروں کے متعلق رپورٹ کی جس میں سے تحقیق کے بعد (۳۰) کلکٹر اور (۵) ڈپٹی کلکٹر برخاست کیے گئے، محکمہ تفتیش نے (۲۶۲) حلقوں کی تحقیق کی اور ہلال احمر کی جماعتوں میں سے (۱۵) جماعتوں میں کام کیا، وزارت داخلہ نے واپس شدہ علاقوں میں جو عدالتیں قائم کیں ان میں (۱۴) کورٹس آف اپیل عدالت ہائے خفیفہ محاکم شرعیہ (۹۰) جنمیں (۵۶۰) قاضی اور (۲۲) جج مقرر ہو چکے ہیں"

(توحید، ۱۶- اپریل ۱۹۲۳ء)

یہ ہیں وہ مختصر خدمات علامہ فتحی بے کی جو مجھے میسر آئیں، ورنہ اصلیت میں فتحی بے ممدوح کی خدمات اس سے کہیں زیادہ کثیر اور اہم ہیں، جب کوئی ترکی قلم "تاریخ انگورہ" لکھے گا تو محترم فتحی بے کی خدمات اور سرگرمیوں سے اس کے صفحات جگمگا اٹھیں گے، اور دنیا کو معلوم ہوگا کہ ممدوح جہاں ایک ماہر جنگی لیڈر تھے وہاں ایک نازک دماغ سیاسی مدبر بھی تھے کاش ہمارے نوجوانوں میں بھی خصوصاً طلبہ میں اس قدر وسیع ہمہ دانی کا ولولہ پیدا ہو اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کو منتہائے کمال سمجھنے کی حوصلہ شکن عادت اُن سے دور ہو۔

حُلیہ اور خصائل علامہ فتحی بے نہایت خلیق اور نرم مزاج آدمی ہیں، بہت کم بولتے ہیں مگر دوستوں کی جماعت میں وہ زیادہ خوش طبع آدمی واقع ہوئے ہیں، فیلڈ مارشل فوزی پاشا کمانڈر انچیف انگورہ آپ کے خاص دوست ہیں، سیر و تفریح کا بہت کم شوق ہے البتہ اخبارات کا مطالعہ آپ کے لیے نہایت دلچسپی کا سامان ہے قد درمیانہ بھرا ہوا جسم، ہلکی نیلی آنکھیں، یورپی فیشن کی نصف مونچھیں ڈاڑھی صاف باوجود یورپ میں عرصہ تک قیام رکھنے کے آپ نے کبھی یورپی ٹوپی استعمال نہ کی،

"توحیدی"

رفتار تعلیم

رایل ایشیاٹک سوسائٹی کا زمانۂ حیات ایک سو برس ہو چکا گزشتہ ماہ جولائی میں اس کی صدسالہ سالگرہ بڑی دھوم سے منائی گئی جس میں سلطنت برطانیہ میں تقریباً تمام علمی انجمنوں کے مندوبین شریک ہوئے۔ شہزادہ ویلز نے اس کا افتتاح کیا۔

سوسائٹی مذکور کی طرف سے جو سہ ماہی رسالہ نکلتا ہے اس کے گزشتہ صدی مجلدات کے مضامین اور اہم شذرات کی فہرست سے جو بہ لحاظ مصنفین اور بہ لحاظ ممالک مرتب کی گئی تھی، ہر مندوب کو تقسیم کی گئی۔ ہندوستان سے متعلق مقالات وشذرات ضخامت میں تمام دیگر ممالک سے متعلق مضامین کے برابر ہیں، غرض اس ایک صدی میں سوسائٹی مذکور نے ایشیا اور بالخصوص ہندوستان کے علوم وفنون کی تحقیق وتفتیش اور نشرواشاعت کے سلسلہ میں جو گرانبہا خدمات انجام دی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر کوئی شخص جو ذرا بھی علوم شرقیہ سے مس رکھتا ہے، لارڈ مکالے کے ان جذبات کے اظہار کی جو اس نے ۱۸۳۵ء کی "تعلیمی یادداشت" میں کیے ہیں، جرأت نہیں کریگا۔ سوسائٹی نے نہ صرف علوم شرقیہ کی نشرواشاعت سے عام اشخاص کی معلومات میں اضافہ کیا ہے بلکہ اس نے نوجوانوں میں بھی علوم قدیمہ کی تحقیق کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیس سال سے اس نے تاریخی مضامین پر تمغے اور کتابیں بہ طور انعام دے کر ہمت افزائی کرتی رہی ہے۔ ہر طرف مزید ایشیائی انجمنیں کھل رہی ہیں، یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ سوسائٹی مذکور کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لارڈ چالمرس کی صدارت میں سوسائٹی کی دوسری صدی شروع ہو رہی ہے۔ جس کی آئندہ ترقی کا دارومدار علمائے فن کی کوشش وعمل پر ہے۔ اخیر میں ہماری بھی یہ خواہش ہے کہ اراکین و کارکنان ایشیاٹک سوسائٹی میں "ایشیائی" اشخاص کی تعداد میں اضافہ ہو۔

انجمن قومی تعلیم، امریکہ نے تمام عالم کی مجالس تعلیمی کا ایک جلاس بمقام سین فرانسسکو منعقد کیا ہے

جس کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ تمام اقوام میں باہمی اتحاد و اتفاق قائم ہو، برکات تعلیم عام ہوں اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جو شاہراہِ امن کی طرف لیجاتی ہوں۔ چنانچہ مضامین زیر بحث یہ ہوں گے۔ بین الاقوامی اتحاد عمل، معلومات تعلیمی کی اشاعت، تخیلات بین الاقوامی، تعلیم صحت جسمانی وغیرہ وغیرہ

دنیا اپنے درد کا علاج مختلف طریقوں سے ڈھونڈھ رہی ہے۔ دیکھئے کوئی نسخہ اکسیر کب ہاتھ آتا ہے جس سے امن و چین نصیب ہو۔

واقعات عالم اور رفتار زمانہ کا گہرا مطالعہ کرنے والے حضرات اس امر سے بے خبر نہ ہوں گے کہ تہذیب و تعلیم ایشیا و یورپ سے کھسکتی ہوئی امریکہ کی طرف جا رہی ہے۔ چنانچہ حال میں خواتین امریکہ نے ۲۰ لاکھ ڈالر (۶۰ لاکھ روپئے) اس غرض سے فراہم کیے ہیں کہ ان سے عورتوں کو علوم شرقیہ کی تعلیم کے لیے کالج قائم کیے جائیں۔ اس وقت، تعلیم گاہوں کے کھولنے کا قصد کیا جا رہا ہے جن میں سے ۳ ہندوستان میں ہونگی۔

مصر کے جدید نظام دستوری کی رو سے ذکور و اناث ہر دو اصناف کے لیے ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے اور اس کے لیے مصر کے چہل سالہ (۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۲ء تک) تعلیمی ترقی کی ایک یادداشت شائع کی گئی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۸۸۵ء میں حکومت مصر اور محکمہ اوقاف کے ماتحت مدارس کی مجموعی تعداد ۱۰۵ تھی جن میں ۱۰۳۸۳ طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ آج ۴۵۷ سرکاری اسکول ہیں اور ۳۱۹۱ صوبہ کی کونسل کے ماتحت ہیں، ان ہر دو اقسام کے مدارس میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۳۲۱۸۲۱ ہے۔

روپیہ کی کمی کے سبب سے پہلے تعلیم کا کوئی معقول بندوبست نہ تھا، ابتدا میں وظائف طعام و قیام کے اخراجات نیز آئندہ ملازمت کی امیدیں دے دلا کر طلبہ فراہم کیے جاتے تھے۔ اور گورنمنٹ کو چونکہ اشخاص کی ضرورت تھی اس لیے اس نے دل کھول کر ایسا کیا۔

تعلیم نسواں کے معاملہ میں یہ ترقی ذرا دھیمی تھی۔ سب سے پہلا اسکول لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم

کے لیے سنہ ۱۸۸۰ء میں کھولا گیا لیکن سنہ ۱۸۸۲ء تک اس میں کچھ ترقی نہ ہوئی۔ صرف ایک اسکول تھا جس میں ۹۹ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں اور پھر بھی ان کی تعلیم کے لیے عورتیں نہ تھیں سنہ ۱۹۱۰ء میں ۵ لڑکیوں نے پرائمری سرٹیفکیٹ امتحان پاس کیا جس سے وزارت کو امید ہوئی اور عورتوں کے لیے ایک ٹریننگ کالج کھولا گیا۔ آج قریباً ۲۴ گرلز اسکول ہیں جن میں ۵۸۹۴۹ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم میں معقول ترقی ہوئی ہے۔ طلبہ اسکول سنہ ۱۹۲۶ء میں جانوروں کے علاج والوں کی تربیت، قانون کی تعلیم کے لیے مدارس کھلے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی تعلیمگاہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے قائم ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبہ انگلستان بھیجے گئے۔ اس کے بعد سے فرانس، سویزرلینڈ بھی بھیجے جانے لگے، صنعت و حرفت اور تجارت کی تعلیم کا بھی انتظام ہے ایک اسٹیٹ یونیورسٹی کھولنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔

بصرہ کے اراکین وزارت آئندہ سال متعدد مدارس کھولنے پر غور کر رہی ہے جن میں ایک لڑکیوں کا اسکول بھی ہوگا جس کے اساتذہ مصر سے بلا لیے جائیں گے۔

بالخصوص قومی تعلیم کے حلقہ میں یہ خبر بہت ہی رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ آکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں سے ہر ایک نے ۶ ہزار پونڈ سالانہ حکومت انگلستان سے لینا منظور کر لیا ہے۔

سر رابرٹ بیڈن پاول تحریک اسکاوٹ کے مشہور بانی ہیں، انھوں نے امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں اپنی تحریک کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس تحریک کا منشا تندرست ہشاش بشاش اور کارآمد شہری پیدا کرنا ہے۔ اس کا طریقہ عمل صرف چند کھیلوں پر مبنی ہے۔ اپنی زندگی کے قلیل عرصہ میں (پندرہ سال جن میں پانچ سال گزشتہ جنگ کے بھی شامل ہیں) اس تحریک نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ اس کے ممبروں کی تعداد ۲۰ لاکھ ہو گئی

اور لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ طلباء کے سرپرستوں اور ماہر تعلیم نے بھی اسے پسند کیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اس کی شاخیں تمام متمدن ممالک میں قائم ہو گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے تحریک کی صورت "بین الاقوامی اخوت" کی سی ہو گئی ہے۔ بانی تحریک نے یہ دیکھ کر کہ تعلیم خواہ علمی حیثیت سے کتنی ہی ترقی کر جائے لیکن معاشرتی ضروریات کے لیے پھر بھی ناکافی رہ جاتی ہے اور آئندہ کی مزید ضروریات کے لیے اور بھی نیز ارتکاب جرم، بد اخلاقیاں، افلاس، خرابی صحت، باہمی و قومی مناقشات غرض ہر طرح کی برائیاں موجودہ سوسائٹی میں پائی جاتی ہیں اور جو خود انسانوں کی پیدا کردہ ہیں اور جن کا بہترین علاج وہی خود کر سکتے ہیں، اس لیے بہترین طریقہ علاج اخلاق انسانی کی اصلاح ہے جو تحریک اسکاؤٹ کا مقصد عظیم ہے۔

تحریک کے اغراض اور وجوہ آغاز سے اُس کے مفید ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس "پردہ زنگاری" میں کوئی "معشوق" پنہاں نہ ہو۔

"معلم"

مطبوعات جدیدہ

فتح المعالی ترجمہ صحف الغزالی۔ مترجمہ حضرت حافظ فیض احمد صاحب مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ قیمت عہ
یہ رسالہ جیسا کہ دیباچہ میں ظاہر کیا گیا ہی امام غزالی کی وفات کے بعد اُن کے بھائی نے فضائل الانام کے نام سے مرتب کیا تھا جو درحقیقت امام صاحب کے مکتوبات کا مجموعہ ہی جس کا ایک قلمی نسخہ سر سید احمد خاں کے پاس تھا اور انہیں نے پہلی مرتبہ اُس کو طبع کرایا۔ اس رسالہ کا ترجمہ اب حاجی محمد محی الدین صاحب تاجر کتب بنگلور کی فرمائش سے ہوا ہی۔ ترجمہ برجستہ و بامحاورہ ہی لیکن جناب مترجم نے اکثر مقامات پر اپنے نوٹ اور اپنی رائے اس بے ترتیبی سے شامل کی ہی کہ بہ یک نظر یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہی کہ یہ اصل مضمون کتاب ہی یا حاشیہ مترجم۔

رسالہ ہذا میں سلاطین، وامرا، و وزرا کے نام بھی خطوط ہیں اور علما، عصر و فقہائے عہد کے نام بھی مختلف مسائل پر مکتوبات موجود ہیں۔ آخر میں بعض نصائح شامل کیے گئے ہیں۔

امام غزالیؒ کی تصنیف کا ترجمہ شائع کر دینا بجائے خود ایک خدمت ہی جس کے لیے ہم جس قدر ممنون ہوں بجا ہے۔

کتاب معمولی کاغذ پر صاف چھپی ہی اور حاجی محی الدین سوداگر کتب لشکر بنگلور سے ملتی ہی۔

مثنوی بحر المحبت۔ مصنفہ شیخ مصحفی، مرتبہ مولوی عبد الماجد، بی۔ اے مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈہ۔ قیمت ۱۲ر

میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق کا اگرچہ اس زمانہ میں کچھ زیادہ چرچا نہیں ہی لیکن ایک وقت گزرا ہی کہ شائقین ادب کے لیے وہ سرمایۂ ناز تھی اور اب بھی پچھلی صحبتوں کے دیکھنے والے دریائے عشق کا اس شوق سے نام لیتے ہیں گویا ادب اُردو کا ایک انمول موتی ہی۔ غالباً اسی شہرت و ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر میر کے ہمعصروں کو اسی زمین میں بادیہ پیمائی کی فکر ہوئی، اور بھی مثنویاں ہوئی ہوں گی لیکن شیخ مصحفی کی بحر المحبت نے خصوصیت سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف

کھینچی۔ کچھ تو شاعری کی شخصیت، پھر بحر المحبت کی ٹکر، اور سب سے بڑا تحفہ کہ آخری مثنوی نے پہلی کا تتبع اس شدت سے کیا تھا کہ جزئیات، خیالات اور طرزِ بیان تک کی تقلید میں دریغ نہیں کیا، خواہ مخواہ پڑھنے والوں کو مقابلہ کرنا پڑتا اور اس طرح بحر المحبت کا چرچا بھی زبان زدِ خلائق ہو گیا۔ لیکن بہت کم ایسے لوگ تھے جنھوں نے بحر المحبت کو خود دیکھا ہو یہ جناب عبدالماجد صاحب کا احسان ہے کہ اس نادر الوجود ادبی یادگار کو اُنھوں نے نہایت خوبی سے حال میں طبع کرایا ہے اوّل ایک مختصر دیباچہ، پھر مقدمہ اور اس کے بعد ایک مفصل تبصرہ ہے جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بحر المحبت شاید دریائے عشق سے بھی بہتر ہے شاید کا لفظ اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ خود جناب عبدالماجد صاحب کو بھی اپنی رائے پر پورا وثوق نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ دونوں مثنویوں کا بالتفصیل مقابلہ کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں قلمبند فرمایا ہے:۔

"تصریحات بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ میر و مصحفی دونوں نے ایک ہی بحر میں شناوری کی ہے۔ میر کی افضلیت و اولیت تمام اردو شاعروں کے مقابلہ میں مسلم ہے، لیکن اس مخصوص میدان میں جیسا کہ اوپر کئی بار اشارہ کیا جا چکا ہے مصحفی کا پلہ جھکتا ہوا نظر آتا ہے، اس کا سبب خواہ یہ ہو کہ اُن کے سامنے ایک نمونہ پیشتر سے موجود تھا اور نقش ثانی ہمیشہ نقش اوّل کے مقابلہ میں آسان تر و بہتر ہوتا ہے، خواہ کچھ اور ہو واقعہ بہرصورت یہ ہے کہ مصحفی کی مصوری مقتضائے حال سے قریب تر اور جذبات بشری کے زیادہ مطابق ثابت ہوئی۔
باایں ہمہ میر پھر میر ہیں۔ اُن کے قلم سے متعدد اشعار اس قدر دلنشیں اور ڈھلے ہوئے نکلے ہیں، اور جن میں اس مخصوص افسانہ سے قطع نظر کر کے عام واردات قلب اس خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ بے اختیار زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔"

واقعات اور بڑی حد تک طرزِ بیان چونکہ ایک ہے اس لیے مقابلہ کا بہت موقعہ ہے جس سے جناب مرتب نے کافی فائدہ اُٹھایا ہے لیکن بہت کم ایسے مواقع ہیں جہاں مصحفی کی برتری ثابت ہو گئی ہو۔ اور ایسے مقامات بھی بہ کثرت نظر آتے ہیں جہاں مصحفی کا بیجا طول یا بے لطفِ بیان بغیر نقل کیے

چھوڑ دیا گیا ہے۔ حسین بیتی۔ درویش پریس۔ دہلی قیمت ۸ر

حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کی یہ تازہ تصنیف ہے جو واقعات کربلا و حادثۂ شہادت کے بیان میں اُنھوں نے حال ہی میں مثنوی کی بحر میں مرتب فرمائی ہے اور جس کو ملا محمد الواحدی صاحب نے شائع فرمایا ہے۔ چار جزو کی مثنوی چھوٹی نہیں ہوتی اور جناب فراق نے ان صفحات میں کربلا کے واقعات پر ہر شاعرانہ حیثیت سے خوب گلفشانی کی ہے۔ زبان صاف اور بیان موثر ہے۔ خواہ مرثیہ کے طرز سے بہتر ان واقعات کے لیے کوئی دوسرا انداز بیاں نہ ملے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کربلا کے چند واقعات کو جس طرح وسعت دی گئی ہے اور جس طرح نئے اسلوب اور نئے انداز سے اس کی اشاعت اور اس کے مظاہرے ہوتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا اگر مثنوی کے عام فہم سلیس اور بامزہ بحر کو اس داستان کے لیے انتخاب نہ کیا جاتا۔

مجموعہ کلام جوہر (طبع ثانی) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ قیمت ۶ر

مولانا محمد علی مدظلہ کا مجموعہ کلام جس میں زیادہ تر غزلیں ہیں پہلی مرتبہ مکتبہ جامعہ ملیہ نے ماہ دسمبر میں شائع کیا تھا جو اپنی خوبی و دلکشی و نیز کلام کی مقبولیت و عام عقیدتمندی کے باعث ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ کارپردازان مکتبہ نے اب دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے ایک گرانبہا اضافہ عبدالماجد صاحب بی۔ اے کے قابل قدر مقدمہ کی صورت میں ہوا ہے۔ عبدالماجد صاحب نے علاوہ مولانا کے کلام کے ریویو کرنے کے اُن عظیم الشان انقلابات کا بھی ذکر کیا ہے جو مولانا کی سیاسی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ مذہبی و سیاسی مباحث کے بعض نکات پر اس طرح خامہ فرسائی کی ہے کہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

مولانا کے کلام کے متعلق اُن کا ایک جملہ ملاحظہ ہو۔

"محمد علی کا اصلی موضوع حسن کی رعنائی، جمال کی زیبائی نہیں، بلکہ وہ دل کی چوٹ، عشق کی تڑپ، جذبات کے سوز کو سامنے لاکر کہہ دیتا ہے، اور یہی اُس کے کلام کی تاثیر کا راز ہے آقا لاکھ کریم و فیاض ہو، اُس کے بیان میں وہ درد و اثر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جو غلام کی جانب سے

محتاجی و درماندگی کے عرض حال میں ہوگا۔"

اوّل ابتدائی کلام ہے جس میں بعض غزلیں زمانۂ طالب علمی علیگڈھ کالج (۱۸۹۸ء) کی شامل ہیں۔ اس کے بعد وہ مجموعہ ہے جو اس سے قبل بھی شائع ہو چکا ہے۔

آخر میں کلام جدید کے عنوان سے وہ تمام غزلیں ہیں جو حال میں بیجاپور جیل میں تصنیف ہوئی ہیں اور ایک زندانی کی واردات قلب ہیں۔ وہ زندانی جو ہندوستان کی آب و ہوا میں اپنی آزادیٔ روح کے لیے قید و بند کی پابندیوں کو نام نہاد آزادی سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ مجموعہ جیبی تقطیع پر نہایت خوشنما چھپا ہے۔ سرورق رنگین نہایت دیدہ زیب ہے۔ شروع میں مولانا محمد علی صاحب کا وہ تمثلی فوٹو ہے جو مقدمہ کراچی کے دوران میں لی گئی تھی اور اس اعتبار سے گویا اُن کی تازہ ترین تصویر ہے۔ حجم ۵۰ صفحہ سے زاید ہے۔ قیمت ۶ر

۔۔۔ درویش، پندرہ روزہ رسالہ۔ اڈیٹر ملا محمد الواحدی، دہلی چندہ سالانہ دو روپیہ ۲ عہ۔

رسالہ خطیب کی قدیم تقطیع پر "درویش" نئی آب و تاب سے حال میں شائع ہوا ہے دو نمبر اس وقت تک نکل چکے ہیں جو ترتیب مضامین، خوبی کتابت و طباعت کے لحاظ سے بلا شبہ قابل داد ہیں۔ رسالہ کی حیثیت مذہبی و تمدنی ریفارمر کی ہے لیکن سیاسیات و ادبیات نیز علوم و فنون کے متعلق بھی کافی دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے زور قلم کا جولانگاہ اس وقت "درویش" معلوم ہوتا ہے اور چونکہ خواجہ صاحب کو مسئلہ تبلیغ اسلام سے اس زمانہ میں بہت دلچسپی رہی ہے اس لیے "درویش" کے متعدد صفحات اسی مبحث سے پُر ہوتے ہیں مقالات، سیاسیات، مواعظ حسنہ، اصلاح اعمال، قصص، خرافات وہ عنوانات ہیں جو ہر اشاعت میں نظر آتے ہیں اور اکثر نامور اہل قلم کے قابل قدر مضامین پیش کرتے ہیں۔ تجلیات البتہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے مخصوص انداز میں اُنھیں کے قلم سے جلوہ افگن ہوتی ہیں

ملا محمد الواحدی صاحب کی ادارت میں جو رسالہ بھی شائع ہوا اُس کے متعلق کسی بدمذاقی کا تو تصور بھی نہیں ہو سکتا لیکن موضوع کے اختلاف سے ممکن ہے کہ مختلف طبائع کے لیے وہ

یکساں دلچسپ ہو۔ لیکن "درویش" کے متعلق بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر طبقہ و ہر مذاق کے علم دوست حضرات کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اور ۴۰ صفحہ کا حجم اور مضامین کی خوبی دیکھتے ہوئے قیمت دو روپیہ سالانہ بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ رسالہ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرے گا۔

—— لسان الملک۔ اڈیٹر سید محمد ضامن کنتوری و سید منظر علی اشہری

مطبوعہ عماد پریس حیدر آباد قیمت سالانہ صہ ریاست حیدر آباد سے یہ دوسرا رسالہ ہے جو نہایت خوبی کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوا ہے اور جس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔

حیدر آباد کو وضع اصطلاحات کے سلسلہ میں وضع الفاظ کا بھی موقعہ ہاتھ آجاتا ہے اس لیے وہاں کے کاغذات و اخبارات میں نئے الفاظ نظر پڑتے ہیں مجلس "تقدم العلوم" کے عنوان سے ایک علمی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور اُسی کے زیر نگرانی "لسان الملک" کا اجرا عمل میں آیا ہے۔

یہ رسالہ ۲۶ × ۲۰ سائز اور سفید کاغذ پر اچھا صاف چھپا ہے۔ حجم چار جزو ہے۔ مضامین میں تنوع کا خاص اہتمام ہے تاریخ، فلسفہ، ادب، ہر قسم کے مضامین قابل مضمون نگاروں کے قلم سے شائع ہوئے ہیں جہاں "اردو بل" جیسے ٹھوس مضامین ہیں وہاں فسانہ و ادب لطیف کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ امید ہے کہ دو چار نمبر دیکھنے کے بعد ہم اُس کے متعلق بہتر رائے قائم کر سکیں گے۔

کلام اقبال

(خاص "جامعہ" کے لیے مرحمت فرمایا)

علامہ اقبال کی نظر لطف کا یہ ثمر اولین ہے جس کو ہم کمال افتخار و انبساط کے ساتھ آج جامعہ میں شائع کرتے ہیں، شکر نعمت و اظہار عقیدتمندی کے لیے الفاظ کہاں سے آئیں کہ جذبات دلی کی ترجمانی کرسکیں، لیکن یہ توقع بیجا نہیں کہ مولانا محمد علی مدظلہٗ کی تشریف آوری کے بعد ہم کو اس بار سے سبکدوشی ہوجائے گی اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب اُس وقت جو کچھ عنایت فرمائیں گے وہ لطفاً محبت ہوگا محض ہماری خاطر نہیں - مدیر

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا
حذر از خرد کہ بندد ہمہ نقش نامرادی
دل ما برد بسازے کہ گسستہ تار بادا
نہ بہ جادۂ قرارش نہ بہ منزلے مقامش
دلِ من مسافر من کہ خدایش یار بادا
تپش است زندگانی تپش است جاودانی
ہمہ ذرہ ہائے خاکم دل بے قرار بادا
تو جوانِ خام سوزے سخنم تمام سوزے
غزلے کہ مے سرایم بتو سازگار بادا
چو بجانِ من در آی دگر آرزو نہ بینی
مگر اینکہ شبنم تو یم بے کنار بادا

(اقبال)

جامعہ ملیہ

(نتیجۂ فکر جناب سید نوب علی صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر بڑودہ کالج)

مندرجۂ ذیل نظم "جامعہ ملیہ" کی وہ تحسین ہے جو ناشناسوں کے قلم سے نہیں بلکہ ایک نکتہ سنج کی زبان سے ادا ہوئی ہے نیز سید صاحب کی یہ عنایت اُس غائبانہ ولی منت شفقت کا تقاضا ہے جو داد طلبی کجا، دنیا کی اکثر نعمتوں سے زیادہ عزیز و بالطف ہے۔ مدیر

جامعہ چرچے ترے اب جا بجا ہونے لگے
آئینہ جوہر ترے نام خدا ہونے لگے

درد ملت دل میں، سودائے محبت سر میں ہے
چاہنے والے ترے تجھ پر فدا ہونے لگے

کامیابی کے لیے دیوانگی اک شرط ہے
کیوں نصیب دشمناں عاقل بھلا ہونے لگے!

سیکھ لیں بیتابیوں سے تیری چشمک برق کی
وہ جو جگنو کی طرح جلوہ نما ہونے لگے

مسلم اے بندہ خدا کے کچھ تو غیرت چاہیئے
بت کے جو بندے تھے وہ بھی باخدا ہونے لگے

زندہ باد اے "جامعہ" تو ہے حیات طیبہ[۵۱]
تھے جو فرسودہ طریقے وہ فنا ہونے لگے

والضحیٰ[۵۲] سے ہو گیا نواب پھر روشن ہمیں
وہ جو تھے بھٹکے ہوئے خود رہنما ہونے لگے

۵۱۔ اس میں آیۂ شریفہ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً کی طرف اشارہ ہے۔

۵۲۔ اس میں آیۂ شریفہ وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَھَدٰی کی طرف اشارہ ہے۔

شذرات

آج متمدن دنیا کا ہر فرد اور مغربی ممالک کے تمام ممتاز مدبرین جن کو سیاسیات مشرق سے کچھ بھی تعلق ہی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ آل عثمان کی عظمت گزشتہ کو دوبارہ حاصل کرنے میں لازین کانفرنس سے زیادہ کامیاب اور جنرل عصمت پاشا سے بہتر وکیل کوئی ثابت نہیں ہوا۔ خدائے کارساز کی رحمت کاملہ کے جو مناظر ان مجالس اور اس میدان میں نظر آئے اُن کے لیے ایک مدت سے آنکھیں بیتاب تھیں، اور خدا کا شکر ہی کہ دنیائے اسلام کی یہ کامیابی ہی نہیں بلکہ لائڈ جارج، لارڈ کرزن اور اُن کے رفقا رنے بھی وہ سب کچھ دیکھا جس کو وہ نہ دیکھنا چاہتے تھے۔

"بلاشبہ یہ تاریخ کا پہلا موقع ہی کہ مسلمانوں نے دول اتحاد سے بالکل مساویانہ صلح کی ہی" (سر آغا خاں) اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ عظیم الشان کامیابی محض ترکوں ہی کی نہیں بلکہ ترکوں کے ذریعے تمام ایشیا کی فتح قرار دیجائے تو بیجا نہیں۔

مولانا محمد علی مدظلہ کی رہائی محض ایک واقعہ کی حیثیت نہیں رکھتی کہ اُس پر صحافی طرز میں چند سطور لکھ دی جائیں بلکہ شوق و عقیدت کی فراوانی، طوفان تکلم و ذوق خامہ فرسائی دونوں سے بے نیاز، جوش عقیدت نہ اظہار جذبات کی تاب لاسکتا ہی اور نہ خیر مقدم کے رسمی قیود سے اُس لطف خاص کو بے مزہ کرنے پر آمادہ ہی جو محض مولانا کی زیارت اور ع

"وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے" کے بلیغ و نشاط انگیز الفاظ میں مضمر ہی۔

یوں تو انتظار کے دن اور بیقراری کی راتیں اِن دو برسوں میں بارہا آئیں اور گزر گئیں لیکن اس مہینے کی بیقراریاں اور انتظار کی گھڑیاں کچھ عجیب شان محبوبی رکھتی تھیں، اطلاع رہائی پر بعض حضرات نے دیوان حافظ کھولا تو یہ غزل نکلی۔

درنماز م خم ابروے تو چوں یاد آمد — حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد
از من اکنوں طمع صبر و دل و ہوش مدار — کاں تحمل کہ تو دیدی ہمہ بر باد آمد
بادہ صافی شد و مرغان چمن مست شدند — موسم عاشقی و کار بہ بنیاد آمد
اے عروس ہنر از دہر شکایت منمائے — حجلۂ حسن بیارائے کہ داماد آمد
بر زلیخا ستم اے یوسف مصری مپسند — زانکہ از عشق بر او اینہمہ بیداد آمد
دلفریبان نباتے ہمہ زیور بستند — دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد
زیر بارند درختاں کہ تعلق دارند — اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

مولانا نے زندان فرنگ سے ایسے وقت قدم باہر نکالا ہی کہ ملک کی آب ہوا جیل کی تنگ تاریک فضا سے بھی زیادہ مسموم اور اہل ملک کی حالت زندانیوں سے بھی زبوں ہی لیکن مولانا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بیتول جیل کا دروازہ جب اُن کے لیے کھلا تھا تو زمین پنجاب اور واقعہ جلیانوالہ باغ کسی خیر مقدم و تقریب تہنیت کی دعوت نہیں دے رہے تھے بلکہ اُن آنے والے طوفانوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو بالآخر بپا ہوئے اور انجام کار کراچی اور بیجاپور کی آبادی کا بھی باعث بنے۔ اُس وقت مولانا نے جیل سے نکلتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی — پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہی!

آج بھی وہ اسی طرح اُن کے حسب حال ہی جس طرح اسی غزل کا دوسرا شعر جو صدارت مسلم لیگ کی طرف اشارہ کرتا ہی' اور مولانا کی موجودہ حیثیت یعنی منتخب شدہ صدر انڈین نیشنل کانگریس کے لیے بھی یکساں موزوں ہی۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تجھے جوہر
لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہی!

یورپ نے علوم شرقیہ کی تحصیل و تحقیق میں جو ناموری حاصل کی ہے محتاج بیان نہیں فرانس جرمنی اور ہالینڈ نے جو مستشرق پیدا کیے ان کی تحقیقات علمیہ کے آگے خود فضلائے مشرق کو سر تسلیم خم کرنا پڑا ہے۔ افسوس ہے کہ اس بزم میں انگلستان کی کرسی بہت نمایاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ مصر اور ہندوستان کے دیرینہ اور حاکمانہ تعلقات کے سبب سے اسے اس مجلس میں چمکنے کا موقع ہر ملک سے زیادہ تھا۔ یوں تو آجکل ولایت میں لائق ہندوستانی طلبہ کی بدولت مستشرق کا لقب بہت گراں نہیں۔ پھر بھی انگلستان کے معدودے چند شائقین علوم مشرقی میں سرجیمس لایل کی ذات مغتنم روزگار تھی۔ افسوس ہے کہ ادبیات عربی کا یہ شیدائی بھی ۱۹۲۰ء میں ۷۵ سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہو گیا اور انگلستان کو علمائے زبان عربی سے خالی کر گیا۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اس شخص کو تین سال ہندوستان کے نظم حکومت میں اور بارہ سال انڈیا آفس میں نہایت مصروف زندگی بسر کرنا پڑی ہے تو اس کی تحصیلات اور تحریرات پر سخت حیرت ہوتی ہے اپنی فرصت کے گھنٹے اُس نے عربی نظموں کے مطالعہ پر صرف کیے اور اس کمال سے اُن کے ترجمے کیے کہ جرمنی کی علمی مجلس ڈی ایم جی کا اعزازی ممبر بنایا گیا اور سٹراسبرگ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی اکسفرڈ کے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگریاں عطا ہوئیں۔ ان کی دو تالیفات نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا ایک تو سبعہ معلقہ، قصائد اعشیٰ، ما لعبید بن الابرص کی تخنی دوسرے مفضلیات کے متن و ترجمہ و حواشی کی اشاعت۔ ان کے علاوہ ان کی مرتبہ کتب ذیل قابل ذکر ہیں۔

دیوان عبید بن الابرص اسدی۔ دیوان عامر بن الطفیل، عامر بن صعصعہ جو دنیا میں پہلی مرتبہ برٹش میوزیم کے قلمی نسخوں سے مرتب کر کے مع ترجمہ و حواشی شائع ہوئے۔ کلام عمر بن قمیئہ کی تدوین و ترجمہ۔ کلام جاہلیین کا ترجمہ مع مقدمہ و حواشی دوسرے تراجم کے مقابلہ میں نہایت مستند تسلیم کیا جاتا ہے اور بہت مقبول و مشہور ہے۔ ان اشعار عرب کی

ترتیب ترجمہ تحشیہ کے علاوہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ان کے بہت سے عالمانہ و محققانہ مضامین شائع ہوئے۔ مثلاً قدیم کلام عرب کی مصوری، قدیم کلام عرب اور معلومات تاریخی کی حیثیت سے، قدیم کلام عرب کا تعلق عبری ادبیات توراۃ سے، نابط شرا کے چار قصائد۔

سر لایل کی علمی زندگی میں نوجوانان مشرق کے لیے سخت عبرت و بصیرت پوشیدہ ہے جن کو ہمیشہ علمی مشاغل کے لیے وقت کی کمی اور افکار دنیادی کی زیادتی کی شکایت رہتی ہے مگر سر لایل کے سیاسی اور انتظامی فرائض کے ساتھ یہ دماغی شغف ایسے عذرات کو ہیچ کیے دیتی ہیں۔

بقدر الکد تکتسب المعالی ومن طلب العلی سھر اللیالی

ماہ جون میں ہم نے مولانا محمد علی کی ایک غزل کا عکس شائع کیا تھا تا کہ لطف کلام کے ساتھ اُن کے سوادِ خط سے بھی ناظرین محظوظ ہو سکیں ہمیں اپنی اس خدمت کی داد ایک خریدار سے جن الفاظ میں ملی ہے اُس کو بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں اور اپنے ناظرین کی سخن فہمی سے امید ہے کہ وہ اس معمہ کو حل کر سکیں گے۔

"جامعہ نمبر ۲ موصول ہوا، افسوس ہے کہ صفحۂ اول میں" تحریر دستخطی خاص جناب مولانا محمد علی مدظلہ"، جو شائع ہوئی تھی وہ کاٹ لیکر اس کے بجائے ایک قلمی غزل بعنوان "غزل دیگر" لگائی گئی ہے جو ۹ بیتوں پر مشتمل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

براہ کرم وہ تحریر خاص ضرور بھیجیئے اور تحقیق کیجئے کہ کس انسان کی یہ کارروائی ہے؟ تا کہ آئندہ ایسی شرمناک کارروائیوں کا انسداد ہو!"

یورپ کے سامنے جب مذہبیت کا ذکر ہوتا ہے تو بالعموم اُس سے مراد کسی ایسی جدت سے ہوا کرتی ہے جس سے مذہب پرست لوگ قطعاً ناآشنا ہوں چنانچہ حال میں نیویارک (امریکہ) کے مقام بروکلین میں چند عیسائی، یہودی اور مسلمان اشخاص نے باہم ملکر ہر سہ مذاہب کی ایک متحدہ انجمن قائم کی ہے سوسائٹی مذکور کا آغاز اگرچہ گزشتہ ماہ دسمبر میں ہوا لیکن اس کا اعلان ابھی حال میں بروکلین کی "مجلس موسیقی" کے ایک جلسہ عام میں کیا گیا ہے۔ انجمن کے صدر ریورنڈ الفرڈ بے بینی ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی یہ کوشش جو وہ "توحید کے قائل تین بڑے مذاہب کی انجمن قائم کرنے کے لیے فرما رہے ہیں تعصب کے مٹانے اور تمام معتقدات اور مذاہب میں یگانگت پیدا کرنے کی ایک بڑی تحریک ہوگی"۔ انجمن نے جو مقصد پیش نظر رکھا ہے وہ یہ کہ "مسائل متفقہ پر مزید زور دیا جائے اور جن امور میں اختلاف ہے انہیں مٹایا جائے"۔

ان ناآشنایان دین ومذہب سے کوئی پوچھے کہ اس سعی لاحاصل سے کیا نتیجہ۔ اس اتحاد و یگانگت کی کیا ضرورت۔ یہ تینوں مذہب نہ تو کوئی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ہر ایک دوسرے سے کوئی غیر متعلق وجود ہے۔ بلکہ یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کی تکمیل کو آیا اسلام اس سلسلہ کی۔ آخری کڑی تھا۔ اس ترتیب کا ذکر آج سے تیرہ سو برس قبل بہ بانگ دہل کیا جا چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ — بے شک ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔ ۵ / ۴۴

آگے چلکر یہ بیان کرنے کے بعد کہ کس طرح سے یہودیوں نے احکام توریت کو پامال کیا خدا تعالیٰ نے انجیل کے نزول کا ذکر فرمایا۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا — اور بعد کو ان ہی کے قدم بقدم ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو چلایا کہ وہ تورات کی جو ان سے پہلے تھی تصدیق کرتے تھے اور ان کو ہم نے انجیل دی

بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ جس میں ہدایت اور نور ہے اور تورات جو اس کے پہلے
وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ سے موجود تھی یہ انجیل اس کی تصدیق بھی کرتی ہے اور
پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

توریت کی طرح جب انجیل کے احکام کی بھی نافرمانی کی گئی اور دنیا ظلمت و تیرگی کا گھر بنی ہوئی تھی اس وقت اس سلسلہ کی آخری کڑی آئی اور خدا تعالےٰ نے اس طرح ارشاد فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ اور اے پیغمبر ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق اتاری
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ کہ جو کتابیں اس کے پہلے سے ہیں ان کی تصدیق کرتی ہے
الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ۝ اور ان کی محافظ بھی ہے۔

---

۲۶ راگست کی تاریخ ہندوستان کے ہر گوشہ میں فیصلہ کینیا پر بطور احتجاج کے منائی گئی۔ کینیا کیا ہے؟ کہاں ہے؟ مسئلہ کینیا سے کیا مراد ہے؟ فیصلہ کی کیا نوعیت ہے؟ ان کے جوابات کے لیے ان صفحات میں گنجائش نہیں لیکن مختصراً یہ کہنا کافی ہوگا کہ کینیا جنوبی افریقہ کے شرقی ساحل پر ایک نو آبادی ہے جہاں پر کچھ عرصہ قبل ہندوستانی کثیر تعداد میں بہ "تلاش روزگار" جاکر بس گئے۔ اسی طرح کچھ باشندگان فرنگ بھی اپنا وطن مالوف چھوڑ کر وہاں گئے لیکن ان کا مقصد تلاش زر تھا۔ اس اجتماع اضداد یعنی "سفید و سیاہ" "زر و محنت" کے فرق کو نمایاں کر دیا۔ ہندوستانیوں اور یورپینوں کے علاوہ بعض دوسرے ممالک کے باشندے بھی آباد ہیں ان کے نام اور اعداد ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق

یورپین	۹،۶۵۱
ہندوستانی	۲۲،۸۲۲
عرب	۱،۰۰،۱۰۲
افریقی	۲۵،۵۰،۰۰۰

ان اعداد کو پیش نظر رکھ کر وہاں کی حکومت میں ان کا جو عنصر ہے وہ بھی دیکھیے۔

یورپین	۱۱	ممبران
ہندوستانی	۵	”
عرب	۱	منتخب ممبر علاوہ سرکاری نامزد کے
افریقی	۱	غیر سرکاری نامزد ممبر جو وہاں کے مسیحی مشنریوں میں سے منتخب کیا جاتا ہے

اعداد بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی اور یورپین آبادی میں ۲ : ۱ کی نسبت ہے اور حکومت میں ۱ : ۲ کی ہے یعنی نمایندگی کا تناسب ۱ ہندوستانی بمقابلہ ۴ یورپین کے ہے اور جبکہ ایک جماعت جمع مال کے لیے ہمہ تن مصروف ہو اور حکمران طبقہ کی ہم قوم ہم مذہب اور ہم رنگ بھی ہو تو پھر ایسی صورت میں ان مشکلات کا پیش آنا ایک لابدی امر تھا۔ جب کبھی حکومت "نو آبادیات میں بلند مقامات ہندوستانیوں کو دیے جانے" اور "انتخاب عام" کا سوال آتا اس وقت یورپین باشندے تیغ و تفنگ کی دھمکی دیتے۔ لیکن باوجود اس کے اب کے بار امپیریل کانفرنس کے رزولیوشن کے مطابق امید تھی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے حقوق میں انصاف سے کام لیا جائے گا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ اسی کوشش میں ہندوستان سے ایک وفد گیا لیکن تمام امیدوں کے خلاف نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا گیا فیصلہ سے سفید و سیاہ کا صاف امتیاز نظر آرہا ہے۔ ہندوستان متعجب ہے کہ اس کی پذیرائی کیوں نہ ہوئی لیکن شاید وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ "جب تک وہ اپنے بند غلامی نہ توڑے دوسرے کو آزاد نہیں کرا سکتا"

مندرجہ صدر شمار و اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی باشندوں سے بدتر حالت وہاں کے

عربوں کی ہے جن کا منتخب شدہ ممبر صرف ایک ہے لیکن ان کے حقوق کی پامالی، ان کے ساتھ تشدد، ناانصافی کے قصے کبھی سننے میں نہیں آتے۔ ہندوستانیوں میں تو بارے خدا خدا کرکے اپنے ہم قوم باشندوں کے ساتھ ہمدردی کا احساس پیدا ہوگیا ہے کہ سمندر پار کب کے بچھڑے ہموطنوں کے رنج وغم میں شریک ہوکر نالہ و فریاد تو کیا کرتے ہیں لیکن کیا جزیرۃ العرب کے بسنے والوں سے بھی یہی توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی ہم قوموں کے شریک غم ہوں گے، سچ تو یہ ہے کہ ع آں خویشتن گم است کرا رہبری کند" متاع کارواں تک کے لٹنے کا اتنا افسوس نہیں جتنا رنج اس امر پر ہے کہ ع کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

جامعہ ملیہ اسلامیہ

کے

شعبۂ تصنیف و تالیف کی شائع کردہ کتابیں

(۱) ازہار العرب۔ مؤلفہ مولانا سورتی قیمت غیر مجلد ۸ر

(۲) تاریخ الامت۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری قیمت ۱۲ر

(۳) ایضاً (حصہ دوم) ۶ (حصہ سوم) " " ۱۲ر " " ۱۲ر

(۴) مبادی معاشیات۔ از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب " " ۱۲ر

(۵) اخبار الدولتین۔ از مولانا نیاز فتحپوری (زیر طبع)

(۶) انتخاب کلام میر۔ مرتبہ مولوی نور الرحمن بی اے (")

(۷) خطبہ شیخ الہند۔ (بہ تقریب افتتاح جامعہ) قیمت ۲ر

(۸) خطبہ مسیح الملک۔ حکیم اجمل خاں صاحب " ۲ر

(۹) انتخاب مضامین جوہر مع تصویر " ۵ر

(۱۰) ترکوں کی کہانیاں " ۲ر

مشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ/

فہرست مضامین

جلد	ماہ صفر ۱۳۴۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۴ء		نمبر ۳
نمبر شمار	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
۱	جرمنی کی تعلیمی زندگی	ڈاکٹر فریڈرش ابرنشٹ رائش برلن جرمنی	۱۲۷
۲	گیتا	سید کامل حسین ایم اے	۱۳۵
۳	تاریخ صلح لوزان کانفرنس	قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم	۱۴۴
۴	پیام مشرق	مولانا محمد اسلم جیراجپوری استاد جامعہ ملیہ	۱۴۵
۵	انقلاب انگورہ	مولانا ابو القدس توحیدی	۱۶۴
۶	مطبوعات جدیدہ	"ناقد"	۱۷۵
۷	نوید امید (نظم)	مولانا حافظ اسلم جیراجپوری استاد جامعہ ملیہ	۱۷۹
۸	خدا ابھی ہے (نظم)	"صدائے خاموش"	۱۸۰
۹	ہو الموجود	مولوی فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی	۱۸۱
۱۰	نوحہ	مولانا محمد علی جوہر مدظلہ	۱۸۲
۱۱	شذرات	"مدیر"	۱۸۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | صفر ۱۳۴۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۳ء | نمبر ۳

جرمنی کی تعلیمی زندگی

(۲)
اعلیٰ مدارس

(ڈاکٹر فریڈرش ایرنٹ رائش نے خاص جامعہ کے لیے تحریر فرمایا)

پہلے مضمون میں ہم دکھا چکے ہیں کہ جرمن تعلیمات کی تاریخ میں یونیورسٹی نے کس قدر اہم حصہ لیا ہے۔ ساتھ ہی یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ مجموعی تعلیمی زندگی میں یونیورسٹی گویا قدامت پسند عنصر رہا کی ہے۔ جرمنی میں آجکل ایک درجن سے زیادہ یونیورسٹیاں ہیں جن میں سب سے قدیم قرون وسطیٰ میں قائم ہوئی تھیں اور بعض مثلاً (Frankfort) فرانکفورٹ اور ہمبرگ Hamburg بالکل حال میں معرض وجود میں آئی ہیں۔ علوم کے لحاظ سے یونیورسٹیاں چار (Faculties) شعبوں میں تقسیم ہوتی ہیں دینیات (پروٹسٹنٹ یا کیتھولک) فلسفہ (جس میں علم الالسنہ، سائنس اور ریاضی وغیرہ بھی شامل ہیں) قانون اور طب۔ بعض یونیورسٹیوں نے ریاضی اور سائنس کو فلسفہ سے الگ کرکے پانچواں مستقل شعبہ بنا دیا ہے۔ یونیورسٹیوں کا نظم و نسق ایک ریکٹر (ناظم) کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو جماعت اساتذہ میں سے ہر سال منتخب کیا جاتا ہے۔ جماعت اساتذہ یا مجلس شوریٰ (Senate) مستقل پروفیسروں عارضی پروفیسروں پرائیویٹ درس دینے والوں اور لکچراروں

پر مشتمل ہوتی ہے۔ شیخوں کے صدر (Deacon) کہلاتے ہیں۔ معلمی کی کرسی پر وہ شخص جگہ پا سکتا ہے جس نے ڈاکٹر کی سند حاصل کرنے کے بعد کوئی علمی تصنیف کامیابی کے ساتھ انجام کو پہونچائی ہو یہ (ab BiBittenschrift) معلمانہ تصنیف کہلاتی ہے۔ پرائیویٹ درس دینے والوں کو حکومت کی طرف سے کوئی مشاہرہ نہیں ملتا۔ چنانچہ صرف مرفہ الحال لوگ اس شغل کو اختیار کرسکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے قیام اور ترقی کا مدار ظاہر ہے کہ محض اُن کی علمی قابلیت پر ہے۔ لکچرار وہ تنخواہ دار نائب ہیں جو یونیورسٹی میں ہر طرح کے علمی کام خصوصاً ممالک غیر کی زبانوں کے درس کو انجام دیتے ہیں۔ پروفیسروں کا تقرر وزارت تعلیم معارف کی طرف سے ہوتا ہے۔

جرمن یونیورسٹیاں اپنے نشو و نما اور نظم و نسق کے لحاظ سے کتنی ہی قدامت پسند کیوں نہ ہوں تاہم اُن کا وہ مخصوص حق جس پر انھیں ناز ہے پڑھنے اور پڑھانے کی آزادی ہے۔ یعنی یونیورسٹی کا ہر معلم جس مضمون پر چاہے لکچر دینے کا اعلان کرتا ہے۔ برخلاف اس کے ہر طالب العلم اپنی مرضی سے فیصلہ کرتا ہے کہ کون کون سے لکچر سُنے گا۔

پروفیسروں میں طالب العلموں کی حاضری نہیں لیجاتی۔ اس معاملہ میں ہر طالب العلم اپنی ذاتی ذمہ داری سے کام لیتا ہے جس کا حساب اُسے آخری امتحان کے وقت دینا ہوتا ہے جس میں ۸ سے لیکر ۱۲ ٹرم تک (۴ سے لیکر ۶ سال تک) لگتے ہیں۔ اصل میں یونیورسٹی کا صرف ایک امتحان ڈاکٹر کی سند کے لیے ہے۔ یونیورسٹی میں تعلیم پانے کی اجازت عام طور پر ہائی اسکولوں کے آخری امتحان (Abiturient) کے پاس کرنے پر ملتی ہے یعنی عام طور پر یونیورسٹی کے داخلہ کا کوئی علحدہ امتحان نہیں ہوتا۔

پروفیسروں کے لکچر جن کا اعلان سیاہ نوٹس بورڈ پر ہوتا ہے اکثر پرائیویٹ ہوتے ہیں یعنی سامعین کو کچھ معاوضہ دینا پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض مختصر۔ عام۔ بلا معاوضہ لکچر ہوتے ہیں جو اکثر فنون لطیفہ یا عام علوم پر ہوتے ہیں۔ لکچروں کے ساتھ ساتھ علمی مشق کے کلاسوں کا (جو ایک طرح سے اسکول کے کام کا مزید سلسلہ ہیں) اور سیمیناروں

کا اعلان ہوتا ہی۔ یقیناً یہ بہت ضروری بات ہی کہ اسکول کی پابندی اور نگرانی سے نکل کر دفعتاً جو (Academic) یونیورسٹی کی زندگی کی آزادی ملتی ہی اُس کا استعمال احتیاط کے ساتھ اور صحیح کیا جائے بہت سے نوجوان ابتدا میں اس بات کو نہیں سمجھتے اور اپنا سارا وقت لہو و لعب میں گزارتے ہیں، اس اعتبار سے انگلستان کی یونیورسٹیوں میں اپنے طالبعلموں کو تضیع اوقات سے بچانے کا بہتر انتظام ہی اور ان کے لیے دارالاقامے بھی مہیا کیے جاتے ہیں درانحالیکہ کوئی جرمن طالبعلم یونیورسٹی یا "کالج" میں نہیں رہتا ہی لیکن پھر بھی یونیورسٹی کی آزادی کا صحیح استعمال سیکھنا جرمنی میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہی۔ یونیورسٹی کے اکثر شعبوں میں بالخصوص سائنس میں تعلیم کا ایک جزو علمی سفر (Tour) بھی ہی

بالعموم طالبعلم لکچروں کے اہم حصوں کے متعلق ایک کاپی پر یادداشت لکھ لیتے ہیں۔ بعض پروفیسر اپنے درس کے ختم پر اس کا خلاصہ بھی لکھوا دیتے ہیں سب سے اہم علمی کام سیمینار میں ہوتا ہی۔ سیمیناروں میں داخلہ کئی (Term) کے بعد اور اکثر ایک مختصر سا امتحان لیکر کیا جاتا ہی۔ یہاں طالبعلم پروفیسر کی نگرانی میں اور اُس کی مدد سے اپنے مضمون میں پوری طرح کام کرتے ہیں اور انھیں علمی تنقید کی تعلیم دی جاتی ہی۔ یہاں ایک طرح سے امتحان کی ضروریات کے لیے طیاری ہوتی ہی۔ پروفیسروں اور طالبعلموں کے تعلقات تعلیم و تعلم سے گزر کر ذاتی دوستی تک بدقسمتی سے جرمن پروفیسروں کی عدیم الفرصتی اور کام کی بیحد کثرت کے سبب سے صرف بعض صورتوں میں پہونچ پاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طالبعلموں کو اُن معاملات میں جو خود اُن سے تعلق رکھتے ہوں (مثلاً جلسے اور جشن وغیرہ ممالک غیر کے طالبعلموں کا مسئلہ۔ ورزش جسمانی۔ پبلک تقریریں) بڑی حد تک خودمختاری حاصل ہی جس کا استعمال طالبعلموں کی پارلیمنٹ کرتی ہی جو ۱۹۱۸ء میں انقلاب کے بعد قائم ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے جرمن طالبعلموں میں سیاسی اختلافات کے سبب سے سخت نااتفاقی ہی اور اس اعتبار سے سیاسی رواداری

اور مخالفین کی رائے کی وقعت کے معاملہ میں اُنھیں ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔ جنگ کے بعد ضروریات زندگی کی بے انتہا گرانی کے سبب سے طالبعلموں کی مالی حالت روزہ مرہ بدتر ہوتی جاتی ہے۔ ان کی غالب تعداد کو آجکل کوئی پیشہ ضمنی طور سے اختیار کرکے تعلیم کے مصارف نکالنا ہوتا ہے۔ حالانکہ جنگ سے پہلے ان کے خاندان والے ان کی کفالت کیا کرتے تھے۔ مالی مصیبت میں علاوہ طالبعلموں کے خود دارالعلوم اور اُن کے علمی ذخائر بھی گرفتار ہیں۔ ان میں سے اکثر ضروری علمی رسالوں اور جدید ایجادات کو اُن کی گرانی کے سبب سے مہیا نہیں کرسکتے۔

بڑی سخت جنگ و جدل عورتوں کے یونیورسٹی میں داخلہ کے بارے میں ہوئی تھی یہاں تک کہ بیس سال ہوئے پہلے پہل عورتوں کو بہ حیثیت طالبعلم داخل کیا گیا۔ تاہم انفرادی حیثیت سے بعض پروفیسر کچھ دن پہلے تک عورتوں کو اپنے سیمناروں (Seminars) میں داخل نہیں کرتے تھے۔ عام طور پر عورتوں نے نہایت انہماک اور محنت کے ساتھ اپنی تعلیم کو اختتام تک پہونچایا ہے اور اکثر مردوں کے لیے کام کرنے کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

جرمن طالبعلم اس بات کے لیے مشہور ہیں کہ انھیں نہایت مکمل طور پر علمی تربیت دی جاتی ہے جو انھیں تحقیق و تدقیق کے سرچشموں تک پہونچاتی ہے اور انھیں آزاد اہل نظر اور محقق بناتی ہے۔ عام طور پر لوگ متعدد یونیورسٹیوں میں تھوڑے تھوڑے دن رہ کر اپنی تعلیم پوری کرسکتے ہیں۔

طالبعلموں کے Union یونین جو خاص قواعد کے ماتحت باہمی رابطہ پیدا کرنے کی غرض سے قائم کیے جاتے ہیں صدیوں پہلے سے قائم ہیں ان میں ہمیشہ سے گانے بجانے۔ شراب و کباب۔ تلواروں سے گتکا کھیلنے کا مشغلہ جاری رہا ہے۔ آجکل بھی مختلف طرح کی انجمنیں موجود ہیں (Empire Corps یعنی ہموطنوں کی جماعتیں جو اصل میں ایک ہی مقام میں رہنے والے طالبعلموں کی انجمنیں ہیں) اور معاشرتی سیاسی انجمنیں جو تقریباً سو سال پہلے حب وطن اور آزادی کی تحریک کے سلسلے میں قائم ہوئی تھیں جابجا موجود ہیں۔

قدیم طلبہ کی Union یا انجمنوں میں یار باشی اور تیغ آزمائی کی مشق نے جنگی غرض بہادری کو ابھارنا تھا، حال میں کہیں کہیں مقابلۃً عیاشی اور قوائے ذہنی کو حرکت دینے والی صورتیں بھی اختیار کر لی ہیں اور جہاں وہ اپنی اصلی صورت میں باقی بھی ہیں وہاں ان پر فی نفسہٖ ادھم مچانے بدمستی اور لڑائی جھگڑے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان پرانی انجمنوں نے طالبعلموں کو علم مجلس اور رفاقت کی تعلیم دینے میں بڑا کام کیا ہے۔ ان کے مقابلہ میں نئی، خشک اور سنجیدہ انجمنیں جو آزاد جرمن مجالس کے نام سے موسوم ہیں قائم ہوئی ہیں جنھوں نے شراب اور تمباکو کے استعمال اور ڈوئل کو بالکل ترک کر کے پیدل سیر و سیاحت، اسپورٹ اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ سے تنگ حلقوں میں ایک نئی روح یار باشی کی پھونک دی ہے۔

ان انجمنوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی، علمی اور سیاسی انجمنیں، اسپورٹ کلب، بے غرض جماعتیں اور بے نظام حلقے ہیں طالبعلموں کی غالب تعداد آجکل کسی پرانی یونین سے تعلق نہیں رکھتی صرف ان یونینوں کے ممبر مخصوص رنگ کی ٹوپیاں پہنتے ہیں اور رنگ برنگ کے فیتے سینے پر لگاتے ہیں۔ پرانے طالبعلموں کو ناولوں، ڈراموں اور چھوٹی لڑکیوں کو مخصوص دلچسپیوں کے حلقہ میں گھیر رکھا ہے۔ لیکن یہ دلچسپیاں اور جذبات پرستی اس مصروف زندگی اور کاروباری زمانے کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔

صدیوں سے یونیورسٹی کی اصلاح کے خیال پر زور دیا جا رہا ہے ابتک اس کے محض دو نتائج مترتب ہو سکے ہیں ایک تو عورتوں کا یونیورسٹی میں داخلہ اور دوسرے طلبا کی پارلیمنٹ کا قیام۔ بعض پروفیسروں کے دل میں سیاسی حیثیت سے پرانے خیالات ابتک نقش کالحجر ہیں۔ پچھلے انقلاب کی باگ بہ خلاف سو سال پہلے کے یونیورسٹی کے ہاتھ میں نہ تھی لیکن اب ایک تعداد باہمت نوجوان پروفیسروں کی یونیورسٹیوں میں پہونچ گئی ہے جو نئی حکومت کے خیال کی حامی ہے اور جن کے گرد نئے خیالات کے طالبعلموں کا ایک حلقہ ہے۔

یونیورسٹی کی اصلاح چاہنے والوں کی کوشش یہ ہے کہ بے جان مشین کی طرح کے نظام امتحانات کو بدلیں اور امتحانوں کی مخالفت ہمیشہ سے بڑھتی رہی ہے۔ لکچروں کی تعداد کم کیا جائے اور مشق کے کلاسوں کے اوقات میں اضافہ کیا جائے اور علوم کو جن کی موجودہ تاریخ اور خاص شعبوں کی مہارت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور جو نئے سرے سے ترتیب دیئے گئے ہیں، اشتراکی اور (Communist) یونیورسٹی کے خلاف اسی حیثیت سے معرکہ آرا ہیں کہ یہ خالص سرمایہ داروں کا (Institution) ہے اور یہ لوگ علمی دولت کا فیض ہر فرد بشر کے لیے عام کردینے کے حامی ہیں۔

اسی تحریک کی بنا پر ۱۹۱۹ء سے تمام شہروں میں وہ دارالعلوم جن کو لوگوں نے Volks hoch schulen عام لوگوں کی یونیورسٹی کا نام دے رکھا ہے قائم ہوئے ہیں جو عام علوم کے تمام شعبوں میں اوسط اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو بلا امتحان کے تعلیم دیتے ہیں۔ اسی طرح سے برسوں پہلے وہ طالبعلم جو اشتراکیت سے متاثر تھے بڑے شہروں کے بے مایہ لوگوں میں اور گاؤں کے کسانوں میں جاکر ابتدائی تعلیم مثلاً حساب، ممالک غیر کی زبانوں، علم ادب اور تھیٹروں کے تماشوں وغیرہ کے ذریعہ سے تربیت مذاق کرتے ہیں۔ چنانچہ جینا۔ فرائی برگ۔ بادن اور میونک میں ساری یونیورسٹیوں کی خوبصورت عمارتیں جو تعمیر کے اعتبار سے محض سرمایہ والوں کے مذاق کے Facade اور علمی متانت سے نہیں بلکہ اشتراکیت کا احساس بھی ظاہر کرتی ہیں اس اعتبار سے ابھی اور تغیرات ہوں گے۔ یونیورسٹیوں کے پہلو بہ پہلو نئے ہاتھ بٹانے والوں کی حیثیت سے انیسویں صدی میں اعلیٰ صنعتی مدارس قائم ہوئے ہیں جو مساوی داخلہ کے شرائط کے ساتھ سائنس، میکینکل اور ترقی انجنیری، فن تعمیر اور جہازسازی وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسے عظیم الشان عملوں کے سبب سے ان کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور ان کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ طرز تعلیم اور نظم ونسق ان میں یونیورسٹیوں کے مطابق ہے۔

اگر اعلیٰ صنعتی مدرسہ کو یونیورسٹی کا سب سے چھوٹا بچہ کہا جائے تو اس کے کئی اور بھائی بہن ہیں مثلاً فنون لطیفہ کی اکاڈمی، موسیقی کا اعلیٰ مدرسہ لیکن یہ دونوں فن لطیف کے قدر دان کے کام کے نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جنھیں نقاشی مجسمہ سازی یا موسیقی سے خاص مناسبت ہو۔ گانے اور آرگن بجانے کی تعلیم کے لیے کلیسائی موسیقی کا اعلیٰ مدرسہ ہے اور خود یونیورسٹیوں میں بھی فن موسیقی پر عام لکچر ہوتے ہیں۔ اسی طرح تھیٹر کے مدرسہ میں ایکٹری کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اسے اعلیٰ مدرسہ کی حیثیت حاصل نہیں ہے ان میں سے اکثر کسی بڑے شہر کے تھیٹر سے ملحق ہوتے ہیں۔

تجارت پیشہ لوگوں کے لیے بھی کچھ دن سے ایک طرح کے پیشہ دری کے سے اعلیٰ تجارتی مدرسوں کے نام سے قائم ہوئے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور یونیورسٹیوں کی طرح ان میں بھی لکچر اور مشق کے کلاس کا خصوصاً اقتصادیات اور قانون میں انتظام کیا گیا ہے لیکن ان مدرسوں کے لڑکوں کا طالبعلموں میں شمار نہیں

اصل معنی میں اعلیٰ مدارس صرف یونیورسٹیاں، اعلیٰ صنعتی مدرسے، اکادمی ہیں لیکن ان کے بعد اس لفظ کے بہت وسیع معنی اختیار کر لیے گئے ہیں۔ دروس جسمانی اور جمناسٹک کے لیے بھی ایک مخصوص اعلیٰ مدرسہ برلن میں قائم ہوا ہے۔

سیاسی معلومات اور مدنیت کی تعلیم کے لیے حکومت نے ایک اعلیٰ سیاسی مدرسہ قائم کیا ہے جس میں ہر سیاسی پارٹی کے نمایندے لکچر دیتے ہیں، تصور عالم رکھنے والی جماعتیں

خیالات میں عبدیت اور ہند و فلسفہ سے مخلوط ہوتے ہیں اور اپنے خاص اعلیٰ مدرسے رکھتے ہیں دروس جسمانی اور فن لطیف کے مطابق رقص کے لیے بھی ایک دو مدرسے قائم ہیں جو ایک طرح کے پوشیدہ اعلیٰ مدرسہ ہیں۔

اس خاکہ سے جرمن اعلیٰ مدارس کے نظم و نسق اور یونیورسٹی کی زندگی کا کچھ تک تصور حاصل ہو گیا ہوگا۔ یونیورسٹیاں اب تک عہد قدیم کے ستونوں کی طرح مستحکم کھڑی ہیں لیکن آجکل کے

موسم بہار کے طغیان ابر و باد سے گرتی ہوئی ہیں۔ علم النفس، تعلیمات، برقی کیمیا وغیرہ اور پرانے کلاسیکل پہلو بہ پہلو جگہ پاتے ہیں۔ صنعت و تجارت مستقل مضمون بننے کا استحقاق جتا رہے ہیں اشتراکیت کا نعرہ تعلیم عام کر لینے کے لیے قدیم علم و فضل، جمہوریت یونیورسٹیوں کے دروازہ سے ٹکرا رہا ہے۔ چنانچہ عین اسی زمانہ میں ہر چیز کے عضو عضو میں نئی زندگی کا احساس ہو رہا ہے اور نئی روح سے نئے علوم اور زندگی سے آشنا علم و دانش پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

گیتا

ہندوؤں میں جو مقبولیت اور وقعت گیتا کو حاصل ہے وہ ویدانت۔ سانکھ۔ نیایہ وغیرہ ہندوستانی فلسفہ کے کسی شعبہ کو نہیں حاصل ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے خرابی یہ ہے کہ گیتا کے مداحوں نے اس کی تعلیم کو ایک لاینحل معمہ بنا رکھا ہے۔ جس قدر اختلافات گیتا کے مطالب و نکات کے متعلق ہیں دنیا میں کسی تحریر یا تقریر کے متعلق نہیں ہیں۔ مختلف اشخاص نے مختلف شرحیں لکھی ہیں اور ہر شارح کے مقلدین کی ایک جماعت ہے جو دوسری جماعتوں کے بیان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ اُن پر غلط بیانی کا الزام لگاتی ہے۔ چنانچہ ایک گروہ سری شنکراچاریہ کا مقلد ہے اور اُنھوں نے جو شرح لکھی ہے اُس کے مقابلہ میں تمام دوسری شرحوں کو غلط سمجھتا ہے۔ دوسرا گروہ وَلّبھ کی شرح کو مانتا ہے۔ تیسرا رامانوج کا قایل ہے۔ چوتھا مادھو کا مقلد ہے۔ پانچواں گروہ پنڈت گورہ گووندے کو صحیح سمجھتا ہے۔ چھٹا گروہ ارباب تھیاسوفی کا ہے جن کا خیال ہے کہ گیتا کے اصلی مطالب صرف مسز اینی بسینٹ کے (گیتا کے) انگریزی ترجمہ میں پائے جاسکتے ہیں۔ ساتواں گروہ اُن لوگوں کا ہے جو کسی طرح کے پابند نہیں ہیں بلکہ اپنی آزاد رائے رکھتے ہیں البتہ دوسری جماعتوں کی طرح اس بات کے قایل ضرور ہیں کہ گیتا کی تعلیم مکمل اور بے نقص ہے۔ آٹھواں گروہ بھی گیتا کے پڑھنے اور سمجھنے میں اپنی آزاد رائے سے کام لیتا ہے مگر اس کی تعلیم کو ناقص خیال کرتا ہے۔ ان حالات میں گیتا پر کوئی ایسا مضمون لکھنا جو ہر لحاظ سے جامع ہو اور ہر شارح کے نقطہ نظر سے مطابقت کر سکے ناممکن ہے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ایک ضخیم کتاب بھی اس مدعا کو بہت مشکل سے پورا کر سکتی ہے۔

یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر اختلاف آرا کا اصلی سبب کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ گیتا کی تعلیم میں اکثر بے ربطی اور اجتماع ضدین پایا جاتا ہے اور اس کے اشلوک جابجا بیحد مغلق ہیں۔ اس لیے ہر شرح لکھنے والے نے جداگانہ مطالب بیان کیے ہیں اور ہر شخص اپنے

مطلب کی بات نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بہرحال ان جھگڑوں سے قطع نظر کرکے میں گیتا کی تعلیم مختصراً قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

گیتا کی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ ایک فلسفیانہ۔ دوسرا مذہبی۔

فلسفیانہ حصہ میں خدا۔ روح اور جسم کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

حقیقت خدا

گیتا کا روجود خداوندی کی تین صورتیں بیان کرتا ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ خدا نرگن (تمام اوصاف و خواص سے معرا یعنی وجود محض) ہے اور کوئی فعل اُس سے صادر نہیں ہو سکتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خدا سارے عالم کا پیدا کرنے والا۔ قائم رکھنے والا اور نیست کردینے والا ہے۔ اور عالم کا ہر جزو اس کے اندر ہے اور وہ عالم کے ہر جزو میں ہے۔ وہ سب سے اعلیٰ۔ برتر اور ہمہ گیر ہستی ہے جس کے اندر تمام ہستیوں کا وجود ہے اور وہ تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ ہر شے اُس میں ہے اور وہ ہر شے میں ہے۔ وہی نگاہ حقیقت بیں ہے جو اُس مالک کل کو موجودات کے ہر فرد میں یکساں طور پر موجود دیکھے۔

یہ عالم جس کو خدا نے پیدا کیا ہے چار قسم کے موجودات پر مشتمل ہے:۔

(الف) قوائے دماغیہ:۔

(۱) بُدھی (یعنی قوت فیصلہ)

(۲) اہنکار (یعنی احساس خودی)

(۳) مَن (یعنی قوت فکریہ)

(۴) حواس خمسہ علمیہ اور حواس خمسہ عملیہ

(ب) کوائف دماغی مثلاً خواہش۔ حظ۔ کرب وغیرہ

(ج) حواس علیہ کے محسوسات یعنی صورت - ذائقہ - بو - لمس - اور صوت - اور
(د) عالم مادی جو خاک - باد - آب - نور - اور بسط سے مرکب ہے۔
یہ تمام عالم جو خدا کا مخلوق ہے بحیثیت مجموعی پراکرتی یا شیتر یعنی جسد خداوندی کہلاتا ہے۔
اس پراکرتی کے علاوہ ایک اور پراکرتی ہے جس کا تعلق خدا سے ہے۔ اس کو اُویکتا۔ یا مول پراکرتی یا پرادھنا کہتے ہیں۔ اس (یعنی مول) پراکرتی کو ماننے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ گیتا کار کے قول کے مطابق خدا یا برہما خود نرگن ہے اور نہ تو عالم کو پیدا کر سکتا ہے نہ قائم رکھ سکتا یا مٹا سکتا ہے۔ لہٰذا اُس سے افعال صادر کرانے کے لیے ایک دوسری ہستی کی ضرورت ہوئی اور وہ مول پراکرتی یا پرادھنا ہے۔ جب اس سے وہ متصادم ہوتا ہے تو خالق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ برہما کہتا ہے۔ "اپنی پراکرتی پر قابو حاصل کرکے میں ان تمام ہستیوں کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہوں۔" "پراکرتی میرے ذریعہ سے تمام متحرک اور غیر متحرک اشیاء کو پیدا کرتی ہے۔" "مہت برہما (یعنی مول پراکرتی) میرے لیے رحم کا کام دیتی ہے جس میں میں بیج ڈال دیتا ہوں اور اُس سے تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔"
اسی طرح۔ گویہ کہا گیا ہے کہ خدا یا برہما اِس عالم کو نیست کر دینے اور مٹا دینے والا ہے۔ نیستی اور بربادی سے مراد تمام موجودات کا مول پراکرتی میں جذب ہو جانا ہے۔
پس مول پراکرتی کی عدم موجودگی میں تخلیق و تخریب دونوں برہما کے لیے ناممکن ہے۔
اس دوسری صورت میں خدا سب کا دوست ہے۔ یا تمام مخلوقات کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہے۔ نہ کسی سے نفرت کرتا ہے۔ نہ کسی سے محبت۔ وہ توبہ کو قبول کرتا ہے اور معافی دینے والا ہے اور قربانیوں سے خوش ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام موجودات اور تمام کائنات کا مالک ہے وہ کرتو ہے۔ سوادہ ہے۔ جھاڑیوں کا پھول اور پھل ہے۔ مقدس کتاب ہے۔ اگنی ہے۔ قربانی ہے۔ اس عالم کی ماتا۔ پتا۔ خالق اور مالک ہے۔ اُوم ہے منتہائے نظر ہے۔ نگہبان ہے۔ قیامگاہ ہے۔

جائے پناہ ہے۔ دوست ہے۔ وسیلہ ہے۔ حیات ابدی بھی ہے اور موت بھی۔ موجود بھی۔
اور معدوم بھی۔

وجود خداوندی کی تیسری نوعیت یہ ہے کہ بسا اوقات وہ اپنے کو انسانی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے "گو کہ میں کسی سے پیدا نہیں ہوا ہوں اور لافنا ہی ہوں اور تمام موجودات کا مالک ہوں تاہم میں اپنی پراکرتی کو قابو میں لاتا ہوں اور اپنے مایا کے ذریعہ سے پیدا ہوں"۔ جب کبھی تقویٰ اور پرہیزگاری روبہ انحطاط ہوتی ہے اور فسق و فجور میں ترقی ہوتی ہے تو میں اپنے کو پیدا کرتا ہوں۔ "میں نیک کرداروں کی حفاظت۔ بدکرداروں کی تباہی اور لوگوں کو متقی بنانے کے لیے ہر زمانہ میں پیدا ہوتا رہتا ہوں"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برہما پراکرتی کے علاوہ مایا بھی رکھتا ہے اور یہاں پر مایا سے مراد وہ صفت خداوندی ہے جو اُس کو پیدا ہونے کے قابل بناتی ہے۔ گو حقیقتاً وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ہے مگر مایا کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اپنی اصلیت اور حقیقت سے مختلف نظر آتا ہے ایک دوسرے موقع پر برہما کی اصلی شان میں بظاہر فرق پیدا کرنے والی چیز کو بجائے مایا کے یوگ کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ برہما کہتا ہے "سارے عالم میں غیر محسوس طریقہ پر حاوی و ساری تمام ہستیاں مجھ میں ہیں لیکن میں اُن میں نہیں ہوں اور پھر بھی تمام ہستیاں مجھ میں نہیں ہیں میرے یوگ کو دیکھو"۔ یعنی اصل میں برہما ہر شے میں ہے اور ہر شے اُس میں ہے۔ وہ ساری کائنات میں ہے اور ساری کائنات اُس میں ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ میرے یوگ کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "تمام ہستیاں مجھ میں ہیں مگر میں اُن میں نہیں ہوں" اور کبھی ایسا بھی نظر آتا ہے کہ "یہ ہستیاں بھی مجھ میں نہیں ہیں"۔ چنانچہ ایک جگہ گیتا کار کہتا ہے کہ "برہما یوگ مایا کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اُس کا علم نہیں ہو سکتا۔ الغرض۔ خدا ہر اُس شے کو جانتا ہے جو موجود ہے۔ یا موجود رہی ہے یا آیندہ وجود میں آنیوالی ہے۔ اُس سے برتر کوئی ہستی نہیں۔ وہ پانی میں پانی کا مزہ ہے۔ وہ آفتاب اور ماہتاب کی

روشنی ہے۔ ویدوں میں "اوم" ہے۔ بسط میں صوت ہے۔ اور جو انسانیت میں انسانیت ہے۔ زمین میں وہ خوشبو ہے۔ آگ میں آگ کی لپٹ ہے۔ تمام موجودات کی زندگی ہے اور ہر شے کا ازلی اور ابدی بیج ہے وہ قوت ہے جس کے ساتھ صاحب قوت کی طرح تمنائیں اور خواہشیں وابستہ نہیں ہیں۔ وہ محبت ہے جو تقوے کے مخالف نہیں ہے۔ نیکی۔ تاریکی۔ جذبہ حیوانی سب اُسی سے ہے۔ وہ ان میں نہیں ہے۔ لیکن یہ سب اُس میں ہیں جو کچھ ہم دیکھتے یا سنتے ہیں ان سب سے جدا ایک غیر محسوس ازلی ہستی ہے جو دائم قائم ہے۔ تمام ہستیاں برباد ہو جاتی ہیں مگر وہ برباد نہیں ہوتی۔ وہی ہر شے کی ابتدا ہے اور انتہا اُس کی صورتیں بے شمار ہیں۔ نہ اُس کی ابتدا ہے۔ نہ انتہا۔ نہ اُس کو موجود کہہ سکتے ہیں۔ نہ معدوم۔ اُس کے ہر طرف ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھیں۔ سر۔ چہرہ اور کان ہیں اور وہ دنیا کی ہر چیز میں ہے۔ وہ تمام حواس کی صفات سے متصف ہے۔ پھر بھی تمام حواس سے معرا ہے۔ وہ بے تعلق ہے۔ تاہم سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ تمام اوصاف سے خالی ہے۔ پھر بھی اوصاف سے محظوظ ہوتا ہے۔ وہ ہر شے کے اندر ہے اور ہر شے سے باہر۔ متحرک بھی ہے اور غیر متحرک بھی۔ اُس کے وجود کی نزاکت و لطافت اُس کے علم کی مانع ہے۔ وہ نزدیک بھی ہے۔ اور دور بھی۔ وہ مختلف چیزوں میں مختلف نہیں ہے۔ البتہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہی ساری کائنات کا سنبھالنے والا اور ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور پھر سب کچھ اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔ وہ روشن اجسام کی روشنی سے پرے ہے۔ وہ علم ہے۔ مقصود علم ہے۔ حامل علم ہے اور سب کے دل میں ہے۔

حقیقت روح

آتما یا روح انسانی اور چیزوں کی طرح خدا کی مخلوق نہیں ہے۔ بلکہ ہر انسان کی آتما خدا کا ایک جزو ہے۔ (جزو کا لفظ محض استعارۃً استعمال کیا گیا ہے) جب تک آتما کا تعلق جسم اور حواس سے رہتا ہے اُس تک اُس کو جیو کہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کو ایشور یا مالک بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جسم و حواس پر حکومت کرتی ہے۔ جب آتما جسم اور حواس کو چھوڑتی ہے تو حواس اور

قوائے دماغیہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ جس طرح ہوا خوشبو اُڑا لے جاتی ہے۔ آتما یعنی اصلی روح انسانی کو پُرش بھی کہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وجود خداوندی کی جو تین صورتیں بیان کی گئی ہیں اُن میں سے روح انسانی کس کا جزو ہے؟ اس کا جواب گیتا کار یہ دیتا ہے کہ روح انسانی وجود خداوندی کی پہلی صورت کا جزو ہے۔ اگر ہم کسی فرد انسانی میں سے جسم اور تمام جسمانی افعال و خواص علیحدہ کر دیں تو آتما یا پُرش ہی باقی رہ جاتا ہے اور وہی روح انسانی کی اصلی حالت ہے۔ اور جسم کے اندر بھی یہی حالت قائم رہتی ہے اس لیے کہ روح میں تغیر نہیں ہوتا اور یہی وہ حالت ہے جس کو روح مکتی یا آخری آزادی حاصل کرنے پر "اپنی اصلی حالت" کی حیثیت سے معلوم اور محسوس کرے گی۔ پس جبکہ آتما وہی ہے جو جسم اور تمام جسمانی افعال و خواص مثلاً بدی۔ انہکار۔ من۔ جنانا اندریاں (حواس علیہ) کرم اندریاں (حواس علیہ)۔ خواہش۔ خوشی۔ نفرت۔ حظ۔ کرب وغیرہ کے علیحدہ کر لینے پر بچ جاتا ہے تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ روح انسانی کی اصلی حالت یعنی آتما یا پُرش وجود خداوندی کی پہلی نوعیت کی طرح نرگن اور کرتا ہے۔

چونکہ آتما اور خدا یا برہما کی حقیقت ایک ہے اس لیے آتما بھی کسی سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ نہ مر وہ یا معدوم ہو سکتی ہے۔

آتما کے لیے جسم سے قطعی طور پر رہائی حاصل کر لینا (جس کو مکتی کہتے ہیں) بہت ضروری ہے مگر موت کے ذریعہ سے یہ ممکن نہیں۔ آتما کو جسم سے قطعی طور پر چھٹکارا اُسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جبکہ اپنا اور خدا کا اور اپنے اور خدا کے تعلقات کا پورا گمان یا علم ہو جائے اور یہ علم کرم جوگ بھگتی اور ابھیاس جوگ پر (جن کا ذکر آئندہ عرض کیا جائے گا) عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ موت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آتما۔ پراکرتی یا جسم سے قطعی طور پر آزاد ہو جاتی ہے بلکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آتما ایک پراکرتی سے دوسری پراکرتی میں چلی جاتی ہے۔ جس طرح ہم جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہوتے ہیں یا پُرانے کپڑے پھینک کر نئے کپڑے پہن

لیتے ہیں۔

چونکہ آتما اور حقیقت خداوندی میں عینیت ہے اس لیے آتما ماری نہیں جاسکتی اور چونکہ وہ نرگن اور کرتا ہے اس لیے خود کسی کو مار بھی نہیں سکتی۔ چنانچہ گیتا کار کہتا ہے "جو یہ خیال کرتا ہے کہ آتما مار سکتی ہے اور جو یہ خیال کرتا ہے کہ آتما ماری جاسکتی ہے۔ وہ دونوں کچھ نہیں جانتے۔ آتما نہ کسی کو مارتی ہے۔ نہ خود ماری جاسکتی ہے۔"

اس سے صاف اور لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر انسان کی آتما جو اس وقت موجود ہے۔ ازلی اور ابدی ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ جیسا کہ گیتا کار کہتا ہے۔ "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نہ رہا ہوں۔ یا تم نہ رہے ہو۔ یا یہ لوگ نہ رہے ہوں جو انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اور نہ آیندہ کبھی ایسا ہوگا کہ ہم میں کسی کا وجود مٹ جائے۔" انسان میں جو شے خراب و برباد ہونیوالی ہے وہ اُس کی پراکرتی یا جسم ہے۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے کہ جسم کی خرابی و بربادی کے ساتھ ساتھ آتما بھی خراب و برباد ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جبکہ آتما جسم کے اندر موجود ہوتی ہے اُس وقت بھی وہ جسمانی نقصانات سے متاثر نہیں ہوتی۔ جسم کو کچھ نہ کچھ تکلیف۔ کرب یا بے چینی ہو آتما پر اُس کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔ بقول گیتا کار کے کہ کوئی ہتیار اُس کے کاٹ کا نہیں ہوسکتا آگ اُس کو جلا نہیں سکتی۔ پانی اُس کو تر نہیں کرسکتا۔ ہَوا اُس کو خشک نہیں کرسکتی۔"

اس کے علاوہ آتما ہمہ گیر ہے اور سب میں جاری وساری ہے۔ یہ تغیر پذیر نہیں ہے۔ اس کا وجود محسوسات سے بالاتر ہے۔ اس کو خیال میں لانا محال ہے۔

حقیقت جسم

پراکرتی یا دیہہ یا قالب انسانی مخلوق اور تغیر پذیر ہے اور تباہ و برباد ہونے والی شے ہے۔ تمام افعال انسانی کی فاعل بھی ہے۔ آتما کرتا ہے۔ اُس کو افعال انسانی میں کوئی دخل نہیں۔ قالب انسانی میں رہ کر اُس کا صرف یہ کام ہے کہ پراکرتی کے افعال انسانی اُٹھائے نیز اُس کے تمام اوصاف و خواص سے محظوظ ہو۔ خواس خمسہ پر اُس کی حکومت ہوتی ہے اور

وہ تمام محسوسات کے لطف سے بہرہ اندوز ہوتی ہے۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آتما اپنی حقیقت سے ناواقف کیوں ہوتی ہے؟ اور باوجود نرگن اور اکرتا ہونے اور شان الوہیت رکھنے کے قالب انسانی میں (جس کو گیتا کار بُرائی سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے قطعی طور پر چھٹکارا حاصل کر لینا آتما کے لیے ازبس ضروری ہے) پھنستی کیوں ہے؟ اور دوسرے (پراکرتی) کے اعمال کا خمیازہ کیوں بھگتی ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں بجائے کسی دلیل کے گیتا کار صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہے۔ وہ یہ کہ جوں ہی آتما قالب انسانی میں داخل ہوتی ہے۔ اُس کی نیز دوسری چیزوں کی حقیقت کا علم اس سے پوشیدہ ہو جاتا ہے اور صرف گیتا کے بتائے ہوئے طریقۂ عمل پر کاربند ہونے سے یہ علم حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ ہم نے اوپر سوال کیا ہے) اگر جہالت۔ انسانی قالب میں داخل ہونے کا لازمی نتیجہ ہے تو آتما اُس میں داخل ہی کیوں ہوتی ہے؟ اس کے جواب میں گیتا کار کہتا ہے کہ آتما قالب انسانی میں اس وجہ سے آئی کہ پچھلی زندگی میں اُس کو اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی اور تعلق تھا۔ اور پچھلی زندگی میں اس وجہ سے جسم اختیار کرنا پڑا تھا اُس سے پہلے کے جنم میں اُس کو اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی تھی۔ اور یہی سلسلہ برابر جاری ہے۔ جسم سے ہمیشہ کے لیے اُسی وقت رہائی مل سکتی ہے جبکہ کرم جوگ بھگتی کے مطابق عمل کیا جائے۔ جہاں آتما کو ایک بار اپنا اور خدا کا اور اپنے اور خدا کے باہمی تعلقات کا علم ہوا پھر اُس کی جہالت اور اعمال سے وابستگی ہمیشہ کے لیے جاتی رہے گی اور جب یہ حالت حاصل ہو جائیگی تو اُس کو جسم اختیار کرنا پڑیگا اور ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائے گی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو آتما اس وقت جسم کے اندر موجود ہے وہ ہمیشہ سے جاہل چلی آرہی ہے اور معلوم نہیں کتنے قالبوں سے گزر کر موجودہ قالب میں آئی ہے۔ مگر یہ سلسلہ لا متناہی نہیں ہے۔ کرم جوگ بھگتی پر عمل کرنے سے اس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

اب ہم کو اپنے تیسرے سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔ کہ دوسرے کے اعمال کا بھوگ آتما کو کیوں اُٹھانا پڑتا ہے؟ اس سوال کا جواب گیتا کار یہ دیتا ہے کہ گو آتما اصلی فاعل نہیں ہے لیکن اپنی

فطری جہالت کے باعث پراکرتی کے تمام افعال اور اعمال کو غلطی سے اپنے افعال اور اعمال سمجھتی ہے۔ اس غلط فہمی کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو (پراکرتی کے) تمام اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے اُس کو اُن کا بھوگ اُٹھانا پڑتا ہے۔ اور اُس وقت تک بھوگ اُٹھاتی رہیگی جب تک کہ کرم جوگ بھگتی پر کما حقہ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اگر جسم میں آتما کی گرفتاری پچھلی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ گرفتاری عمل میں کیونکر آتی ہے اور آتما جسم میں پھنستی کس طرح ہے؟ گیتا کا رکہتا ہے کہ پراکرتی کے تین گن یا خواص ہیں۔ ستو۔ راجو اور تامو۔ انہی گن رسی کا کام دیتے ہیں جس سے گویا آتما جسم بندھی ہوتی ہے۔ اور جیوں ہی ترگن آتما۔ گنوں سے متصادم ہوتی ہے بڑے بڑے نتائج ترتیب ہونے شروع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ستوگن سے متصادم ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آتما کا رجحان انبساط اور علم کی طرف ہوتا ہے۔ راجو گن سے متصادم ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آتما کو حرص۔ خواہش۔ بے اطمینانی وغیرہ سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ تاموگن سے متصادم ہونے پر آتما۔ لاپروائی۔ سستی۔ خواب وغیرہ کی طرف مائل ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ تینوں گن ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں۔ مگر مساوی درجہ پر نہیں۔ کسی میں ستوگن زیادہ ہوتا ہے۔ بقیہ دو گن کم ہوتے ہیں۔ کسی میں تاموگن کی زیادتی ہوتی ہے۔ اور کسی میں راجوگن کی۔ یہ کمی بیشی ہر شخص کے پچھلے جنم کے طرز زندگی پر منحصر ہے۔ اور ہر شخص کے فرائض اُس گن کے مطابق ہوتے ہیں جس کی اُس میں زیادتی ہوتی ہے۔

اِن تینوں گنوں کو بحیثیت مجموعی مایا بھی کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں میں نے گیتا کی فلسفیانہ تعلیم (بالاجمال اور بالاختصار) بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر گیتا کی خصوصیت اس کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ اس کی مذہبی تعلیم ہے۔ اس کا وہ حصہ جس میں روح۔ خدا۔ اور جسم کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے صرف مذہبی تعلیم کو قوی اور بارآور بنانے کے لیے ہے۔ جب تک انسان کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ روح۔ جسم اور خدا کیا ہے اور ان کے تعلقات کیا ہیں اور جو معیار زندگی یا نصب العین مذہب اس کے سامنے پیش کرتا ہے

اُس کی حقیقت کیا ہی۔ اُس وقت تک مذہبی تعلیم بے سود ہی۔ اس لیے کہ اُس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ نہ اُس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو سکتا ہی۔
گیتا کی مذہبی تعلیم کرم جوگ بھگتی اور ابھیاس جوگ پر مشتمل ہی۔ جس کے ذریعہ سے آتما ہمیشہ کے لیے جسم سے آزاد ہو سکتی ہی اور انسان مکتی اور حیات ابدی حاصل کر سکتا ہی۔
اس وقت (مع تنقید) انشاء اللہ آیندہ قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

سید کامل حسین ایم۔ اے

تاریخ صلح لوزان کانفرنس

در صنعت زبر و بنیات غیر منقوط

(فن تاریخ میں یہ وہ صنعت ہی جس کو غیر معمولی کمال سمجھا گیا ہی۔ سب سے اول بلگرامی نے دربار اودھ میں اس صنعت میں تاریخ پیش کر کے داد علم حاصل کی تھی۔ اس زمانہ میں مرزا طاہر مرادآبادی نے دربار رامپور میں اس کمال کو دکھا کر انعام و اکرام حاصل کیے۔ اب یہ فخر قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی کو حاصل ہی کہ صاحب موصوف نے دربار خلافت کے لیے اس صنعت میں تاریخ پیش کر کے اہل علم و قلم سے داد لی ہی)

حصول کام دل کردہ امام عاصم و کامل
ملک عبد المجید سرور اہل ہمم واصل
وذو ودا ورِ دا ور کرد الہام ناظم را
سر و سالار عصر و اعلم عامل حد دل عادل

۱۳۴۱ھ

پیامِ مشرق

ڈاکٹر اقبال کا یہ تازہ دیوان میں نے پڑھا۔ مجھے اس سے جو حظ اور لطف حاصل ہوا وہ بیان سے باہر ہی۔ لیکن بعض احباب کا اصرار ہی کہ میں اس کو تحریر میں لاؤں۔ اس لیے سرسری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کو نہ تنقید سمجھنا چاہیے نہ تقریظ۔

یہ دیوان جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھا گیا ہی۔ جرمن زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے چونکہ میں گوئٹے سے آشنا نہیں ہوں اس لیے مقابلہ کی جلوہ آرائی کا لطف نہیں اُٹھا سکا۔ لیکن مشرقی شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہی کہ اُس نے مغرب کو مخاطب کیا۔ اور ایشیا کے سینہ کی برقی حرارت یورپ کے برفستان میں پہونچانے کی کوشش کی۔

دیباچہ | شروع میں ایک چھوٹا سا دیباچہ ہی جس میں گوئٹے کی شاعری میں جو مشرقی رنگ ہی اس کا ذکر کیا ہی۔ اسی ذیل میں جرمن ادبیات پر عجمی شاعری کا جو اثر پڑا ہی اس کی نہایت مختصر تاریخ لکھی ہی۔ یہ مضمون مفید اور پُر از معلومات ہی۔ اگرچہ اگا نہ بسط کے ساتھ لکھا جائے تو نہایت کار آمد ہو۔

دیباچہ بھی بجائے اردو کے اگر فارسی میں ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ کیونکہ سارا دیوان فارسی میں ہی۔

زبان | ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی زبان میں شعر گوئی اختیار کی تو شروع شروع میں ان کی بعض مثنویوں کی زبان پر لوگوں نے اعتراضات کیے۔ لیکن اب اُنھوں نے اپنے ذہنِ وقاد اور طبعِ نقاد سے زبان میں ایسی لطافت اور شستگی پیدا کر لی کہ صائبؔ و نظیری کے رنگ میں آ گئے۔ اس تمام مجموعہ میں زبان کی صفائی اور پختگی اور کلام کی بے ساختگی اور برجستگی پر مشکل سے کہیں انگلی رکھی جا سکتی ہی۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں رہ کر فارسی زبان کو جو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا ہی حقیقت میں اُنھوں نے کوہکنی کی زحمت گوارا کر کے ایشیائی اقوام مسلمہ کے لیے جو بالعموم فارسی سمجھتی ہیں اپنی فائدہ رساں تعلیمات کی ایک جوئے شیر نکالی ہی ورنہ آج یہ نہ کہہ سکتے ؎

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت   عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

لیکن مجھے یقین ہی کہ جب اٹالین اور انگریزی وغیرہ مغربی زبانوں میں کلام اقبال کے ترجمے

ہوئے ہیں تو اہل مصر جو اس معاملہ میں یورپ کے کسی ملک سے پیچھے نہیں ہیں اور جنھوں نے ٹگور تک کا ترجمہ عربی میں کر لیا ہے اس اپنی بضاعت علیہ کو بلا عربی میں منتقل کیے ہوئے نہیں رہیں گے۔

شاعری | بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ شاعری وہی اچھی ہوتی ہے جو زمانہ جہالت میں ہوتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک ع

دُکانِ عاشقی رابسیار مایہ باید

بے شک جاہلی شاعری کی زبان میں سادگی اور طرز ادا میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ لیکن شعر کی خوبی انھیں چیزوں پر محدود نہیں ہے بلکہ ان کے سوا اس میں معنوی خوبیاں بھی ہوتی ہیں جو زیادہ قدر کے قابل ہیں۔ اور یہ بلا علم کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

بافہم و عقل و دانش داد سخن تواں داد ‌ ‌ ‌ چوں جمع شد معانی گوئے بیاں تواں زد

ذوقِ صحیح جذبات عالیہ کی اُن لطیف تحریکات پر وجد کرتا ہے جن سے دل کے تار بجتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری اہل فہم کی دماغی راحت اور روحانی لذت کے لیے ایک میوۂ پُر مایہ ہو گئی ہے۔ کیونکہ وہ علوم دینی و دنیوی اور مشرقی و مغربی کے مجمع البحرین ہیں۔ ذوق صحیح۔ دلِ درد مند اور طلاقت لسانی رکھتے ہیں۔ ان کی چشم بصیرت انسانی خیالات کی انتہائی بلندیوں پر پہونچی ہوئی ہے۔ اور ان کے دیدۂ تخیل کے سامنے زمین سے آسماں تک کے پردے اُٹھے ہوئے ہیں۔ وہ عرش کے پایوں میں جھولتے ہیں۔ مرغانِ اولی اجنحہ کے ساتھ اُڑتے ہیں۔ ساکنانِ حرمِ قدس سے ملتے ہیں۔ بزم انجم و کواکب کے رموز سنتے ہیں۔ شبنم اور آفتاب کے باہمی راز۔ گل و بلبل کے ناز و نیاز اور پروانہ و شمع کے سوز و ساز سے آشنا ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں برق کی موجیں۔ سمندروں کی موجوں میں زندگی کی لہریں۔ قطرۂ اشک میں سوزشِ دل کا تب و تاب اور دانۂ گوہر میں حیات معنوی کی آب دیکھتے ہیں۔

غرض عالمستان معنی ہے جس کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سے جواہر پارے چنتے ہیں اور جذباتِ علیہ و دینیہ کا پیکرستاں تیار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس قدر تیز بیں ہے کہ ایک ہی چیز پر نہیں رُکتی

بلکہ تلمیح سے اسباب اور اسباب سے متعلقات پر بلندی سے پستی تک اور خشکی سے تری تک ایک ساتھ دوڑ جاتی ہے۔

تہدیہ کتاب کو کسی کے نام سے معنون کر دینا ایک عام رسم ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس کا موقع صرف وہ ہے جبکہ کتاب کے مقصد کو اس سے مدد مل سکے۔ ورنہ اہل نظر اس کو کتاب کی خواری اور مصنف کی سبکساری کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اس سے پیشتر ڈاکٹر صاحب کی ایک مثنوی کا تہدیہ میری نظر سے گزرا تھا۔ جس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہو گئی تھی کہ اللہ اکبر۔ اسرار خودی کی تعلیم۔ اور اس پر یہ بیخودی ؎

چو روئے خویش در آئینہ می توانی دید   چرا نظر بجمال کسے دگر داری

مگر یہ تو خود اللہ تعالے نے شاعروں کے حق میں فرما دیا ہے کہ "یقولون مالا یفعلون"
شکر ہے کہ اس دیوان کے بارے میں مجھے یہ شکایت نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں انھوں نے کسی شخص کو نہیں بلکہ درحقیقت ایک قوت کو خطاب کیا ہے۔ جو اُن تعلیمات کی جو اس کتاب میں دی گئی ہیں صحیح مخاطب ہے۔ یعنی امیر امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان۔

خطاب کا مضمون اور انداز نہایت دلکش اور بلیغ ہے۔ عالم اسلامی کی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ صرف چند شعروں میں کھینچ دیا ہے۔

دیدۂ اے خسروِ کیواں جناب   آفتاب ما توارت بالحجاب
ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت   از دم او سوز الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گرداب نیل   سست رگ تورانیان ژندہ پیل
آلِ عثماں در شکنجِ روزگار   مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئین سلمانی نماند   خاکِ ایراں ماند و ایرانی نماند
سوز و ساز زندگی رفت از گلش   آں کہن آتش فسردا اندر دلش
مسلم ہندی شکم را بندۂ   خود فروشے دل ز دیں برکندۂ

در مسلماں شانِ محبوبی نماند — خالد و فاروق و ایوبی نماند

درخواست یہ ہے۔

اے ترا فطرت ضمیر پاک داد — از غم دین سینۂ صد چاک داد

جانِ تو بر محنتِ پیہم صبور — کوشش در تہذیب افغانِ غیور

تا ز صدیقانِ ایں امت شوی — بہر دیں سرمایۂ قوت شوی

لالۂ طور دیوان کا پہلا جز ہے۔ اس میں ۱۵۵ رباعیاں ہیں جو ایک ہی وزن پر ہیں۔ یہ فلسفہ زندگی کے اسرار اور معدنِ حکمت کے گوہر ہائے آبدار ہیں۔ دو چار درج کرتا ہوں۔

دلِ من روشن از سوزِ درون است — جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است

ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد — کسے کو عشق را گوید جنون است

دمادم نقشہائے تازہ ریزد — بیک صورت قرارِ زندگی نیست

اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است — بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

مگو کارِ جہاں نااستوار است — ہر آنِ ما ابد را پردہ دار است

بگیر امروز را محکم کہ فردا — ہنوز اندر ضمیرِ روزگار است

رمیدی از خداوندانِ افرنگ — ولے بر گور و گنبد سجدہ پاشی

بہ لالائی چناں عادت گرفتی — ز سنگِ راہ مولائے تراشی

افکار دیوان کا دوسرا جز کم و بیش ۱۴۰ صفحہ ہے۔ اس میں قطعات اور مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں۔ ہلالِ عید کے متعلق کہتے ہیں۔

نتواں ز چشمِ شوق رمید اے ہلالِ عید — از صد نگہ براہِ تو دامے نہادہ اند

برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج   در سینۂ تو ماہِ تمامے نہادہ اند

تسخیر فطرت کے عنوان سے ابلیس و آدم کا جو قصہ لکھا ہی اس کا پرواز نہایت شاندار ہی۔ سجدہ سے انکار کے وقت ابلیس کا متکبرانہ لہجہ اس کی تعلّی کی کیسی عجیب تصویر ہی۔

نوری نادان نیم۔ سجدہ بآدم برم   او بہ نہاد است خاک۔ من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوز من۔ خونِ رگِ کائنات   من بہ دو صرصرم۔ من بہ غو تندرم
من ز تنک مایگاں گدیۂ نکردم سجود   قاہرِ بے دوزخم۔ داورِ بے محشرم

آدم ایک نافرماں لڑکے کی طرح جو باپ کے گھر سے نکلنے پر آزادی کا سانس لیتا ہی جنت سے خارج ہو کر خوشی کا راگ گاتا ہی۔ یہ راگ نہایت دلفریب ہی۔ خاصکر یہ شعر

بگداز ہاے پنہاں۔ بہ نیاز ہاے پیدا   نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن

لیکن صبح قیامت کو جناب باری میں اس کا یہ جواب

بستنِ زنّار او بود مرا ناگریز   تاشود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز
عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمن شعلہ زاد۔ سجدہ کند خاک را

مبہم ہی۔ اس کے سمجھنے سے میں قاصر رہا۔ کیونکہ ابلیس کی تعبیر فطرت کے ساتھ کسی طرح قرآن سے مطابقت نہیں کھاتی۔ اس جواب کا دوسرا شعر۔

ریخت ہنرہائے من بحر بیک نائے آب   تیشۂ من آورد از جگرِ خارہ شیر

کسی قدر فصاحت سے گر گیا۔ کیونکہ گو جائز سہی لیکن بہرصورت ماضی اور مضارع کا تقابل ناہموار ہی۔ بوئے گل کی حقیقت پر شاعرانہ تخیل کی لطافت قابل دید ہی۔

حورے بکنجِ گلشنِ جنت تپید و گفت   مارا کسے از آنسوئے گردوں خبر نداد
ناید بفہمِ من سحر و شام و روز و شب   عقلم ربود اینکہ بگویند مُرد و زاد
گردید موجِ نکہت و از شاخِ گل دمید   پا اینچنیں بعالمِ فرداوے نہاد

واکرد چشم و غنچہ شد و خندہ زد دمے　　گل گشت و برگ برگ شد و بر زمیں فتاد
زندانئے کہ بند ز پائش کشادہ اند
آبے گذاشتست کہ بو نام دادہ اند

لیکن پہلے مصرع میں تپید کا لفظ برمحل نہیں واقع ہوا۔ کیونکہ بے خبری تو وجہ تپش نہیں ہو سکتی۔ اور آخری مصرع میں "آبے گذاشتست" مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کو دوسرے لفظ سے ادا کرتے تو بہتر تھا۔

شاہین و ماہی کی گفتگو کس قدر ترانہ انگیز لہجہ میں لکھی ہے۔

ماہی بچۂ شوخ بشاہیں بچہ گفت　　ایں سلسلۂ موج کہ بینی ہمہ دریاست
دارائے نہنگان خروشندہ تر از میغ　　در سینۂ او دیدہ و نادیدہ بلاہاست
با سیل گراں سنگ زمیں گیر و سبک خیز　　با گوہر تابندہ و با لولوئے لالاست
بیروں نتواں رفت ز سیل ہمہ گیرش　　بالائے سر ماست۔ تہ پاست۔ ہمہ جاست
ہر لحظہ جوان است و روان است و دوان است　　از گردش ایام نہ افزوں شد و نے کاست
ماہی بچہ را سوز سخن چہرہ برافروخت　　شاہیں بچہ خندید و ز ساحل بہ ہوا خاست
زد بانگ کہ شاہینم و کارم بہ زمیں چیست　　صحراست کہ دریاست تہ بال و پر ماست
بگذر ز سر آب و بہنائے ہوا ساز
ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بیناست

مئے باقی　یہ تیسرا جز بھی کم و بیش چالیس صفحوں کا ہے۔ اس میں غزلیں ہیں جن کی زبان کی سلاست ترنم ریز اور معنوی لطافت وجد انگیز ہے دو ایک نمونتاً درج کرتا ہوں۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر　　رست از یک بند تا افتادہ در بندے دگر
بر سر بام آ نقاب از چہرہ بے باکانہ کش　　نیست در کوئے تو چوں من آرزومندے دگر
بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش　　از نگہ بافم بر خسار تو روبندے دگر

یک نگہ، یک خندهٔ دزدیده، یک تابنده اشک — بهرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر
عشق را نازم که از بے تابیِ روزِ فراق — جانِ ما را بست با دردِ تو پیوندے دگر
تا شوی بے باک تر در ناله اے مرغِ بہار — آتشے گیر از حریمِ سینه ام چندے دگر
رہ مده در کعبه اے پیرِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے — که جہاں تواں گرفتن به نوائے دلگدازے
بمتاعِ خود چه نازی که بشہرِ دردمنداں — دلِ غزنوی نیرزد به تبسّمِ ایازے
همه نازِ بے نیازی همه سازِ بے نوائی — دلِ شاه لرزه گیرد ز گدائے بے نیازے
ز مقامِ من چه پرسی به طلسمِ دل اسیرم — نه نشیبِ من نشیبے نه فرازِ من فرازے
ره عاقلی رہا کن که بَاو تواں رسیدن — بدلِ نیازمندے به نگاهِ پاکبازے
به رهِ تو ناتمامم ز تغافلِ تو خامم — منِ و جانِ نیم سوزے تو و چشمِ نیم بازے
رهِ دیر تختهٔ گل ز جبینِ سجده ریزم — که نیازِ من نگنجد به دو رکعتِ نمازے
ز ستیزِ آشنایاں چه نیاز و ناز خیزد
دلکے بهانه سوزے نگہے بهانه سازے

ز خاکِ خویش طلب آتشے که پیدا نیست — تجلّیِ دگرے درخورِ تقاضا نیست
اگرچه عقلِ فسوں پیشه لشکرے انگیخت — تو دل گرفته نباشی که عشق تنہا نیست
تو ره شناس نئی و ز مقام بے خبری — چه نغمه ایست که در بربطِ سلیمیٰ نیست
نظر بخویش چناں بسته ام که جلوهٔ دوست — جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست
بیا که غلغله در شہرِ دلبراں فگنیم — جنونِ زنده دلاں ہرزه گردِ صحرا نیست
ز قید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور — مگو که زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
مریدِ ہمتِ آں رہروم که پا نگذاشت — به جادهٔ که درو کوه و دشت و دریا نیست

شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش — حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

ایک غزل میں ایک شعر کیا بلند حوصلگی کا کہا ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

مولانا روم نے بھی فرمایا ہے ؎

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

لیکن شاعرانہ خیالات کا تضاد احسنِ تقویم اور اسفل سافلین کا کیسا صحیح منظر پیش کرتا ہے۔ کہ کہاں آدمِ خاکی کا یہ جوش و خروش اور کہاں وہ نگاہ میں اس قدر حقیر کہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار — لعبتِ خاک ساختن می نسزد خدائے را

نقشِ فرنگ: یہ چوتھا جزو ۴۰ صفحہ سے کچھ کم ہے۔ اس میں اہلِ مغرب کے خیالات اور ان کے متعلق رائیں ہیں۔ ان مضامین سے ایشیائی شاعری اب تک قطعاً روشناس نہ تھی۔ آغاز اس پیام سے ہوتا ہے۔

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند — عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ — آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری — عجب آنست کہ بیمارِ تو بیمار تر است
علم و حکمت اگرش خوئے سگی باز دہد — آدمی زادۂ دانا ز دَداں خوار تر است
خواجہ را قیمتِ عیش است اگر مزدِ غلام — بندہ آزاد تر و خواجہ گرفتار تر است

رفتگانِ عالمِ بالا کی صحبت بھی نہایت دلچسپ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی حکماء نے وہاں جا کر

سیاسی مذاکرے شروع کرتے ہیں
روس کا مشہور حکیم ٹالسٹائے کہتا ہی

بارکشِ اہرمن لشکر بے شہریار ۔۔۔ از پئے تانِ جویں تیغ ستم برکشید
زشت بجنبش نکوست۔ مغز ندا اندر پوست ۔۔۔ مردکِ بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید
دارویِ بیہوشی است تاج۔ کلیسا۔ وطن ۔۔۔ جانِ خدا دادِ را خواجہ بجامے خرید

مزدک ایران کے اباحیہ مذہب کا پیشوا اپنی تعلیم کو کامیاب دیکھ کر خوش ہوتا ہی۔

دانۂ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بردمید ۔۔۔ مرگِ نو میر قصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل ۔۔۔ تا تہی گردد حرمہا از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز ۔۔۔ نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

"کشتۂ پرویز" ناکام گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب کوہکن بھی اس مجلس میں شامل ہی۔ وہ کہتا ہی۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است ۔۔۔ ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم ۔۔۔ زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد ۔۔۔ ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ایک نظم میخانۂ فرنگ کی یاد میں ہی۔ اس میں کہتے ہیں۔

حشمِ مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار ۔۔۔ بادہ خوارا نرا نگاہِ ساقیش پیغمبر است

یہی وہ جرم ہی جس پر ملا شیدا غریب شاہجہانی علماء کے فتووں کی بنیاد پر دہلی سے نکالا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

چیست دانی بادۂ گلگوں بصفا جوہرے ۔۔۔ حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

مولانا نظامی گنجوی کا یہ قطعہ بہت مشہور ہی اور اکثر ایرانی استادوں نے اس کے جوابات لکھے ہیں۔

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود
می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود

یا نبد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار
یا کہ من ہیچ کسم، ہیچ کسم در نگشود

پاسے از شب بگذشت بیشتر ک یا کمتر
رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود

گفت خیر است دریں وقت کرا میخواہی
بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود

گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوئے
کاندریں وقت کسے بہر کسے در نگشود

ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند
کہ تو دیر آئی و در صف پیش استی زود

ایں خرابات مغانست در و رندانند
شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

ہر چہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر
مومن و برہمن و گبر و نصاریٰ و یہود

گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشاں بزنی
خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

ڈاکٹر صاحب خرابات فرنگ کے عنوان سے اسی نہج پر ایک قطعہ لکھتے ہیں۔

دوش رفتم بتماشائے خرابات فرنگ
شوخ گفتاری رندے دلم از دست ربود

گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی در وے
صحبت دخترک زہرہ وش و نائے و سرود

ایں خرابات فرنگست و ز تاثیر مےش
آنچہ مذموم شمارند نماید محمود

نیک و بد را بترازوئے دگر سنجیدیم
چشمہ داشت ترازوئے نصاریٰ و یہود

خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست
زشت خوب است اگر تاب و توان تو فزود

تو اگر در نگری جز بہ ریا نیست حیات
ہر کہ اندر گرو صدق و صفا بود نبود

دعویٔ صدق و صفا پردۂ ناموس ریاست
پیر ما گفت مس از سیم بباید اندود

فاش گفتم بتو اسرار نہانخانۂ زیست
بکسے باز مگو تا کہ بیابی مقصود

وصل مغربیہ نے جو جمعیت اقوام قائم کی ہے وہ شاعر کو اس شکل میں نظر آتی ہے:

برفند تا روشِ رزم دریں بزم کہن | دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند | بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

دردمندانِ جہاں کا لفظ خاص توجہ کے قابل ہے۔
مولانا وحشی کا یہ قطعہ "برادر و تقسیم نابرابر" مشہور ہے۔

زیبا ترا نچہ ماندہ ز بابا از آنِ تو | بدلے برادر از منِ اعلیٰ از آنِ تو
ایں طاسِ خامی از من و آں کوزۂ کہ بود | یا رینہ پُر ز شہد مصفّا از آنِ تو
یا بوئے ریسماں گسل و میخ کَن زمن | ہمیز کلہ تیز مطلا از آنِ تو
ایں دیگِ لب شکستۂ صابون پزی زمن | واں چمچۂ ہریسہ و حلوا از آنِ تو
ایں اشترِ خموش لگد زن از آنِ من | واں گربۂ مصاحبِ بابا از آنِ تو

از صحنِ خانہ تا لبِ بام از آنِ من
وز بام تا بہ سقفِ ثریا از آنِ تو

اسی لطیف طرز پر ڈاکٹر صاحب نے قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور لکھا ہے۔

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن | گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بر و می نہد زمن | باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابہ کہ دردِ سر آرد از آنِ من | صہبائے پاکِ آدم و حوا از آنِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من | ظلِّ ہما و شہپرِ عنقا از آنِ تو

ایں خاک و انچہ در شکمِ او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلّٰی از آنِ تو

پیغام | عجمی شاعری نے اوّل اوّل حسن و عشق کے گہوارہ اور سلاطین و امرا کی تدا حی کے آغوش میں پرورش پائی۔ کچھ زمانہ کے بعد صوفیانہ خیالات کے بزرگوں نے اس پر تصوف کا رنگ چڑھایا۔ خاصکر مولانائے روم نے اس صور کو اس بلند آہنگی سے

پھونکا کہ شاعری نے حریم دین میں بار پا لیا۔ یہاں تک کہ آج بھی مسجدوں کے منبروں پر سے ان کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اب زمانہ نے دوسری کروٹ بدلی۔ اور امت اسلامیہ غیروں کے پنجۂ تسلط میں پڑ کر مصائب و آلام میں مبتلا ہو گئی۔ اس وجہ سے شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا۔ اور اس کے ساز پر قومی اور وطنی راگ گائے جانے لگے۔ مصر۔ ایران۔ ہندوستان نیز افغانستان ہر جگہ شاعری سے یہ کام لیا جانے لگا۔

ہم ان تمام نغموں کو سنتے ہیں۔ لیکن ان سب میں ڈاکٹر صاحب کی لَے ایک جداگانہ انداز رکھتی ہے۔ وہ دو باتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز نظر آتی ہے۔

(۱) ان قومی شعراء کی نگاہیں اپنی قومی اور ملکی حدود سے باہر کم پہونچتی ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر کل امت اسلامیہ ہے یعنی ان کا خطاب صرف جذبۂ اسلامی سے ہے نہ کہ ایرانی یا تورانی سے۔ اس لیے اوروں کے کلام کو ہم صرف "قومیات" یا "وطنیات" کہہ سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی نظمیں "ملیات" کے لقب کی مستحق ہیں۔

(۲) دوسرے شعراء جذبات عام کو لیکر نظم کا لباس پہناتے ہیں۔ بخلاف اس کے ڈاکٹر صاحب کی طبع خداداد حیات ملیہ کے اسرار خود اخذ کر کے ان کو شاعری کے قالب میں ڈھالتی ہے۔

کسی کا قول ہے۔

اگرچہ شاعران نغز گفتار — زیک جامند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں — خمار چشم ساقی نیز پیوست
مبیں یکساں کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

"چیزے دگر" وہی رموز لطیفہ ہیں جن کو پیغامی شاعر کے سوا کوئی دوسرا نہیں پا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب امت اسلامیہ کے لیے ایک پیغام رکھتے ہیں ان کا یہ دعوےٰ صحیح ہے۔

بخامہ کہ خط زندگی رقم زدہ است — نوشتہ اند پیامے بہ برگ رنگینم

وہ اپنا پیغام بھی صاف ظاہر کرتے ہیں۔

زشاخِ آرزو برخوردہ ام من — بہ رازِ زندگی پے بردہ ام من
بترس از باغباں اے ناوک انداز — کہ پیغامِ بہار آوردہ ام من

ان کے پیغامی شاعر ہونے کے متعلق غالباً آیندہ آنے والے لوگ ہم سے بہتر لکھ سکینگے۔ عجمی شاعری جس نے تصوف کی خدمت گزاری کی اُس میں اور ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں بھی بڑا فرق ہے۔ وہ فنا اور نفس کشی کی تلقین کرتی ہے۔ اور یہ خودی اور زندگی کی۔ وہ تند مزاجوں کو برف بناتی ہے اور یہ افسردہ دلوں کو برق۔

تعلیمات | ڈاکٹر صاحب حسن و عشق کے شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے دل کو اللہ تعالے نے حیاتِ ملیہ کے اسرار سے بھر دیا ہے۔ وہی شیرہ ان کے کلام سے ٹپکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

تا مرا رمزِ حیات آموختند — آتشے در سینہ ام افروختند
یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام — عشق را عہدِ شباب آوردہ ام
آشنائے من زمن بیگانہ رفت — از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم — تختِ کسریٰ زیرِ پاے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن — رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید — آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرتِ من عشق را در بر گرفت — صحبتِ خاشاک و آتش در گرفت
حق رموزِ ملک و دیں بر من کشود — نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود

ان کی ساری شاعری انہیں رموز کی تعلیمات سے لبریز ہے۔ یہاں تک کہ قطعات اور غزلیات بھی۔ اس جگہ اجمالاً چند عنوانات لکھتا ہوں۔

خودی | یہ ڈاکٹر صاحب کا خاص مضمون ہے۔ جس پر ان کی مستقل مثنوی موجود ہے۔ خودی سے مراد خود پسندی نہیں بلکہ خود شناسی ہے یہ مجموعہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں۔

چہ پرسی از کجا ایم چیستم من   بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موجِ بے قرارم   اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

شبنم

گفتند فرودِ آئے ز اوجِ مہ و پرویز   بر خود زن و با بحرِ پر آشوب بیامیز
با موج در آویز
نقشِ دگر انگیز
تابندہ گہر خیز

من عیش ہم آغوشیِ دریا نخریدم   آں بادہ کہ از خویش رباید نچشیدم
از خود نرمیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم

زندگی | اس عالم کائنات کا ذرہ ذرہ سرگرم پیکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہی پیکار اصل زندگی ہے۔ اخلاقیات کے نامور معلم شیخ سعدی نے کہا تھا کہ

اگر خواہی سلامت بر کنار است

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا   نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز   حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

مولانا بیدل نے کسی غزل میں کہا ہے "بشکند رنگم بدریا چوں حبابے بشکند" اس پر کہتے ہیں۔

از نزاکتہائے طبعِ موشگافِ او مپرس   کز دمِ بادے زجاجِ شاعرِ ما بشکند

کے تواند گفت شرح کار زار زندگی   می پرد درنگش بدریا چوں حباب بشکند

وہ اس عالم ہی کو پسند نہیں کرتے جس میں یزداں کے مقابلہ میں اہرمن نہ ہو۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقے   کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

عمل | ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام درحقیقت درس عمل ہے۔ اور یہی نوائے وقت ہے ستاروں کی زبان سے فرماتے ہیں۔

خنک آں کہ جانش بے قرار است   سوار راہوار روزگار است

قبائے زندگی برقامتش راست   کہ او نو آفرین و تازہ کار است

ہاتف کے جواب میں کہا ہے

ساحل افتادہ گفت۔ گرچہ بسے زیستم   ہیچ نہ معلوم شد۔ آہ کہ من چیستم

موج زخود رفتۂ۔ تیز خرامید و گفت   ہستم اگر میروم۔ گر نروم نیستم

اسلام | ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا اصلی سرچشمہ قرآنِ عظیم ہے۔ اسی کے رموز کو لیکر وہ اس ساز پر نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ دینِ اسلام ہر قسم کی انسانی صلاح و فلاح پر حاوی اور ہر دینی و دنیوی ترقیات کا کفیل ہے۔

ایک غزل میں کہتے ہیں۔

تو رہ شناس نئی وز مقام بے خبری   چہ نغمۂ ایست کہ در بربط سلیمیٰ نیست

ایک دوسری غزل میں کہا ہے۔

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست   اے زخود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

مغربی تہذیب جو بدبختی سے مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے ان کے نزدیک نہایت ناستوار بنیاد پر قائم ہے۔ اور وہ ایک ملمع کاری ہے جس کی تہ میں انسانیت اور ہمدردی کا نام و نشان نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

فرنگ گرچہ سخن با ستارہ می گوید   حذر کہ شیوۂ او رنگِ جوزنی دارد

در ہوا ئیش گرمیِ یک آہ بے تابانہ نیست | رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

مسلمانوں پر مدتہائے دراز سے عجمی ادبیات نے اثر ڈال کر ان میں جو فسردگی پیدا کر رکھی ہے اس سے بھی وہ سخت بیزار ہیں۔ اور پھر ان کو اصل عربی اسلامی رنگ میں لانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

دگر بدشتِ عرب خیمہ زن کہ بزمِ عجم | مئے گذشتہ و جامے شکستنی دارد

اخوۃ اسلامی| مسلمانوں نے جہالت کی وجہ سے جو نسلی اور ملکی امتیازات پیدا کر کے باہمی تفرقے ڈال رکھے ہیں ان کو وہ حرام سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن نے کل مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ اور یہی اخوت اسلامی ملت کی اصلی طاقت ہے۔ فرماتے ہیں۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم | چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است | کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

محنت| دنیا میں ہر شخص فطرتاً اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کی محنت کا کل ثمرہ اس کو ملے۔ لیکن دول مغربیہ کی سرمایہ پرستی کی وجہ سے عالم کی اقتصادی حالت اس قدر پر پیچ ہو گئی ہے کہ مزدور اپنا پورا حق نہیں پا سکتا۔ بلکہ سرمایہ دار بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یورپین ممالک میں سرمایہ اور محنت کی جنگ نہایت اہمیت پکڑ گئی ہے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ روس کی طرح دیگر مغربی سلطنتیں بھی اس کی رو میں بہ جائیں۔

ڈاکٹر صاحب سرمایہ داری کے خلاف جہادِ عظیم میں مصروف ہیں۔

موسیو لینن صدر جمہوریہ روس کی زباں سے کہتے ہیں۔

بسے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن | مثالِ دانہ تہِ سنگِ آسیا بودہ است
فریبِ زاری و افسونِ قیصری خوردہ است | اسیرِ حلقۂ دامِ کلیسا بودہ است
غلامِ گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر | قمیصِ خواجہ کہ رنگیں ز خونِ ما بودہ است
شرارِ آتشِ جمہور کہنہ ساماں سوخت | ردائے پیرِ کلیسا قبائے سلطاں سوخت

کارل مارکس کی زبان سے جو رفتگانِ عالم بالا میں سے ہے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

راز دانِ جزو کل از خویش نامحرم شد است　　آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شدہ است

ٹالسٹائی کہتا ہے۔

عقل دور و آفرید فلسفۂ خود پرست　　درسِ رضا میدہد بندۂ مزدور را

یہ درد اُن کے دل میں اس قدر ہے کہ کشمیر جنت نظیر کے دلفریب مناظر میں بھی اس کو نہیں بھولتے

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ　　بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے　　خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او　　نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے　　نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

تبلیغ اسلام! اسلام کی تبلیغ اہم ترین فریضۂ امت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو بعض ہندوستانی مغربی ممالک میں تبلیغ کے لیے جاتے ہیں یہ کہاں تک بجا ہے جبکہ خود ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں لاکھوں کروروں مسلمان جاہل اور گمراہ پڑے ہوئے ہیں۔ غیروں کو مسلمان بنانے کی بہ نسبت ان کی تعلیم اور ہدایت مقدم ہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب فرنگستان میں تبلیغ کی اس وقت ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور ایسے مبلغوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

زمانہ باز برافروخت آتشِ نمرود　　کہ آشکار شود جوہرِ مسلمانی
بیا کہ پردہ ز داغِ جگر بر اندازیم　　کہ آفتاب جہانگیر شد ز عریانی
ہزار نکتہ ز دی پیشِ دلبرانِ فرنگ　　گداختی صنمان را بعلم برہانی
خبر ز شہر سلیمیٰ بدہ حجازی را　　شرارِ شوق فشاں در ضمیر تورانی
رہِ عراق و خراساں زن اے مقامِ شناس　　بہ بزمِ عجمیان تازہ کن غزل خوانی
بسے گذشت کہ در انتظارِ زخمہ ویست　　چہ نغمہا کہ نہ خوابید بہ سازِ افغانی
حدیثِ عشق باہلِ ہوس چہ میگوئی　　بچشمِ مور مکش سرمۂ سلیمانی

جمہوریت | ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام دیکھنے سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان کا آب و گل حریت اور مساوات اور خمیر جمہوریت کا ہے لیکن ان کا یہ قول

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو   کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

نہایت تعجب انگیز ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ "پختہ کار" صاحب بھی خر نما شخص نکلے تو پھر کیا ہوگا۔ کیونکہ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ملائکہ کا جو استاد ہے وہی راندۂ درگاہ اور ملعون بارگاہ ہوگا۔ وہ غریب خود اس سے بے خبر تھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

بر در نوشتہ بود کہ ملعون شود یکے   بردم گماں بہر کس و بر خود گماں نبود

اس میں کچھ شک نہیں کہ رائے صواب ہر معاملہ میں صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے حاصل کی جائے یا ایک جماعت سے۔ مشورہ میں دو فائدے ہیں۔

(۱) نتیجہ خراب ہونے کی صورت میں ملامت کا خوف نہیں رہتا۔ اسی بنیاد پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی جن کی رائے کے قطعی درست ہونے میں شبہ نہیں تھا "شاورہم فی الامر" کا حکم دیا گیا۔

(۲) بہ نسبت ایک شخص کے جماعت میں اغلباً مذاق صحیح موجود ہوتا ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کے واسطے "امرہم شوریٰ بینہم" نازل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں بجز اس کے نہیں آتی کہ میں اس کو ان کی تعلیمات سے نکال کر مطائبات میں شمار کر لوں۔

خاتمہ | ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر آورد ہے۔ لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ایجاز ہے۔ یعنی فصاحتِ لفظی اور بلاغتِ معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔ جو مضمون ہے وہ نہایت صاف۔ برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرتِ خیال کا پسندیدہ ترین نمونہ ہے۔ اندازِ بیاں اور طرزِ ادا انوکھا اور دلکش ہے۔ ان کی توجہ خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کے پیچھے وہ نہیں پڑتے۔ لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کہیں ہاتھ

سے جانے نہیں دیتے۔

ان کا قدم کسی کے جادۂ تقلید سے قطعاً بری ہے۔ گو کہیں کہیں مغز سخن اُنہوں نے مولانا روم سے اخذ کیا ہو لیکن اپنا راستہ جو بالکل اچھوتا اور نیا ہے خود ہی نکالا ہے۔

ان کا جام شاعری اس سوگواری کی تلخی سے بھی پاک ہے جو قومی مرثیہ گویوں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ ماضی کے ماتمی نہیں ہیں بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں۔ ان کی شگفتہ طبیعت ایک بلبل ہے جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری سے ملت جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں۔

طباعت | اس دیوان کی چھپائی کی خوبیوں کی داد نہ دینا بھی ایک قسم کی بیداد ہے۔ ہمارے ملک میں مطبوعات کی تصحیح بڑی مشکل چیز ہے۔ میں خود اپنی تصنیفات ہر چند اہتمام سے چھپواتا ہوں لیکن پھر بھی ان میں غلطیاں رہ جاتی ہیں جن سے خون جگر پینا پڑتا ہے۔ لیکن اس دیوان میں مجھے شروع سے آخر تک کہیں ایک نقطہ کی بھی غلطی نظر نہیں آئی۔ کاغذ چکنا دبیز۔ لکھائی اعلیٰ درجہ کی اور چھپائی بہت صاف ہے۔

الغرض یہ دیوان صورتاً اور معناً ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

اقطابِ انگورہ

ڈاکٹر رضا نور بے وزیر حفظان صحت حکومت انگورہ

مشاہیر انگورہ میں ڈاکٹر رضا نور بے کی شخصیت وہ ممتاز و سربلند شخصیت ہے جو جدید ترکی تحریک میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے، یہ وہی ڈاکٹر رضا نور بے ہیں جنھوں نے مشہور مجلس "لوزان" میں حکومت عالیہ انگورہ کی نمایندگی کرتے ہوئے موسیو پوانیکار صدر اعظم حکومت فرانس، سائنیور مسولینی صدر اعظم حکومت اٹلی اور لارڈ کرزن وزیر خارجہ حکومت انگلستان ایسے عظیم الشان یورپی مدبرین کا دندان شکن مقابلہ کیا۔

ممدوح کا سال پیدائش ۱۸۷۸ء ہے، ابتدائی تعلیم "قسطنطنیہ کالج" موسومہ "مکتب سلطانی" میں ہوئی، اس کے بعد آپ نے فرانس میں سلسلہ شروع کیا اور پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹری میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی، پھر آسٹریا اور روس کی سیاحت کے بعد آپ نے آستانہ میں ڈاکٹری شروع کی، چونکہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کو مبدار فیاض سے غیر معمولی دل و دماغ عطا ہوا ہے اس لیے گو آپ ڈاکٹری پیشہ آدمی تھے لیکن ترکی سیاسیات کے ماحول نے آپ کو ملکی و قومی معاملات و مسائل میں حصہ لینے کی طرف ہمیشہ مائل رکھا اور آپ برابر سیاسیات میں حصہ لیتے رہے، ڈاکٹر صاحب ترکی زبان کے نہایت ممتاز شاعر و ادیب بھی ہیں اور تقریر میں تو اس درجہ ملکہ بڑھا ہوا ہے کہ اپنے ملک کے بہترین مقرروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب "ترکی" "فرنچ" اور "روسی" زبانوں میں کامل مہارت رکھتے ہیں ڈاکٹر صاحب کے علمی اور سیاسی بلند پائیگی سے تمام ارکان حکومت اچھی طرح واقف تھے، لہذا ۱۹۰۸ء کے انتخاب پارلیمنٹ کے موقع پر آپ مقام "سینوب" کی طرف سے ترکی پارلیمنٹ میں نمایندہ مقرر ہوئے، لیکن پارلیمنٹ میں ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ آپ کو ارکان انجمن اتحاد و ترقی کے ساتھ بعض اصول کار میں اختلاف پیدا ہو گیا، چونکہ ڈاکٹر صاحب ایک زبردست اور مضبوط دل و

دماغ کے آدمی ہیں لہذا آپ نے اپنے ضمیر کے موافق نہایت جرأت و بے باکی سے ارکان انجمن اتحاد و ترقی کی مخالفت شروع کر دی اور یہ مخالفت اس درجہ بڑھی کہ ارکان حکومت کو ڈاکٹر صاحب کی مقتدر اور باثر شخصیت سے خوف پیدا ہو گیا، آخر کار انجمن اتحاد کے سربرآوردہ ارکان نے اپنی انجمن کے خلاف سازش کا الزام لگا کر ۱۹۱۰ء میں آپ کو قید کر دیا[۹]

ڈاکٹر صاحب کے عائد شدہ الزامات میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ فرید پاشا اور کامل پاشا کے مؤید و معاون ہیں حالانکہ واقعہ اس کے خلاف تھا، چند ماہ بعد جب آپ رہا ہوئے تو آپ آستانہ کی سکونت کو ترک کر کے سوئٹزرلینڈ چلے گئے اور شہر "برن" میں ڈاکٹری پریکٹس شروع کر دی، گو ڈاکٹر صاحب اس وقت ارکان انجمن اتحاد و ترقی سے سخت نقصان و تکلیف اٹھا چکے تھے لیکن اس پر بھی آپ نے ان اصول کی مخالفت سے منہ نہ موڑا جن کی بنا پر آپ قید و گرفتار کیے گئے تھے، اور سوئٹزرلینڈ سے آپ نے مشہور اتحادی صدر الصدور حسین جاہد بے کو ایسے معرکۃ الآرا خطوط لکھے کہ بالآخر انھیں اخبار "طنین قسطنطنیہ" میں ڈاکٹر صاحب سے معافی مانگنا پڑی، ڈاکٹر صاحب شہر "برن" میں چند ماہ قیام فرمانے کے بعد "جینوا" چلے گئے، شہر جینوا سوئٹزرلینڈ کا ایک نہایت دلکش و پرفضا مقام ہے جہاں ڈاکٹر صاحب کے ادبی کمالات نے آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا، اور چونکہ آپ فرانسیسی زبان کے بے مثل ماہر ہیں لہذا آپ نے جینوا میں دو فرانسیسی ڈراموں موسومہ "شمسون" اور "دلیلہ" کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا، اور موسیقی کے راگوں کو ترجمہ میں اپنی اصلی حالت پر چھوڑ دیا، ترجمہ کے اختتام پر آپ پیرس گئے تا کہ یہاں ماہرین فن کے مشورہ

---

[۹] جمال پاشا مرحوم نے اپنے تذکرہ میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے اور انھیں کی کوشش سے ڈاکٹر رضا نور کو اس وقت انجمن اتحاد و ترقی کی حکومت نے کافی روپیہ دیکر اس غرض سے یورپ بھیجا تھا کہ وہ ایک مدت تک قسطنطنیہ واپس نہ آئیں۔ خاندان شاہی کے بعض افراد جو حکومت قسطنطنیہ کے مخالف تھے وہی ڈاکٹر رضا نور کے مربی تھے اور ڈاکٹر کو ان سے خاص تعلق تھا (مدیر)

سے ان ڈراموں کے گائین کو ترکی گائین کے طریقوں پر ترتیب دیں اور پھر فرانسیسی گائین سے ان کا مقابلہ کریں، ڈاکٹر صاحب کی اس کارگزاری سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ڈاکٹر ممدوح نے غربت و مسافرت کی حالت میں بھی اپنی قوم کی دماغی و ذہنی خدمت و اصلاح سے گریز نہ کیا، اور اپنے علمی تبحر اور فیضان سے وہ قوم و زبان کو برابر فائدہ پہونچاتے رہے۔

مذکورہ واقعہ اپریل ۱۹۱۴ء کا ہے جبکہ ڈاکٹر صاحب پیرس میں مقیم تھے، ابھی آپ سوئٹزرلینڈ واپس ہونے والے تھے کہ جنگ یورپ کا آغاز ہوا، اور آپ ڈاکٹر صاحب کا سوئٹزرلینڈ یا قسطنطنیہ جانا ناممکن ہوگیا، دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ آپ کے پاس خرچ بھی نہ رہا جس کے ذریعہ وہ پیرس کے شاہانہ مصارف برداشت کرتے، لیکن پھر بھی باحوصلہ ڈاکٹر نے ان مشکلات کو اہمیت نہ دی اور اپنی اہلیہ کے زیورات فروخت کر کے اوقات بسر کرنے لگے، یہاں تک کہ جب آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو آپ ستمبر ۱۹۱۴ء میں مصر چلے گئے جہاں آپ نے " شارع عبدالعزیز " پر اپنا مختصر سا مطب کھولا، ابتدا میں مصر والوں نے آپ کی اچھی طرح خاطر مدارت کی اور کافی تعداد میں مریضوں نے آپ کی طرف رجوع کیا، لیکن یکایک آپ کا کام رُک گیا، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کے بعض ترک دشمنوں نے برطانوی فوجی حکومت سے آپ کی شکایت کی اور اُدھر آپ کے ہم پیشہ ڈاکٹروں میں یہ افواہ اُڑائی کہ ڈاکٹر رضا توفیق برطانیہ کی فوجی حکومت کی نگرانی میں ہیں اور سادہ لوح عوام پر ظاہر کیا کہ جو لوگ ڈاکٹر رضا توفیق کے مطب میں جاتے ہیں وہ ممکن ہے کہ نظر بند کر لیے جائیں۔

ڈاکٹر صاحب کے دشمنوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ وہ برابر برطانوی فوجی حکومت کے افسروں کے پاس جا کر ڈاکٹر ممدوح کی طرف سے اُن کو بدگمان کرتے رہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بار بار ڈاکٹر صاحب کو فوجی حکام نے بُلایا اور جوابات طلب کیے روز روز کی اس مصیبت نے ڈاکٹر صاحب کے صبر و استقلال کو رخصت کر دیا اور دنیا اُنکی آنکھوں میں تاریک ہوگئی

ایسی حالت میں اگر اُن کے ساتھ اُن کی اہلیہ محترمہ ہوتیں تو وہ اس پریشان کن زندگی سے اس امر کو بہتر خیال کرتے کہ اپنے کو قید یا نظر بند کرا لیتے جیسا کہ آپ نے اپنے دوستوں سے بار بار اس خیال کا اظہار کیا تھا۔

جب درۂ دانیال پر معرکہ آرائی نے شدت اختیار کر لی اور انگریزی بحری بیڑہ کو متواتر ناکامیابیاں اُٹھانی پڑیں تو برطانوی اس سے بہت متاثر ہوئے اور اسی زمانہ میں مصر کی فوجی حکومت نے ڈاکٹر رضا نوری بے کو طلب کیا۔ اس بلاوے سے ڈاکٹر صاحب نے خیال کیا کہ اب وہ گھر واپس آئیں گے اور نظر بند کر لیے جائیں گے اُس وقت آپ کے پاس کافی روپیہ نہ تھا جو اپنی اہلیہ کی ضروریات کے لیے محفوظ فرما دیتے اس لیے آپ نے اپنے بعض دوستوں کو وصیت کی کہ وہ اُن کی بیوی کی خبر گیری کرتے رہیں۔ پھر شام کے ایک معتمد شخص سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اُن کی بیوی کے پاس اپنی بیوی کو رکھیں۔ اور مصائب و آزمائش کا دور ختم ہونے تک اس احسان کو جاری رکھیں، یہ تمام انتظامات کرنے کے بعد ڈاکٹر رضا نوری بے "سوائے ہوٹل" میں پہونچے اور اُس چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوئے جس میں چھ فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے، ان میں دو افسر بڑے درجہ کے تھے، ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک بڑے افسر نے اُن کو مخاطب کر کے کہا،

"ڈاکٹر شاید آپ ہمارے احسانات بھول گئے، ہم نے اُس وقت تک وہ معاملہ آپ کے ساتھ نہیں کیا جو دشمن کی رعایا کے ساتھ کرنا چاہیے"

ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کے اس سلوک کا شکر گزار ہوں۔

افسر۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ نے اپنے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا، اور آپ نے اطمینان وسکون سے رہنا پسند نہیں کیا جس کی ہم کو آپ سے امید نہ تھی بلکہ آپ نے اتحاد و ترقی کا پروپیگنڈا مصر میں شروع کر دیا، اور آپ یہاں بھی برابر تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ آپ کو جو اطلاع ملی ہے غلط ہے، میں انجمن اتحاد و ترقی کا دشمن ہوں اور

عثمانی پارلیمنٹ میں بحیثیت ایک ممبر کے میں ہمیشہ انجمن اتحاد و ترقی کا مخالف رہا ہوں اور اس کا ثبوت میرے مضامین اور وہ پمفلٹ ہیں جو میں نے شائع کیے ہیں علاوہ ازیں میری حیثیت مصر میں ایک اجنبی شخص کی سی ہے، نہ مصری زبان سے واقف ہوں اور نہ مصری لیڈروں سے میرے تعلقات ہیں، لہذا میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حالت میں مجھ پر کیوں یہ الزام لگایا گیا کہ میں برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہوں؟ آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک عزلت نشین شخص ہوں اور بجز ڈاکٹری کے میرا اور کوئی کاروبار یا تعلق نہیں ہے۔

افسر۔ کیا آپ اس کا وعدہ کرتے ہیں اور حلف اٹھاتے ہیں کہ آپ سیاسیات میں کسی قسم کا کوئی حصہ نہ لیں گے اور کوئی کام ایسا نہ کریں گے جو ہمارے لیے نقصان رساں ہو۔

ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کو کسی قسم کا ضرر پہنچانے سے عاجز ہوں، میں ایک غریب الوطن آدمی ہوں، ہاں اگر چہ مجھ میں اس کی قدرت ہوتی کہ میں اپنے وطن کی کوئی خدمت کر سکتا اور یہاں رہ کر آپ کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتا تو میں ضرور ایسا کرتا، لیکن اب کہ میں ایسا نہیں کر سکتا مجھے توقع ہے کہ آپ میرے خلاف شکایتوں پر کان نہ دھریں گے اور اگر آپ کا ایسا ہی ارادہ ہے تو میں قید و نظر بندی کے لیے تیار ہوں، آپ جہاں چاہیں مجھے اور میری بیوی کو نظر بند کر دیں۔

افسر۔ آپ کے ایک دوست نے آپ کے متعلق ہم سے جو باتیں بیان کی ہیں اور اگر آپ فی الحقیقت انجمن اتحاد و ترقی کے دشمن ہیں تو پھر آپ کیوں نہیں ہماری مدد کرتے؟ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنے بیڑہ کے ساتھ درہ دانیال کے معرکہ میں بھیج دیں جہاں آپ انگریزی فوجوں کی رہنمائی کریں اور انہیں داخلہ قسطنطنیہ میں مدد دیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ جناب! الا درہ دانیال پر آپ کی ڈیڑھ لاکھ سپاہ پڑی ہوئی ہے اور پوری کوشش سے کام کر رہی ہے لیکن بایں ہمہ وہ آستانہ میں داخل نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں کیا آپ مجھ کو اپنے بڑے بڑے جنگی اور ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں؟ اس موقع پر میں آپ کو اس امر سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ میں "ترکی النسل" ہوں، قوم پرست

ہوں، پکا مسلمان ہوں، پھر کیا آپ مجھ سے ملک مذہب کا خائن بنانا چاہتے ہیں؟ میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ میں ارکان انجمن اتحاد و ترقی کا دشمن ہوں لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ میں ملک مذہب اور اپنی قوم کا خائن بھی ہوں، یاد رکھئے میں ترک ہوں اور مجھ سے اس قسم کا مطالبہ میری توہین ہے۔

افسر۔ معاف کیجئے اس گزارش سے آپ کی توہین مقصود نہ تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ آپ اپنے اثر و اقتدار سے انجمن کے ارکان کو نقصان پہونچانے میں مدد دیں جو ترکی قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ اس وقت آپ سے تنہا ارکان انجمن جنگ آزما نہیں ہیں بلکہ پوری ترکی قوم آپ کے مقابلہ میں درہ دانیال پر کھڑی ہے، بہتر ہو کہ آپ مجھ سے اس قسم کا مطالبہ نہ کریں ورنہ بصورت دیگر آپ شوق سے میرے ساتھ دشمن کی رعایا کا سا سلوک کریں،

افسر۔ ڈاکٹر صاحب آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کی بات پر ہم کو کامل یقین ہے اس لئے آپ مصر میں آزاد زندگی بسر کریں آپ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔

یہ کہہ کر دونوں فوجی افسروں نے ڈاکٹر صاحب کو دروازہ تک رخصت کیا اور گفتگو کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اُس کی معذرت چاہی اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جنگ یورپ کا سارا زمانہ مصر میں گزارا اور پھر اُن سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔

اگست ۱۹۱۸ء میں جب ترکی اتحادی معاہدہ پر دستخط ہو گئے تو ڈاکٹر رضا نور بے آستانہ تشریف لے آئے، اُس وقت قسطنطنیہ کی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی، ترکی گورنمنٹ پر خائنوں کا قبضہ تھا جو سب کے سب اتحادیوں کے زیر اثر تھے، اور تمام ترکی مدبرین اپنی آزاد خیالی کے باعث قید و گرفتار ہو رہے تھے، ترکی ممالک پر اتحادی، اور یونانی فوجیں قبضہ جما رہی تھیں غرض ان حالات کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب گو نہایت رنجیدہ اور افسردہ خاطر تھے لیکن وہ تنہا اس غاصبانہ غلبہ کا مقابلہ بھی نہ کر سکتے تھے آخر کار ۱۹۱۹ء میں غازی اعظم مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی تحریک

آغاز ہوا، اور آزاد خیال ڈاکٹر رضا نور بے خصوصاً غازی اعظم کی جماعت میں جا ملے، اور اسی وقت سے ڈاکٹر صاحب کی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی قابلیت ترکی حلقوں میں پہلے ہی مسلم تھی اس لیے اس وقت ڈاکٹر صاحب کا انگورہ پہونچکر احرار کی تحریک میں حصہ لینا محرکین کے لیے عین امداد سے کسی طرح کم نہ تھا، چنانچہ یہ آپ کی مسلمہ اہلیت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ سب سے پہلے قومی وزارت میں "وزیر حفظان صحت" مقرر ہوئے، اور انگورہ کیبنیٹ میں آپ کی شرکت اطمینان و مسرت کی نظر سے دیکھی گئی،

مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی موجودہ تمام حیرت انگیز کارگزاریاں آج دنیا جہان سے جو خراج تحسین وصول کر رہی ہیں وہ دراصل اُس عہد و ضابطہ کے نتائج و برکات ہیں جو فروری سنہ ۱۹۲۰ء کو انگورہ کی قومی مجلس نے منظور و نافذ کیا تھا اور جو "جدید ترکی" کی تاریخ میں ہمیشہ "میثاق ملی" کے نام سے یاد کیا جائے گا، ترکی سیاسیات کا مطالعہ کرنیوالے حضرات اس "میثاق ملی" کی اہمیت اور اُس کی سیاسی مرتبت سے اچھی طرح واقف ہیں جس کی رو سے انگورہ میں ترکی قوم پسندوں نے استقلال و حریت کی آخری مگر خونریز قسم کھائی تھی، یہ اہم ترین میثاق ملی ڈاکٹر رضا نور بے کی سیاسی مآل اندیشی اور دوربینی کا بہت زیادہ مرہون ہے جس میں متعدد واقعات کی ترمیم ڈاکٹر صاحب نے فرمائی تھی، ڈاکٹر صاحب نے اس عہد نامۂ قومی میں جن دفعات کا اضافہ فرمایا ہے وہ ترکی کے تابناک مستقبل کی زبردست ضامن ہیں، ڈاکٹر رضا نور بے اگرچہ وزیر حفظان صحت تھے لیکن کام کرنے والوں کی ذمہ داریاں ہمیشہ بڑھتی رہتی ہیں چنانچہ اسی زمانہ میں آپ کو محکمۂ تعلیمات عامہ میں بھی خدمات انجام دینی پڑتی تھیں اور خالدہ ادیب خانم کی مشہور وزارت میں آپ "ڈائرکٹر تعلیمات" کے فرائض انجام دیتے تھے، ان خدمات نے انگورہ اور مجلس وطنی میں ڈاکٹر صاحب کے اعتماد کو حد درجہ ممتاز بنا دیا لہذا آخر سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ حکومت عالیہ انگورہ کے محکمۂ وزارت خارجیہ میں لے لیے گئے جہاں چند ماہ کام کرنے کے بعد فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں مشہور سیاست داں

یوسف کمال بے وزیر خارجہ انگورہ کے ہمراہ ماسکو تشریف لے گئے، مملکت روس کے سفر کا منشا یہ تھا کہ حکومت روس سے دوستانہ روابط و علائق پیدا کیے جائیں، انگورہ گورنمنٹ اور روس کی بالشویک گورنمنٹ کے درمیان کسی عہد نامہ سیاسی کا قیام ایک اہم ترین کام تھا جسے بالغ نظر اور پختہ کار ڈاکٹر رضا نور بے نے بکمال خوش اسلوبی انجام دیا، چونکہ ڈاکٹر صاحب اپنے زمان سیاحت میں عرصہ تک "ماسکو" میں رہ چکے تھے اس لیے روسی ارباب سیاست آپ کی مسلمہ قابلیت سے پہلے ہی مرعوب تھے اس لیے ڈاکٹر صاحب کی تمام تر جد و جہد نہایت مفید و منفعت بخش طریق پر کامیاب ہوئی انگورہ گورنمنٹ اور روس گورنمنٹ کے دوستانہ تعلق کے حصول و قیام کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کو دو مرتبہ مملکت روس کا سفر کرنا پڑا، اور یہ دونوں سفر سیاسی نقطہ نظر سے نہایت کامیاب رہے، اس کے بعد اندرون انگورہ خصوصاً مجلس وضع آئین و قوانین میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات و اصلاحات کا تذکرہ ایک طویل فرصت چاہتا ہے جنکی حیرت انگیز اہمیت کو جدید ترکی کی تاریخ ہی پیش کر سکتی ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۲ء میں بندرگاہ مدانیہ میں ترکی اتحادی فوجی افسروں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کا مقصد ترکی و یونانی جنگ کا التوا اور اتحادیوں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں ایک عام مجلس صلح کا انعقاد تھا، مدانیہ کانفرنس میں متارکہ قرار پایا تھا اس کی تعمیل میں ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء سوئٹزرلینڈ کے مقام "لوزان" میں وہ ہنگامہ آرا صلح کانفرنس منعقد ہوئی جو سیاسیات مشرقیہ اور بین الاقوامی مجالس میں اپنی نظیر آپ ہے۔

انگورہ گورنمنٹ کی طرف سے جو وفد مصالحت تدبیر پناہ مارشل عصمت پاشا کی سرکردگی میں منتخب ہوا اس میں ڈاکٹر رضا نور بے نائب رئیس وفد کی طرف سے نومبر ۱۹۲۲ء میں لوزان بھیجے گئے، اس وقت لوزان میں جن ممالک کے وفود گئے تھے اُن کی تعداد دس تھی، ان میں حسب دستور وفد کے ۳۵ ممبر تھے جن کی مجموعی تعداد ۳۵۰ تھی، گویا ۳۵۰ مغربی سیاست داں اصحاب کے مقابلہ میں یہ ۳۵ آدمی تھے جنہیں سیاسیات و معاشرت، تجارت و قانون،

مالیات، وبین الاقوامی مسائل جن میں ان پختہ کار مغربی سیاست آگاہ افراد کا مقابلہ کرنا تھا اور اطلاعات سے ثابت ہے کہ ترکی وفد کی طرف سے ڈاکٹر رضا نور بے نے جس قدر کام کیا ہے اور آپ نے جس قدر دماغی محنت کی ہے عصمت پاشا کے بعد کسی دوسرے ترکی نمایندہ نے نہیں کی جس کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ لارڈ کرزن، موسیو پانیکا اور سائنیور مونٹینی ایسے عظیم المنزلت سیاسی نمایندوں کو "لوزان" میں جو شکست ہوئی وہ وہ ڈاکٹر رضا نور بے ہی کے دانش پناہ دماغ اور سیاسی تجربہ کا نتیجہ ہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۲۲ء میں لارڈ کرزن ایسے پختہ کار مدبر نے جس وقت مسئلہ موصل کے متعلق بحث چھیڑی اور موصل کو عراق کا جزو صحیح ثابت کرنے کے لیے اُس نے دلائل و براہین سے کام لیا، تو یورپ کے اعلیٰ طبقوں میں خیال کیا جانے لگا تھا کہ لارڈ کرزن کے دلائل کا رد ترکی وفد کے لیے ناممکن ہے اور یہ واقعہ ہے کہ لارڈ کرزن نے مسئلہ کو جس اہم پیمانہ پر مجلس صلح میں اُٹھایا تھا اُس کی اہمیت اسی قدر وقیع تھی، کیونکہ اس وقت سب سے بڑی مشکل ترکوں کے لیے یہ تھی کہ لارڈ کرزن کی موافقت میں فرانس، اٹلی اور جاپان و امریکہ کے تمام نمایندے شامل تھے ادھر خود عراق میں غدار فیصل اور اوس کے باغی اسلام بھائی امیر عبداللہ اور زید نے موصل اور علاقہ عراق میں ترکوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا، پھر اندرون کانفرنس غدار شریف مکہ کا بے حمیت نمایندہ جعفر پاشا موجود تھا جو بڑے پیمانہ پر یہ ثابت کرنے آیا تھا کہ موصل ہر طرح عراق کا حصہ ہے اور یہ عراقی حکومت یعنی انگریزوں ہی کے قبضہ میں رہنا چاہیئے لارڈ کرزن کی اس تیاری کے بعد ترکی وفد کے لیے جس قدر مشکلات پیدا ہو گئی تھیں انہیں کچھ سیاسی دماغ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں، بالآخر ڈاکٹر رضا نور بے کو جوش آیا اور ممدوح نے ہزار گونہ سیاسی معروفیتوں کے ہوتے ہوئے لارڈ کرزن کی یادداشت متعلقہ موصل کا جواب لکھنا شروع کیا، اور جس وقت یہ جوابی یادداشت مجلس صلح میں آپ نے پیش کی تو اس کے استدلال اور تاریخی استناد، اہم اعداد و شمار اور مسکت جوابات کا یہ اثر ہوا کہ لارڈ کرزن کو یہی کہتے

ہی کہ اچھا تو اس مسئلہ کو اب "جمعیۃ الاقوام" ہی کے سپرد فرما دیجئے' ڈاکٹر توفیق رشدی بے مالک اعتبار "حاکمیت ملیہ انگورہ" اور مسٹر وارڈ پرائس نمائندہ امریکن پریس نے ایک موقع پر بیان کیا تھا کہ ہم ڈاکٹر رضا نور بے کی اس جوابی یادداشت کی بالغ نظری اور ہمہ گیر جامعیت پر مجلس صلح میں حیران رہ گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ طرز عمل بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اس مجلس میں جس میں چاروں طرف طاقتور سے طاقتور دشمن نظر آ رہے تھے اور اتحادی جنگی جہازوں کا سمرنا و درہ دانیال اور شمالی شام میں فرانسیسی فوجوں کا مظاہرہ ہو رہا تھا آپ نے قومی ترجمانی اور نمایندگی میں اس جرأت و بے باکی سے کام لیا کہ گویا ان مشکلات کا ایک حق پرست پر کوئی اثر نہ تھا مثلاً جس وقت قلیل التعداد اقوام کے تحفظ اور آزادی کے لیے مجلس صلح میں بحیثیت صدر جلسہ لارڈ کرزن نے ارمن قوم کے حفاظت و آزادی کے لیے ایک مدلل استدعا پیش کی اور ترکی حکومت کے ایک سرکاری اعلان مصدرہ ۱۷ر فروری ۱۹۲۰ء کے حوالہ سے اس استدعا کو قانونی مرتبہ دیا تو باستثنائے روسی نمایندہ تقریباً تمام نمایندوں نے لارڈ کرزن کی اس استدعا سے اتفاق رائے کیا خصوصاً موسیو بیرر اور موسیو بمپارڈ فرانسیسی نمایندوں اور موسیو دنیز یلاس یونانی نمایندہ، اور مسٹر گوروفی نمایندہ امریکہ نے اس تحریک کا پرزور خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے اتفاق کا اظہار کیا، لیکن غیور و شیردل ڈاکٹر رضا نور بے فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بآواز بلند ان یورپی نمایندوں سے کہہ دیا کہ

"غدار ارمنوں کے لیے ترکی میں نہ کوئی زمین ہے اور نہ ہی ہم اس مسئلہ کو جمعیۃ الاقوام میں پیش کرنا چاہتے ہیں، اور ہم اپنی ماتحت رعایا کو فوجی خدمت سے کبھی مستثنیٰ نہیں کر سکتے"

ڈاکٹر موصوف کی اس جرأت و گرم گفتاری سے شرکائے مجلس جس قدر مرعوب ہوئے اُس کا معمولی نمونہ یہ ہے کہ ایک موقع پر ڈاکٹر اس قدر غضب ناک ہوئے کہ کرسی کو پھینک کر مجلس سے چل دیئے جس پر تمام ستم کاروں نے مارشل عصمت پاشا سے شکایت کی یورپی مجلس صلح میں شاید یہ

سب سے پہلا واقعہ تھا کہ ایک ایشیائی نمایندہ یا ترکی وکیل نے مغرور و سرکش یوروپین مدبرین کو اس قدر درشت اور منہ توڑ جواب دیا۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ اگرچہ آپ ترکی وفد کے نائب مشیر لیکن قومی دیانت کا یہ عالم تھا کہ اپنے سردار مارشل عصمت پاشا کی تمام کارگزاری کی نگرانی کرتے تھے اور ایک موقع پر آپ نے مجلس ملیہ انگورہ کو صاف صاف لکھ دیا کہ عصمت پاشا مجلس مصالحت میں نرمی اور اعتدال سے کام لے رہے ہیں جو قومی وقار کے منافی ہے۔

غرض یہ اور اسی قسم کے طویل واقعات ہیں جو شیر دل اور سیاست آگاہ ڈاکٹر رضا نور بے کی ممتاز و مستثنیٰ افضیلت کے آئینہ دار ہیں، اور جن کی شرح ایک طویل داستان کو چاہتی ہے، کاش ہمارے وہ نوجوان طلبہ ڈاکٹر صاحب کی ہمہ داں اور فضیلت پناہ شخصیت کا اندازہ کریں جو میٹرک پاس کرکے کسی اخبار کی ایڈیٹری یا ملک و قوم کی لیڈری اختیار فرمانے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

حلیہ ڈاکٹر رضا نور بے ایک دراز قامت اور نہایت تنومند شخص ہیں، رنگ نہایت سفید اور نیلی آنکھیں، سر کے بال اڑے ہوئے، اور یوروپین لباس خصوصاً ٹائی کالر کا ہر وقت خیال رکھتے ہیں۔

'توحیدی'

تصحیح

گزشتہ نمبر میں علامہ فتحی بے کی جو سوانحعمری شائع ہوئی ہے اس میں اُن کا نام غلطی سے احمد فتحی بے لکھا گیا، حالانکہ علی فتحی بے ہونا چاہیئے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

برہان القرآن } پنجاب میں مولانا عبداللہ صاحب مرحوم چکڑالوی حجیت حدیث کے قائل نہیں تھے۔ اس وقت سے یہ مسئلہ مابین اہل قرآن و اہل حدیث کے زیر بحث چلا آتا ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی کتاب مذکورہ بالا ہے۔ جس میں مولوی احمدالدین صاحب امرتسری امام اہل قرآن اور مولانا ابوالوفا ثناءاللہ صاحب امرتسری صدر اہل حدیث کے مابین اس مسئلہ پر جو تحریری مناظرہ ہوا ہے تفصیل کے ساتھ مندرج ہے۔ دونوں فرقوں کے علماء فحول جس بحث میں تقریباً ایک ربع صدی کا زمانہ گزار چکے اور اب تک کسی متفقہ فیصلہ پر نہیں پہونچے اس کے متعلق ہمارا کوئی فیصلہ ناطق نہیں ہوسکتا لیکن اس بحث کی نوعیت کے متعلق ہم کچھ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حدیث حجت ہے یا نہیں۔ مسئلہ زیر بحث صرف اسی قدر ہے۔ اور یہ آج سے نہیں ہے بلکہ جس زمانہ میں حدیث کی تدوین شروع ہوئی اسی زمانہ سے ایک جماعت اہل اسلام کی حجیت حدیث کی منکر چلی آتی ہے۔ اور دینی امور میں حدیث کو لاشئے سمجھتی ہے۔

مگر یہ بحث صرف اس بات پر مبنی تھی کہ آیا حدیث ذریعہ علم ہے یا نہیں۔

منکرین حدیث یہ کہتے تھے کہ دنیا کی کسی عدالت سے تم اس قسم کی شہادت پر کہ میں نے زید سے سنا۔ اس نے بکر سے سنا اس نے خالد سے سنا۔ اس نے عبداللہ سے سُنا۔ اس نے احمد سے سنا۔ اس نے محمدؐ سے سنا ایک پیسہ کا بھی فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔ پھر کس اصول سے تم ہم کو مجبور کرتے ہو کہ حدیثوں کو جو تمامتر اسی قسم کی شہادت پر مبنی ہیں ہم امور دین میں دلیل سمجھ لیں۔

قائلین حدیث کہتے تھے کہ چونکہ یہ معتبر اور موثوق ذرائع سے ہم کو موصول ہوئی ہیں اس لئے قابل استناد ہیں۔ ان میں جو متواتر ہیں ان سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔ اور جو غیر متواتر ہیں ان سے ظنی۔

منکرین کہتے تھے کہ متواتر کوئی حدیث نہیں ہے۔ تمامتر احاد ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ ظنی ہوسکتی ہیں لیکن دین کے معاملہ کو ظنیات پر رکھنا ممنوع ہے۔ قرآن یقینی ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے۔

الغرض بحثیں اس قدر بڑھ گئیں کہ ان کے نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ مگر ان تمام بحثوں میں کا دار مدار صرف اس امر پر تھا کہ حدیث مفید علم ہوتی ہے یا نہیں۔ اس امر میں سب متفق تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہے۔

اب اس بحث میں ایک نیا باب کھلا۔ یعنی خود آنحضرتؐ کے متعلق لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ آپ کے اقوال شرعی وہی ہیں جو بذریعہ وحی کے فرماتے تھے۔ اور وہ صرف قرآن ہے۔ باقی عام معاملات میں جو اقوال تھے وہ تشریعی نہیں۔ تشریع کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے رسول کا کام محض احکام الٰہی کی تبلیغ ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک حدیث چاہے متواتر ہو یا غیر متواتر تاریخ دینی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ نہ اس کی تحلیل سے کوئی چیز حلال ہو نہ اس کی تحریم سے کوئی شے حرام۔ اب قرآن و حدیث کے متعلق مسلمانوں میں کئی خیال کی جماعتیں ہو گئی ہیں۔

(۱) قرآن اور حدیث دونوں اصل دین ہیں۔ اور دونوں کے رتبے جہاں تک عمل کا تعلق ہے برابر ہیں۔

یہ جمہور کا مذہب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ میں افراط اور تفریط ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اس کے بھی قائل ہیں کہ کہیں آیات قرآنی حدیثوں کو اور کہیں حدیثیں قرآنی آیتوں کو منسوخ کر دیتی ہیں۔

(۲) قرآن کو حدیث پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی آیتیں حدیثوں کو منسوخ کر سکتی ہیں لیکن حدیثیں ان کی ناسخ نہیں ہو سکتیں۔

یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بھی حدیثوں کا یہ منصب رکھتے ہیں کہ وہ قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام۔ مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید کر سکتی ہیں نیز ان سے زیادت علی الکتاب بھی ہو سکتی ہے۔

(۳) دین اسلام صرف قرآن ہے۔ حدیثوں کا ثبوت چونکہ آنحضرتؐ تک یقینی نہیں ہے۔

اس لیے وہ امر دین میں کار آمد نہیں۔

اہل علم کی ایک مختصر جماعت اس خیال کی چلی آتی ہے۔ خود امام شافعیؒ نے کتاب الامؒ میں ایک منکر حدیث کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے دلائل لکھ کر ان کی تردید کی ہے۔

مصر میں بھی علماء اور ادباء کا ایک گروہ اس عقیدہ کا ہے۔ جن میں حافظ ابراہیم وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر توفیق صدقی مرحوم بھی اس خیال کے تھے۔

(۴) قرآن ہی اصل دین ہے۔ حدیثیں دین میں مطلقاً حجت نہیں۔ خواہ ان کا ثبوت ہو یا نہ ہو۔

یہ دعویٰ ہند کی جماعت اہل قرآن کا ہے۔ یہ لوگ خالق اور مخلوق کی اطاعت میں فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سرچشمۂ شریعت صرف خالق ہے جو اپنی منشا کو بذریعۂ وحی نبی کے قلب پر نازل کر دیتا ہے۔ نبی اسی پر عمل کرتا ہے اور اسی کی تعلیم دیتا ہے۔

اہلحدیث نبی کو بہ تفہیم الٰہی قرآن کا مفسر اور شارح قرار دیتے ہیں اس لیے حدیث جو اقوال و اعمال نبویہ کا نام ہے ان کے نزدیک واجب العمل ہے۔

جماعت سوم کی بحث تک جو نوعیت حدیث کے متعلق ہے کہ ان کا ثبوت آنحضرتؐ تک یقینی نہیں ہے ہم حصہ لے سکتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک علمی بحث ہے جس میں بدعقیدگی کا شائبہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ خود ائمہ حدیث کی تصریح ہے کہ اخذ حدیث میں حسن ظن جائز نہیں بلکہ خوب تحقیق کر لینی چاہیئے۔

لیکن جماعت چہارم کی بحث نفس رسول اللہ کی ذات کے متعلق ہے جن کی نسبت خود قرآن تصریح کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ وہ معلم۔ مزکی اور مطاع امت ہیں۔ اس لیے اس تلخ بحث میں پڑنا ہم روا نہیں سمجھتے۔ جس کو دونوں فریق کے دلائل دیکھنے کا شوق ہو وہ اس کتاب کو جو ۱۸۰ صفحہ کی ہے اور جس کی لکھائی چھپائی اچھی ہے چار آنہ کا ٹکٹ بھیجکر میاں مولا بخش و اللہ بخش صاحبان سوداگران صابون بازار سرکی بنداں امرتسر سے طلب کرے۔

جغرافیہ برہما منصفہ عبدالرحمٰن ندوی مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڈھ

اُردو زبان میں جو درسی کتابوں کا اضافہ ہو رہا ہے اُسی سلسلہ میں عبدالرحمٰن صاحب ندوی کی اس کوشش کا بھی شمار کرنا چاہیئے جنھوں نے برہما کا جغرافیہ نہایت عمدہ طرز پر اُسے وزبان میں ترتیب دیا ہے۔ اُمید ہی کہ برہما کے قومی مدارس اس کی خاص طور پر قدر کریں گے۔ قیمت درج نہیں ہی۔

رپورٹ قومی تعلیمی کانفرنس۔ کاشی ودیاپتھ۔ بنارس

قومی تعلیم کا مسئلہ ہنوز فیصلہ کن صورت نہیں اختیار کر سکا تھا کہ بعض اکابرین قوم "سوراج" کی تعریف اور اس کی ہیئت کو واضح کرنے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے بالآخر بابو بھگوانداس صاحب مشہور فلسفی وعالم کی پیہم کوشش نے مسٹر سی آر داس کو مجبور کیا کہ وہ سوراج پارٹی کی طرف سے ایک مکمل دستور اساسی شائع فرمادیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اگرچہ ملک نے اُس پر ایسی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔

اسی طرح مسئلہ قومی تعلیم کے متعلق کافی اختلاف خیالات رہا اور مختلف حضرات نے جداگانہ نقطہ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھا۔ بالآخر بھگوان داس صاحب نے ایک تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ضروری سمجھا جس میں تقریباً پندرہ دن کی مسلسل نشست کے بعد تقریباً تمام اصولی و فرعی مسائل کے متعلق قابل عمل تجاویز منظور کی گئیں۔ یہ رپورٹ انہیں تجاویز سے بحث کرتی ہی جس پر مفصل تبصرہ انشاءاللہ آئندہ کیا جائے گا۔

نوید امید

از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

مولانا محمد علی کی تقریب تشریف آوری نے مولانا اسلم صاحب کو اپنی عرصہ کی خاموشی کو خیرباد کہنے پر مجبور کر ہی دیا اور اس موقع پر جو نظم آپ نے تحریر فرمائی، وہ بلاشبہ اُن خاص چیزوں میں سے ہے جو دل ہی سے نکلتی ہیں اور دل ہی میں گھر کرتی ہیں۔ ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس گرانقدر تحفہ کے لئے صاحب نظم کا شکریہ ادا کریں یا مولانا محمد علی صاحب کا جن کی دوبارہ رہائی نے یہ دوسری نظم اسلم صاحب سے لکھوائی ہے۔ مدیر

امتحانگاہِ عمل ہے یہ جہانِ گیرودار — ذرہ ذرہ اس کے عنصر کا ہے گرمِ کارزار
ہے غرض حسنِ عمل۔ بازیچۂ طفلاں نہیں — یہ حیاتِ بے بہا ملتی نہیں ہے بار بار
سعیِ پیہم ہے نشانِ قیس و شانِ کوہکن — عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار
سوزِ دل نے پھونک ڈالے خطرہائے موت و زیست — ہو گیا پروانۂ آتش بجاں شعلہ شکار
مایۂ ارزندگی ہیں یہ تکالیفِ عمل — ہے بقدرِ سعیِ مردوں کا جہاں میں اعتبار
جو عزیزِ حق ہے اُس کو خوار کر سکتا ہے کون — عزت و ذلت کا بندوں کو نہیں ہے اختیار
گو شہیدوں کی یہ صورت ہے کہ خاک و خوں میں ہیں — اُن کی رعنائی پہ ہوتی ہیں مگر حوریں نثار
شانِ منصوری کوئی پیدا کرے تو دیکھ لے — تختِ شاہی سے بھی ہے رتبہ فزوں پائے دار
ہے یہ شرطِ عشق محمل پر نظر ہر دم رہے — پاؤں مجنوں کے ہوں گو خارِ بیاباں سے فگار
رہروانِ راہِ حق کو کب ہے منزل کی تلاش — ہر قدم پر شاہدِ مقصود سے ہیں ہمکنار

سوز و سازِ بندگی ہی اصلِ رازِ زندگی ہی اِسی قوت کے قبضہ میں عنانِ روزگار
ساری دنیا ہی وراثت بندگانِ خاص کی دوسرے ہرگز اُٹھا سکتے نہیں عالم کا بار
ہی سلیمانی کا منصب کارِ نظمِ ملک و دیں اس کو کیا انجام دیسکتی ہی مورِ زلّہ خوار
اِس جہاں کا دورِ مستقبل ہی صرف اسلام کا آرہا ہی اپنے مرکز پر زمانہ کا مدار
چند گھڑیاں رہ گئی ہیں آزمائش کی فقط
مژدہ باد اے حامیانِ دین و احرارِ وطن

خدا بھی ہی

تری قسمت میں ہی سرِ خدا کا رازداں ہونا
تو مشتِ خاک ہی لیکن ہے تجھ کو اک جہاں ہونا
ابھی ہی تو وہ قطرہ جو نہیں شرمندۂ ساحل
تجھے صحرائے ہستی میں ہی بحرِ بیکراں ہونا
ابھی بے بال و پر ہے مرمرِ نا اتفاقی سے
اخوت کے گلستاں میں ہی تجھ کو نغمہ خواں ہونا
تجھی کو اے اسیرِ دامِ آب و گل بقا بھی ہی
تجھی کو زور والوں سے یہ کہنا ہی "خدا بھی ہی"

"صدائے خاموش"

ہوالموجود

(از نتائج افکار جناب مولوی فضل الحق صاحب آزاد عظیم آبادی)

امینِ رازِ ہستی ہی کہیں نابود ہوتا ہی — ہمیشہ دردِ دل میں کچھ نہ کچھ موجود ہوتا ہی
نظر آتا تو ہی دریائے عرفاں خوب ہی دلکش — سمجھ کا دائرہ لیکن بہت محدود ہوتا ہی
بچھا کر دیکھ لے آنکھیں تو اسکی راہ میں کوئی — وہ خود اپنی خوشی سے آپ آ موجود ہوتا ہی
پڑے پرتو جو خورشید تجلی کا تو روشن ہو — کہ ذرہ بھی کوئی اس دشت کا نابود ہوتا ہی!
فنا کیا ہی بقا کیا ہی ہم اُس کو کچھ نہیں سمجھے — مگر اتنا کہ جو موجود تھا موجود ہوتا ہی
خزاں کیا ہی بہارِ بوستانِ آفرینش کیا؟ — فقط اک انقلابِ دورِ ہست و بود ہوتا ہی!
مقدر ہی حقیقت میں اگر نابود ہو جانا — عبث یارب ظہورِ ہستی نابود ہوتا ہی
حصولِ مدعا ہی مدعا سے ہاتھ اُٹھا لینا — نقابِ چہرۂ مقصود خود مقصود ہوتا ہی
ہم اُس توحید کی باز آئے تصدیق تصور سے — انا لا غیر جس میں حرفِ شرک آلود ہوتا ہی
خود اپنی بندگی کیجئے خدا کی بندگی کیسی — جو معشوق خیالی ہی وہی معبود ہوتا ہی
ہزاروں دل میں ایسے وسوسے آتے ہی رہتے — جو اک مقبول ہوتا ہی تو اک مردود ہوتا ہی
ہم اُس معبود کے صدقے ہم اُس معبود کے قرباں — کہ جب کوئی نہیں ہوتا تو وہ موجود ہوتا ہی
حریفِ نغمۂ آزاد ہوتا ہی وہ محزوں دل — جو درد آلود ہوتا جو غم فرسود ہوتا ہی

گاندھی جی کی جے

وہ خوشی کی دھن وہ خاطر خواہ سے — مژدہ لایا قاصد فرخندہ پے
غم کو لازم ہو کہ اب ہم کم کریں — جام و مینا پر بڑھائیں چنگ و نے
چار دن کے سب تماشے ہیں یہاں — اب کہاں بزم جم و کسریٰ و کے
ہو گئے سرکار کے بھی دستخط — صلح کی شرطیں تو تھیں پہلے سے طے
ہو گئی ترک اور انگلش سے بھی صلح — بولے آزاد گاندھی جی کی جے!

نوحہ

(از افادات مولانا محمد علی جوہر مدظلہٗ)

نوحہ غم سے گھٹاتے نہیں ہم شانِ حسین
حق ہی شاہد کہ شہادت ہی تھی شایانِ حسین

آج ہے اُمتِ احمد کے لیے فخر کا دن
آج کے روز ہوئی فتح نمایانِ حسین

حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسانِ حسین

جو افق پر نظر آتا ہے محرم کا ہلال
ہے ہمارے لیئے وہ مہرِ درخشانِ حسین

کربلا تب سے شہادت کا بنی ہے کلمہ
دین ہی امی و عالم کا اب ایمانِ حسین

شکر حق ہی کہ ابھی حق کی حمایت کے لیے
جان دینے کو ہیں موجود غلامانِ حسین

اُن سے پوچھو کہ جنھیں جان ہو ایماں سے عزیز
کم تھی کس جان سے بتلاؤ تمھیں جانِ حسین؟

اس کو سینچا ہی شہیدوں نے لہو سے اپنے
سبز و شاداب نہ پھر کیوں ہو گلستان حسین

یاں نہ گلچیں کی رسائی نہ خزاں کا ہی گزر
غم سے واقف ہی نہیں بلبل بستان حسین

تب سے جاری ہی یہاں صبر و رضا کا لنگر
دل حاسد کی طرح تنگ نہیں خوان حسین

دولت ایثار کے بٹتی ہی یہاں صدیوں سے
ختم ہوتا ہی نہیں گنج فراوان حسین

حق و باطل کی ہی پیکار ہمیشہ جاری
جو نہ باطل سے دبیں ہیں وہی شیعان حسین

نہیں میدان عمل تنگ مسلماں کے لیے
ہی یہ ہی گوئے حسین اور یہ ہی میدان حسین

ان کی تقلید کے دعوے کی کسے جرأت ہی
کہہ سکے کون کہ ہیں ہم بھی مریدان حسین

نام میں اُن کے اپ جدسے ہی نسبت تو مگر
ق
اور دل سے بھی ہی ہر وقت ثناخوان حسین

گر شہادت کہیں جوہر تجھے مل جائے تو پھر
رہے کوثر پہ بھی وابستہ دامان حسین

شذرات

ہندوستان کا سیاسی مطلع اختلافِ آرا، باہمی مناقشات اور مختلف فسادات نے اس قدر تیرہ و تاریک کر رکھا تھا کہ عام مایوسی بڑھتی جاتی تھی اور اکابرینِ قوم کی معذوری و خاموشی نے ملک کو اور زیادہ بےچین کر دیا تھا کہ بالآخر کانگریس کے اجلاسِ خاص کی تجویز منظور ہوئی اور دہلی میں ایک ہفتہ سیاسی مباحث اور ہنگامہ آرائی کی نذر ہوا۔

کانگریس کا یہ جلسہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے کلکتہ کے اجلاسِ خاص سے کسی طرح کم نہ تھا، کلکتہ نے اگر ترکِ موالات کی ابتدا کی تھی تو دہلی میں اُس عظیم الشان تحریک کو اُس کے پُرخطر دور سے بچانے اور آئندہ کے لیئے وسائلِ کامیابی تلاش کرنے کا اہم و نازک مسئلہ درپیش تھا۔ عام طور سے جو تجاویز دہلی میں منظور ہوئی ہیں اُس پر اطمینان ظاہر کیا جاتا ہے اور اس حیثیت سے دہلی کا اجلاس کامیاب خیال کیا گیا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کا خطبہ صدارت علاوہ اپنے خطیبانہ انداز اور ادبی خوبیوں کے سیاسی مباحث و معاملاتِ ملکی کے متعلق اس قدر واضح، روشن، اور قطعی دلائل سے بحث کرتا ہے جس کے بعد اختلافی مسائل میں جو ناگواری پیدا ہوگئی تھی وہ باقی نہیں رہتی۔ نکتہ چینی کے لیے بہت گنجایش ہے اور بالخصوص وہ حضرات جو خود میدانِ عمل کے تلخ و ناگوار تجربوں سے دور اپنے نشیمن میں لطف و راحت کی زندگی بسر کر رہے ہوں اُن کے لیے تو یہ کام علاوہ دلچسپ ہونے کے بعض حالات میں ضروری بھی ہو جاتا ہے اس لیے اس قسم کے بعض مضامین جواب بہ کثرت شائع ہو رہے ہیں خطبہ صدارت کی وقت نظر اور اصابتِ رائے کے مقابلہ پر ایک لمحہ کے لیئے بھی قابلِ التفات نہیں قرار دیئے جا سکتے

علم کے ساتھ جو شیفتگی انسان کو ہر زمانہ میں رہی ہے اُس کا لازمی نتیجہ وہ عظیم الشان کارنامے ہیں جو صاحبان علم و دانش نے ہر زمانہ اور ہر ملک میں انجام دیئے اور جن کی یاد آج بھی دنیا کیلئے سرمایہ افتخار ہے۔ مسلمانوں نے اپنی علم دوستی و علم پروری کے جو ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیے اُن کی نظیر اس زمانہ میں اُن کی قوم میں تلاش کرنا تو عبث ہے لیکن اللہ کی مخلوق میں دوسری قومیں ایسی ہیں جو آج بھی لیلائے علم کے لیئے اپنے جنون عشق کو اُسی منزل پر پاتے ہیں جس کا لطف صرف مجنوں کی خود فراموشی اور منصور کی سرفروشی ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔

مارگریٹ پولیو، سر مارلیس پولیو کی لڑکی ہے جس نے اپنے رجحان فطری کے تقاضے سے علم طب کی تحصیل اپنا مقصد حیات قرار دیا اور بالآخر ڈاکٹری کی سند حاصل کر لی۔

اس عرصہ میں اس کو خیال پیدا ہوا کہ علم طب ہنوز سرطان کے علاج سے عاجز ہے اس لیے ہر شیدائے طب کا پہلا فرض سرطان کا علاج دریافت کرنا ہے چنانچہ مارگریٹ نے سرطان کے متعلق اپنی تحقیقات اور تجربے شروع کیئے یہاں تک کہ خود وہ بھی اس سم قاتل سے محفوظ نہ رہ سکی اور بالآخر سرطان میں مبتلا ہو گئی۔

اس مہلک مرض کا اُس نے نہایت مسرت سے خیر مقدم کیا اور اُس کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھکر حالت مرض، نتیجہ علاج، اور مختلف تبدیلیوں کے اثرات کے متعلق نہایت صحیح معلومات فراہم کرتی رہی یہاں تک کہ مرض کی شدت نے بالآخر اس شیدائے علم کا خاتمہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ موت سے کچھ قبل تک وہ برابر اپنے نوٹ طیار کرتی رہی!

ایک عرصہ کی خود فراموشی کے بعد سرسید کے "صحیح جانشینوں" کی طرف سے حرکت عمل میں آئی ہے جس نے بیساختہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور ع

بازخواں از نجد و از یاران نجد

کہتے ہوئے ہم جناب شیخ عبداللہ صاحب کی ایک "پرایوٹ و کانفیڈنشل تحریر" پر اظہار رائے

کرنے پر مجبور ہوئے جس کو وہ صرف "بعض مسلمان رہنماؤں" کی خدمت میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ لیکن مطبوعہ گشتی تحریر کے لیے پرایوٹ اور صیغہ راز کا لفظ استعمال کرنا بجائے خود مضحکہ خیز ہے اور لسان الغیب ان صاحبان دانش کی خام خیالی کی طرف پہلے ہی اشارہ کر چکا ہے کہ

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا!

بہرحال، یہ تحریر جو ایک جدید انجمن "مجلس اسلامیہ ہند" کے قیام کی تحریک کرتی ہے اردو میں نہیں بلکہ اپنے "برادران ملت" کے مطالعہ کے لیے انگریزی میں شائع کی گئی ہے، اور ہمارے نجد کی روایات قدیم کے مطابق سر سید کی پالیسی اُس کے بعد اور اُس کے نتائج سے ابتدا کی گئی ہے، نواب محسن الملک کا لارڈ منٹو کی خدمت میں کامیاب وفد، ہز ہائینس سر آغا خاں کی زیر ہدایت مسلم لیگ کا انعقاد گویا کامیابیوں کی غیر محدود فہرست ہے اور تاریخ قدیم کے وہ عظیم الشان کارنامے ہیں جن کی یاد دلا کر "برادران ملت" کو پھر راہِ حق کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

کیا یہ قابل افسوس نہیں کہ اب بھی فریب نفس اس قدر آسان ہے کہ نواب محسن الملک مرحوم کے وفد کو ایک محیر العقول کارنامہ قرار دیا جائے اور اُس قرارداد کو جو لارڈ منٹو سے کی گئی مسلمانان ہند اور ہندوستانی قومیت کی فتح عظیم شمار کی جائے؟

ہندوستان گزشتہ دو چار سال میں سیاسیات کے میدان میں کافی ترقی کر چکا ہے یہاں تک کہ اب وفد کا وجود سیاسیات ہند میں قابل وقعت نہیں بلکہ ایک گونہ قابل ملامت ہو گیا ہے نیز لارڈ مارلے کے تذکرہ کی اشاعت نے منٹو۔مارلے اصلاحات کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے اُس نے لارڈ منٹو کی اُس قرارداد اور وفد کی حقیقت کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہے لیکن وہ جماعت جس نے وفد کی خاطر شملہ کے سفر کے بعد پھر زاویہ عزلت سے قدم ہی نہ نکالا ہو بلکہ بالقصد اپنے کانوں اور آنکھوں کو واقعات عالم اور سیاسیات ملکی سے بیگانہ محض

بنا رکھا ہو اگر اُس وفد کو فتح مبین قرار دیا تو اُس کو معذور رکھا جائے کہ واقعی اُن کی فکر رسا اور اُن کے ماموں مصون زندگی کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔

شیخ عبداللہ صاحب نے اپنے اس مخفی مراسلہ میں جن امور کا ذکر کیا ہے اگرچہ اُن میں کوئی بات بھی قابل اخفا نہیں لیکن شاید اس رازداری کے حصار سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے ایک دل کی بات بھی کہدی ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعی راز کی بات ہے جس کو اب تک انھوں نے مجمع عام میں کہنا گوارا نہ کیا تھا۔ تحریک خلافت کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ "مجھے اس تحریک سے کامل ہمدردی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنے جائز فرائض انجام دیتی رہے یعنی تمام مسلمانان یورپ، ایشیا، اور افریقہ کے جان و مال اور آزادی کے خلاف مسیحی یورپ کی پالیسی کی مخالفت"۔ اپنے راز کو اس طرح برملا ظاہر کر دینے کے جو نتائج بد شیخ صاحب کو برداشت کرنا پڑیں اُس سے قطع نظر کیجئے پھر بھی ہم کو اُن کی یہ ادا پسند نہیں آئی اس لیے کہ اس میں تحریک خلافت کے "بعض ناسمجھ لیڈروں" کا انداز پایا جاتا ہے۔ لیکن شیخ صاحب نے اس افشائے راز کا کفارہ اپنے اگلے جملہ سے فرما دیا ہے جس میں آپ نے اُن ناسمجھ مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے جو خلافت کمیٹی کے ہوتے ہوئے کسی دوسری انجمن یا جماعت کی مسلمانان ہند کے لیے ضرورت نہیں سمجھتے۔ غالباً ان "ناسمجھ لوگوں" کی یہ رائے آپ کے جذبۂ وطن پرستی کے لیے (جس کا اظہار آپ نے سب سے اول کیا ہے) ایک ناگوار ٹھیس ہے۔ ہم کو شیخ صاحب کے جذبۂ وطن پرستی سے بحث نہیں، لیکن اس پردہ میں جو تجویز جناب نے فرمائی ہے اُس کے متعلق ضرور چند الفاظ عرض کریں گے۔

مجلس خلافت ہند کے گزشتہ چند سالہ کارنامے فی الحقیقت عام آزادی کے لیے ایک شدید و سخت جنگ تھی جس میں مسلمانان ہند کو اپنے فطری و جائز حقوق کے لیے ہر ہر قدم

پر لڑنا پڑتا تھا اور ایک وقت تو ایسا آگیا کہ خود مذہبی آزادی خطرہ میں نظر آتی تھی۔

دوسرا اہم مقصد مسلمانانِ عالم اور بالخصوص ترک بھائیوں کی مدد تھی جو اُس وقت بڑی مصیبت میں گرفتار تھے اور خلافتِ عظمیٰ کی حفاظت تھی جو ہر آن خطرہ میں نظر آتی تھی۔ ان اہم مقاصد میں کامیابی کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کے علاوہ بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمانانِ ہند اپنی تمام تر سعی وہمت کا آماجگاہ اس جماعت کو بنالیں۔ چنانچہ گزشتہ چند سال کے واقعات شاہد ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی تمام سیاسی جدوجہد کا ذریعہ صرف خلافت کمیٹیاں رہی ہیں ایسی حالت میں کہ اُن کی وقعت ملک میں مسلم ہو کسی جدید جماعت کو قائم کرنا اور اپنے ایک بردست آرگنائزیشن کو پس پشت ڈال دینا نہ مصلحت کہی جاسکتی ہے اور نہ ضرورت۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ خلافت کمیٹی کی کامیابی اور آیندہ مسئلہ جزیرۃ العرب کے متعلق جدوجہد ابھی سے مسلمانوں کے غمخواروں کو آزار پہنچا رہی ہو اور اُن کو اپنی طبع وفاسرشت کیلئے ایک نئے پلیٹ فارم کی ضرورت ہو۔

ہمارے ایک کرمفرما نے جب اس تجویز کو سُنا تو بیساختہ مولانا رومی کا شعر پڑھا ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — نعوذباللہ
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ہم نہیں چاہتے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کریں کہ شیخ عبداللہ صاحب کی اس تحریر میں "استادِ ازل" کا بھی حصہ ہے اور اُن کی طوطی صفتی "صرف الفاظ ہی تک محدود ہے"، لیکن مولانائے روم کا ارشاد نہیں جس سے تفاول نہ کیا جائے!

غضبِ الٰہی کے جو قصص وحکایات قدیم مذہبی کتابوں میں درج ہیں اُن کی اس زمانہ میں کافی تاویلیں کی گئیں اور ہر واقعہ کے لیے موجودہ حالات اور سائنس کے نظریات سے منطبق ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ لیکن عین اسی زمانہ میں جبکہ یہ جنونِ دانش اپنے شباب پر ہے

دنیا کو ایسے واقعات سے بھی واسطہ پڑتا ہے جن کے متعلق بجز قہر الٰہی کے دوسرا لفظ زبان سے نہیں نکلتا۔ جاپان کا زلزلہ اور اس کی تباہی قوموں کی تاریخ میں اہم ترین واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عین اس وقت جبکہ دولت و ثروت کی فراوانی، سامان تعیش و تنعم کی کثرت اور اقتدار سیاسی کی عظمت سے جاپان حالت سکر میں تھا اس کی غفلت زدہ حکومت کے لیے یہ زلزلہ تازیانہ کا کام دے گیا۔

حال میں جو صحیح اعداد و شمار ان نقصانات کے حکومت جاپان کی طرف سے شائع ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے اور تقریباً پندرہ لاکھ مجروح و معذور ہیں اور اسی قدر بے خانماں ہو چکے ہیں جو یا وجود انسانوں کی آبادی اور شہروں میں ہونے کے بہائم کی طرح بے در و دیوار میدانوں میں نظر آتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ صرف دو روز کے اندر ہو گیا۔ نہ سامان ہلاکت کے لیے کسی اہتمام و صرف کی نوبت آئی اور نہ تباہ ہونے والوں کو اپنی مدافعت و پسپائی کا موقع مل سکا!

✓ ہمارے نامہ نگار خصوصی (برلن) نے خالدہ خانم ادیب مشہور ترکی خاتون سے ملاقات و گفتگو کی جس کی نہایت دلچسپ کیفیت پچھلی ڈاک سے ہمیں موصول ہوئی ہے۔ جس کو ہم بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں۔

خالدہ خانم مشہور ترکی خاتون جو گزشتہ جنگ یونان کے موقع پر معمولی سپاہی کی حیثیت سے خود شریک جنگ ہوئیں اور حکومت انگورہ کے پر خطر و نازک دور میں مختلف خدمات سیاسی انجام دیتی رہی ہیں اب چند ماہ آرام کرنے کے خیال سے جرمنی تشریف لائی ہیں اور جس وقت ہم کو اطلاع ملی وہ میونک میں مقیم تھیں۔ ہم جس وقت پہنچے ہیں وہ ہمبرگ جانے کی طیاری میں مشغول تھیں اور باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے اُنھوں نے از راہ کرم ہم کو ملاقات کا وقت دیا اور تقریباً دو گھنٹہ سلسلہ کلام جاری رہا۔

ممدوحہ کے بچے امریکہ میں تعلیم پاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے ہمراہ تھے اور تعطیل جرمنی میں گزارنے کا ارادہ تھا۔

اثنائے گفتگو میں خالدہ خانم نے سیاسیات ہندوستان سے بہت دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی کے متعلق دیر تک تفصیلی حالات دریافت کرتی رہیں اور قومی تحریک کی عام حالت کے متعلق بھی سوالات کیے۔

تعلیم نسواں سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور ہندوستانی عورتوں کے متعلق نہایت پُرلطف گفتگو رہی۔ ممدوحہ پردہ کی مخالف ہیں لیکن فرماتی تھیں کہ ہندوستان میں پردہ کے ترک پر ابھی اصرار نہ کرنا چاہیئے اول تعلیم دلاؤ پردہ خود ہی کم ہو جائے گا۔

اس کے بعد ہم نے ترکی کے متعلق سوالات کیے آپ نے مختصراً جواب دیئے اور آخر میں فرمانے لگیں کہ یوں تو بڑے بڑے پروگرام پیش نظر ہیں لیکن جب کچھ ہو جائے تب کی بات ہے مسلسل جنگ کے باعث مردوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے پھر یونانیوں نے پسپائی میں بستیاں کی بستیاں تباہ و برباد کر ڈالی ہیں کہ آج تو وہ خاک بھی نظر نہیں آتا ایسی حالت میں ہمارے لیے سب سے پہلا کام معاشی اور پھر تعلیمی ہے۔

گزشتہ جنگ کے ہولناک واقعات کی نسبت فرماتی تھیں کہ آج تک اُن کا کسی کو علم نہیں اس لیئے کہ جو قلیل التعداد جماعت اُس وقت دشمن کا مقابلہ کر رہی تھی اُس کو اپنی مصروفیتوں سے اتنی مہلت نہ تھی کہ بیرونی دنیا کو اپنے حالات سے مطلع کر سکے۔

خاتون موصوف نے ہندوستانی مسلمانوں کی اعانت و ہمدردی کا نہایت خلوص سرگرمی سے شکریہ ادا کیا اور فرماتی تھیں کہ تمام ترکی قوم اُن کی ممنون احسان ہے۔

خالدہ خانم نہایت شستہ و رواں انگریزی بولتی ہیں۔ زمانہ قیام جرمنی میں اپنے ایک ناول کا ترجمہ بھی انگریزی میں کیا ہے جو امریکہ میں شائع ہو رہا ہے۔ بعد اشاعت اُس کے اُردو ترجمہ کی اجازت مرحمت فرمائی۔ رسالہ جامعہ کا بھی ہم نے ذکر کیا، اور آپ نے فوراً مضمون عنایت فرمانے کا وعدہ کیا، لیکن چونکہ اُسی وقت تمبرگ تشریف لیے جا رہی تھیں اسلیئے

جامعہ ملیہ اسلامیہ

کے

تصنیف و تالیف کی شائع کردہ کتابیں

(۱) ایام العرب۔ مؤلفہ مولانا سورتی — قیمت غیر مجلد ۱۲

(۲) تاریخ الامت۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری — قیمت ۸

(۳) ایضاً (حصہ دوم) ۸ (حصہ سوم) — ۸

(۴) مبادی معاشیات۔ از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب — ۱۰

(۵) اخبار الدولتین۔ از مولانا نیاز فتحپوری — (زیر طبع)

(۶) انتخاب کلام میر۔ مرتبہ مولوی نورالرحمن بی اے — (")

(۷) خطبہ شیخ الہند۔ (بہ تقریب افتتاح جامعہ) — قیمت ۲

(۸) خطبہ مسیح الملک۔ حکیم اجمل خاں صاحب — ۲

(۹) انتخاب مضامین جوہر مع تصویر — ۱۰

(۱۰) بزرگوں کی کہانیاں — ۲

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

دیوان غالب اُردو

جس طرح نظم اُردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہی اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہی اُس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہی کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سُرخ جلد پر سُنہرا کام ہی اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہی اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہی جو شروع میں درج ہی اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہی ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہونچ سکے بہرحال درخواست خریداری بھیج دیجیے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہو۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد ۲	ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء		نمبر ۳
نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	قسطنطنیہ کا تعلق اسلام کے ساتھ	مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۱۹۱
۲	شیر شاہ	عبد العلیم صاحب احراری متعلم جامعہ	۱۹۹
۳	ترکی کا مستقبل	جناب مشیر حسین صاحب قدوائی	۲۱۳
۴	کشمیر بہشت نظیر	یوسف حسین خانصاحب متعلم جامعہ	۲۲۳
۵	رفتار تعلیم	"معلم"	۲۴۳
۶	مطبوعات جدیدہ	"ناقد"	۲۴۸
۷	کلام جوہر	مولانا محمد علی مدظلہ	۲۵۲
۸	جزیرۃ العرب	مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۲۵۳
۹	سیر بہشت	مولانا آزاد عظیم آبادی	۲۵۵
۱۰	شذرات	مدیر	۲۵۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | ربیع الاول ۱۳۴۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۲۳ء | نمبر ۴

قسطنطنیہ کا تعلق اسلام کے ساتھ

از جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ

قسطنطنیہ کا شمار اگرچہ مقدس مقامات میں نہیں ہے لیکن اسلام میں اس کی اہمیت نہایت عظیم الشان ہے۔ اس کا تاریخی تعلق اسلام کے ساتھ خود عہد نبوت سے شروع ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت دعوتِ اسلام کے خطوط شاہانِ عالم کے نام بھیجے اس وقت حارث بن عمیر ازدی کے ہاتھ ایک خط ملک شام کے غسانی بادشاہ شرجیل بن عمرو کے نام بھی بھیجا۔ جو قیصر کا ماتحت تھا اور اُس کے اثر سے عیسائی ہو گیا تھا۔

غسانی نے حضرت حارث کو قتل کر ڈالا۔ آنحضرت ؐ نے اُن کے قصاص کے لیے جمادی الاول ۸ھ میں تین ہزار فوج بھیجی جس کا امیر اپنے عزیز صحابی حضرت زید بن حارثہ کو مقرر کیا۔ اور فرمایا کہ اگر

وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب اور جو وہ بھی شہادت پا جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں۔

غسانی نے خبر پا کر مقابلہ کے لیے ایک لاکھ فوج جمع کی۔ ہرقل بھی اس زمانہ میں ملک شام میں آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی امداد کے لیے اپنے بعض امراء کو فوجیں دیکر بھیجا۔

مقام موتہ میں جنگ ہوئی۔ حضرت زید شہید ہو گئے۔ اس کے بعد جعفر بن ابی طالب نے سوسے زیادہ زخم کھا کر جو سب رخ کی طرف تھے شہادت پائی۔ پھر عبداللہ بن رواحہ نے جام شہادت نوش کیا۔ آخر میں خالد بن ولید نے علم سنبھالا۔ اور اس بہادری کے ساتھ لڑے کہ اس روز ان کے ہاتھ میں آٹھ تلواریں ٹوٹیں۔ دشمنوں کے نرغہ سے اپنی جماعت کو نہایت خوبی سے باہر نکال لائے۔ صرف بارہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ مزید مقابلہ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس لئے مدینہ واپس چلے آئے۔

اب غسانی قیصر کی مدد سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ مدینہ میں اکثر اس کی طرف سے متوحش خبریں پہونچا کرتی تھیں یہاں تک کہ کبھی کبھی راتوں کو اس کے حملہ کی افواہ اڑ جاتی تھی اور لوگ مضطرب اور پریشان ہو جاتے تھے۔

آنحضرتؐ نے اسی وجہ سے دوبارہ ۱۱ھ میں ۹ ہزار فوج غسانیوں کے خطرہ کو مٹانے کے لیے تیار کی۔ لیکن یہ لشکر حضورؐ کی علالت کی وجہ سے رک گیا۔ وفات نبویؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اس کو بھیجا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کے لیئے غسانی خطرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ اضطراب ہے وہ رومیوں کی وجہ سے ہے اس لیے امت اسلامیہ کا رخ خطرہ کے اصل مرکز کو مٹانے کی طرف پھیرا۔ اور فرمایا کہ

اَوَّلُ جَیْشٍ مِنْ اُمَّتِی یَغْزُوْ مَدِیْنَۃَ قَیْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّھُمْ — میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اس کو اللہ نے بخش دیا ہے۔

یہ روایت صحیح بخاری اور حدیث کی دیگر کتب میں موجود ہے۔

حضور کو اس امر کا علم دیا گیا تھا کہ پہلے حملہ آور فوج فتح نہیں کر سکے گی۔ اسی لیئے صرف حملہ ہی پر مغفرت کا وعدہ فرمایا اور فتح کی شرط نہیں لگائی۔ اس کے بعد دوسری حدیث میں فتح کی بھی بشارت دی اور فرمایا کہ

لتفتحن القسطنطنیۃ ولنعم الجیش تلک الجیش ولنعم الامیر امیرہا۔ تم یقیناً قسطنطنیہ فتح کرو گے یہ فاتح فوج بھی اچھی ہوگی اور اس کا امیر بھی اچھا ہوگا۔

اس حدیث کو امام حاکم نیز امام احمد بن حنبل نے مسند میں۔ اور ابن عبدالبر نے استیعاب میں حضرت بشر غنوی سے روایت کیا ہے۔

صدر اول میں ملک شام فتح ہو گیا غسانی بادشاہ اسلام لایا اور اس کا خطرہ جاتا رہا۔ لیکن جنگی مشغولیتوں کی وجہ سے قسطنطنیہ پر حملہ کا موقع نہ مل سکا۔

جب زمام خلافت امیر معاویہ کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے اس کی تیاری کی۔ اور ۴۹ھ میں عظیم الشان لشکر فراہم کر کے بری اور بحری دونوں راستوں سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا۔ سفیان بن عوف کو سپہ سالار عام اور اپنے بیٹے یزید کو ایک خاص حصہ کا امیر بنایا۔

مدینہ میں اس وقت جو صحابہ کرام موجود تھے ان میں سے اکثر مغفرت موعودہ کو حاصل کرنے کے لیئے اس لشکر میں جا کر شریک ہوئے۔ مثلاً حضرت ابوایوب انصاری میزبان رسول اللہؐ۔ عبادہ بن صامت۔ ابوالدرداء۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ عبداللہ بن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم۔

لیکن قسطنطنیہ کی فصیل قدرتی طور پر نہایت محفوظ تھی۔ اور رسد کے لیئے راستے کھلے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے محاصرہ زیادہ کارگر نہ ہوا۔ علاوہ بریں عرب کے لیے وہاں کی سردی بھی سخت تھی۔ اور اس موسم میں وہ جزائر میں آ کر رہتے تھے۔ ان سب پر مزید یہ کہ دشمنوں نے نفط سے بہت سی کشتیاں بھی جلا دیں۔ ان وجوہات سے نقصان اٹھا کر واپس چلے آئے

بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ حضرت ابو ایوب انصاری نے بھی وہیں وفات پائی اور
قسطنطنیہ کی فصیل کے متصل دفن کیے گئے۔

دوسرا حملہ پھر بنی امیہ ہی کے عہد میں ۹۸ھ میں ہوا۔ اور سلیمان بن عبدالملک نے
فتح موعودہ کی امید پر اپنے بھائی مسلمہ کو ایک فوج گراں دیکر بھیجا۔ وہ ایک سال تک محاصرہ
کیے ہوئے پڑا رہا۔ اور کچھ نہ کر سکا۔ اس لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد میں
اس کو واپس بلا لیا۔

تیسرا حملہ پھر ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ۱۲۱ھ میں ہوا۔ لیکن اس دفعہ بھی کامیابی
نہیں ہوئی۔

خلفاء عباسیہ میں سے صرف مہدی نے فتح قسطنطنیہ کی کوشش کی۔ اور ۱۶۵ھ میں
اپنے بیٹے ہارون الرشید کو ایک لاکھ فوج دیکر بھیجا۔ وہ باسفورس کے ساحل تک پہونچا۔
ملکہ ایرینی نے جو وہاں اپنے کمسن بیٹے قسطنطین سادس کی طرف سے حکمراں تھی خوشامد کرکے
ہارون کو ۹۰ ہزار دینار سالانہ جزیہ پر راضی کر لیا۔ اس وجہ سے وہ صلح کرکے واپس چلا آیا۔
سلجوقیوں میں سے ملک شاہ بھی حدود قسطنطنیہ تک پہونچا تھا۔ وہاں کے امراء نے
ہزار دینار سالانہ جزیہ پر صلح کر لی۔

آل عثمان نے جب ایشیائے کوچک میں اپنی سلطنت قائم کر لی تو یورپین بادشاہوں کے ساتھ
ان کی مسلسل جنگ قائم ہو گئی۔ جس کے لیے یہ بھی کچھ کمزور نہ تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے پورا بلقان
فتح کر لیا۔ صرف قسطنطنیہ رہ گیا تھا جس کی فتح ان کی نظر میں نہایت اہمیت رکھتی تھی۔ اس لیے
کوشش شروع کی۔

بایزید یلدرم پہلا عثمانی سلطان تھا جس نے اس کا محاصرہ کیا۔ پھر مراد ثانی نے دو لاکھ فوج
کے ساتھ اس کی فتح کی کوشش کی مگر ارض روم کی اندرونی شورشوں کی وجہ سے اس کو
محاصرہ اٹھا کر واپس آنا پڑا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ جس کی قسمت میں یہ سعادت روز ازل میں لکھی گئی تھی۔ تخت نشیں ہونے کے ساتھ ہی اس نوزدہ سالہ نوجوان سلطان سے رومیوں نے غداری کی اور جنگ چھیڑ دی۔ سلطان ان کی دست درازیوں سے تنگ آ گیا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس قسطنطنیہ ایک ایسا سنگیں حصار تھا جس کی بدولت وہ ہر قسم کے خطرات سے پناہ میں تھے۔

سلطان محمد نے وہ حدیث بھی سُنی تھی جس میں اس کے فاتح کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی ہے۔ نیز اس کا باپ اس کے لیے وصیت بھی کر گیا تھا۔ علاوہ بریں رومیوں کے بدعہدی سے اس کے انتقام کا جوش بھڑک اٹھا تھا۔ ان وجوہات سے اس کے دل میں اس شہر کے فتح کرنیکا عزم راسخ پیدا ہو گیا۔

اس فکر میں وہ اس قدر مضطرب رہتا تھا کہ ایک بار شب کو اُسے نیند نہیں آئی۔ آدھی رات کو جب زیادہ بے قراری بڑھی تو وزیر خلیل پاشا کو طلب کیا وہ اس بے وقت کی طلبی سے گھبرایا ہوا پہونچا سلطان نے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ رنج و غم سے میری کیا حالت ہے۔ کروٹیں بدلتا ہوں اور کسی پہلو نیند نہیں آتی۔ میں تم سے صرف ایک درخواست کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ "قسطنطنیہ مجھکو دے دو"۔

دانشمند وزیر نے اس طلب صادق کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب اس شہر کے فتح ہونے کا قطعی وقت آ گیا ہے۔ اس نے سلطان کو تسلی دلائی اور واپس گیا۔

اسی درمیان میں ایک مستجاب الدعوات بزرگ شیخ آقا شمس الدین کو کشف کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ اس سال فلاں تاریخ اور فلاں وقت میں مسلمان قسطنطنیہ میں داخل ہو جائیں گے۔ اس نے وزیر سے کہا۔ وزیر نے یہ بشارت سلطان کو سُنائی۔

سلطان ہر قسم کا ساز و سامان درست کر کے جمادی الاول ۸۵۷ھ کے آغاز میں ادرنہ سے ستاٹھ ہزار سوار اور تیس ہزار پیادہ فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ شیخ آقا شمس الدین اور آق بیگ کو بھی کہ ممتاز بزرگان دین میں سے تھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ تاکہ ان کی دعائیں

کی مدد سے کامیابی حاصل کرے۔ یہ دونوں حضرات بخوشی و رغبت صف مجاہدین میں شامل ہو گئے سلطانی فوج کے ساتھ رضاکاروں اور تماشائیوں کی تعداد بھی دو لاکھ سے کم نہ تھی۔

تین طرف سے محاصرہ کر کے جنگ شروع کی۔ قسطنطنیہ کے گرد جو خندق تھی اس میں خلیج کے دہانہ سے پانی آتا تھا۔ اس دہانہ پر مضبوط زنجیر رومیوں نے لگا دی تھی تاکہ اسلامی جہاز اور کشتیاں نہ آسکیں نیز حفاظت کے لیے جنگی جہاز بھی رکھ چھوڑے تھے۔ مسلمانوں کے لیے فصیل تک پہونچنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے خندق کو پاٹنا شروع کیا۔ لیکن جو یہ دن کو پاٹتے تھے رومی رات کو اس کو صاف کر دیتے تھے۔

سلطان نے اب وہ تدبیر سوچی جو آج تک دنیا میں کسی سے نہیں ہو سکی۔ یعنی اس نے خندق سے سمندر تک دس میل لکڑی کے تختے بچھا دیئے اور ان پر موم اور چربی ڈلوا کر سمندر سے ۸۰ کشتیاں راتوں رات غلطہ کے بالائی حصہ سے لا کر خندق میں ڈلوا دیں۔ یہ کشتیاں سپاہیوں اور سامان جنگ سے لدی ہوئی تھیں۔ صبح کو رومیوں نے شہر پناہ سے ان پر آتش فشانی شروع کی۔ اور یہ کوشش کی کہ نفط سے ان کو جلا دیں۔ لیکن مسلمان ہوشیار تھے۔

آخر وہ وقت آگیا جو آقا شمس الدین نے مقرر کیا تھا۔ لیکن اس وقت تک شہر فتح نہیں ہوا وزیر دوڑا ہوا آقائے موصوف کے پاس آیا۔ دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہوئے دعا کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سر اٹھایا۔ اور کہا کہ فتح مبارک۔ اس وقت فصیل ٹوٹ چکی تھی اور مسلمان شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ وزیر نے آقا کی مبارکباد سلطان کو پہونچائی۔ وہ فوراً سجدۂ شکر میں گر پڑا۔ اس کے بعد کہا کہ میں نے اس فتح پر یہ سجدۂ شکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس بات پر کہ اللہ تعالےٰ نے میرے زمانہ میں ایسے بزرگوں کو باقی رکھا ہے۔

پورے ۵۱ دن کے محاصرہ کے بعد اسلام کی ساڑھے آٹھ سو سال کی امید سلطان محمد کے ہاتوں سے بر آئی۔ ۲۰ رجمادی الثانی یوم چہارشنبہ ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں وہ قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔ اسی روز سے اس کا نام فاتح رکھا گیا۔

تمام عالم اسلامی میں اس فتح پر خوشی کے نعرے بلند ہوئے کیونکہ اس سے آنحضرتؐ کی وہ بشارت جو اُمت کو دے گئے تھے پوری اُتری۔

فتح کے بعد حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار شریف پر عالیشان جامع مسجد تعمیر فرمائی۔ پہلا جمعہ جب اس میں پڑھا گیا تو آقا شمس الدین نے سلطان کی کمر سے تیغ باندھی۔ اُس وقت سے اب تک یہ دستور چلا آتا ہے کہ آل عثمان میں سے جو سلطان تخت نشین ہوتا ہے اُس کی تاجپوشی اور شمشیر بندی کی رسم اسی مقدس مسجد میں ادا کی جاتی ہے۔

حدیثوں میں ایک دوسری فتح قسطنطنیہ کا بھی ذکر ہے جو قیامت سے پہلے ہوگی۔ صحیح مسلم شریف میں متعدد روایتیں ہیں جن کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت قائم ہونے سے پہلے بنی اسحاق میں سے ستر ہزار آدمی قسطنطنیہ پر یلغار کریں گے۔ اور اس کو بلا نیزہ اور بلا شمشیر بغیر اسلحہ کی تکبیر اور تہلیل کے نعروں سے فتح کر لیں گے۔

اس روایت میں بنی اسحاق سے غالباً اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ وہ غیر اہل عرب ہونگے۔ یعنی بنی اسماعیل میں سے نہ ہوں گے۔ تکبیر اور تہلیل سے عیاں ہے کہ وہ مسلمان ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اس روایت سے پہلی فتح جو سلطان محمد فاتح نے حاصل کی نہیں مراد لی جا سکتی۔ کیونکہ وہ بزور اسلحہ شدید معرکوں کے بعد ہوئی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ اس روایت میں اس فتح کی پیشین گوئی ہے جو اس وقت غازی مصطفےٰ کمال نے اس شہر پر حاصل کی ہے۔ اور جس کو دیکھنے کی سعادت ہم لوگوں کو حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء سے یہ دارالخلافہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر بالکل اتحادیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ گو وہاں خلیفہ اور اس کا وزیر داماد فرید پاشا برقرار تھے لیکن صرف نام کے لیے تھے۔ ان کے پوست میں اتحادی نواب حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء کو وزیر مذکور نے شیخ الاسلام دری زادہ عبداللہ افندی سے فتویٰ لیکر ان حامیانِ دین و وطن کو جو سرزمین اناطول میں جمع ہوگئے تھے باغی قرار دیا۔ اور اتحادیوں کے قرضہ سے مصطفےٰ پاشا کردی کی ماتحتی میں اُن کے مٹانے کے لیے

فوج بھی۔ پھر ۲۰ر مئی ۱۹۲۰ء کو مصطفیٰ کمال پاشا۔ فواد پاشا۔ قرہ واصف بک۔ مصطفیٰ فوزی پاشا ڈاکٹر عدنان بک۔ رؤف پاشا وغیرہ پر غائبانہ موت کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ اور ان کے ہر قسم کے فوجی امتیازات اور شہری حقوق ضبط کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

لیکن بتائید الٰہی ان راسخ العقیدت مجاہدوں اور غازیوں نے یونانیوں کو شکست دیکر اس شہر کو بلا اسلحہ کے محض اپنے شیرانہ نعرہائے تکبیر و تہلیل سے پھر فتح کر لیا۔ اب ان کی جانبازفوجیں وہاں داخل ہو رہی ہیں۔ ۲۵ر نومبر کو خود غازی مصطفیٰ کمال کا داخلہ بھی انشاء اللہ نہایت دھوم کے ساتھ ہوگا۔

اس کے بعد احادیث ہم کو کچھ اور بھی آگے لے چلتی ہیں۔ ابوداؤد شریف میں ہے کہ بیت المقدس کی آبادی مدینہ کی ویرانی ہے۔ اور مدینہ کی ویرانی ابتدائے جنگ ہے۔ اس کے بعد فتح قسطنطنیہ ہے۔ پھر ساتھ ہی خروج دجال ہے۔

ترمذی اور ابوداؤد دونوں نے یہ روایت لکھی ہے کہ فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال میں صرف سات مہینہ کا فصل ہے۔

پیشین گوئیوں کے الفاظ میں چونکہ ابہام ہوتا ہے اس لیے آیندہ واقعات کے متعلق ہماری تفسیر ابھی قبل از وقت ہے۔ انشاء اللہ جب موقع آئے گا تو لکھیں گے۔

اس مضمون میں صرف یہ دکھانا تھا کہ قسطنطنیہ کا تاریخی تعلق اسلام کے ساتھ عہد نبوت سے ہے اور قیامت تک رہے گا۔ انشاء اللہ

شیر شاہ

اور

اس کا نظام حکومت

تاریخ میں فرید ابن حسن کا نام مدتوں یادگار رہے گا۔ ایک معمولی جاگیردار کے رتبہ سے ترقی کرکے وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا بادشاہ ہوا۔ اس نے وہ شہرت حاصل کی کہ اب تک اس کا نام تاریخ ہند کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک خاص لطف رکھتا ہے، اوائل عہد جوانی میں اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا بلکہ لوگوں سے کہا بھی کرتا کہ وہ اُس افغانی سلطنت میں جان ڈال کر رہے گا جسے بابر کی تلوار نے پانی پت (۱۵۲۶) کی لڑائی کے بعد بالکل نیست و نابود کردیا تھا۔ ابراہیم لودی کی شکست سے افغانوں کے دلوں میں ایسا خوف بیٹھ گیا تھا کہ مدتوں مغل فاتحوں کے ظلم و ستم کی داستان دہراتے ہی رہے، ذی رائے اور باعزت افغان سردار کہا کرتے تھے کہ مغلوں کا ہندوستان سے نکلنا محال ہے اور فرید کے امید افزا خیالات کی ہنسی اُڑاتے تھوڑے ہی عرصہ میں نوجوان افغان نے اپنے قول کو عمل سے بدل کر دکھلادیا اور ہمایوں کو ہندوستان سے نکال کر چھوڑا۔

اپنی زندگی کے اس بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے بعد وہ دل و جان سے اس ابتری کے دور کرنے میں لگ گیا جو لودی سلطنت کی بربادی کے بعد ہندوستان میں ہر سمت نظر آتی تھی۔ وہ صرف ایک بڑا فوجی قائد ہی نہ تھا بلکہ اس کے ذہن میں چند اسکیمیں بھی تھیں جن کے عمل میں لانے کی کوشش وہ اس وقت سے کر رہا تھا جبکہ وہ خواص پور اور ٹانڈہ میں اپنے والد کی جاگیر کے انتظام میں مصروف تھا۔ وہ ایک قابل منتظم کی حیثیت سے مشہور ہوچکا تھا اور حکومت دہلی کے زمانہ میں تو اس کا انتظام اس قدر پسندیدہ رہا کہ اُس کا سب سے بڑا دشمن ابوالفضل بھی کوئی عیب نہ نکال سکا۔ بدقسمتی سے اس کے اس شعبۂ زندگی کے متعلق معلومات کا اتنا کم ذخیرہ

موجود ہے کہ کوئی لاعلمی کے پردہ کو ہمارے سامنے سے نہ اُٹھا سکا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دربار مغلیہ کے تاریخ نویسوں نے اس کی خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کی ہے اور ان سب کو بڑی خوشی کے ساتھ اپنے آقاؤں سے منسوب کر دیا ہے، پھر بھی یہ ممکن ہے کہ ساری معلومات کو اکٹھا کرنے کے بعد اس کی حکومت کا ایک خاکہ نظروں کے سامنے آسکے۔

بادشاہت بخلاف اپنے بہت سے ہمعصروں کے شیر شاہ نے کبھی اُن رسوم کی کورانہ تقلید نہ کی جنھیں افغان اپنے کوہستانی وطن سے ان میدانوں میں لائے تھے بلکہ اس نے ہمیشہ عملی صورت اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی تیزی فہم کی بدولت یہ معلوم کر لیا کہ بہلول لودی کی قائم کردہ سلطنت ایک بڑی سرداری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور اس کی بقا کا دار و مدار سرداران قبائل کی خوش عقیدگی پر ہے جن میں سے بعض ۴۵ ہزار سے ۵، ہزار سواروں تک کے سردار تھے اور شاہان لودی کی عظمت کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سلاطین لودی کی تاریخ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ باوجود ان تمام فوائد کے جو ایک خون ہونے اور اتحاد مقاصد کی بنا پر حاصل ہو سکتے ہیں بہت ممکن تھا کہ ان اُصولوں پر قائم کردہ سلطنت متلون مزاج سرداروں کے تلون طبع کا شکار ہو جائے اور یہ صورت اُس وقت پیش آتی تھی جب مرکزی طاقت اپنی افضلیت محسوس کرانا چاہتی یا بالکل کمزور ہو جاتی۔ اس لیے اس نے سلطنت کی بنیاد زیادہ مستحکم کرنے کا ارادہ کر لیا اور وہ یوں کہ پھر انھیں اُصولوں کی پابندی کی جائے جنھیں ان سے قبل تاتاری بادشاہوں نے فارس سے حاصل کیا تھا۔ بحیثیت ایک عملی انسان ہونے کے وہ اس کام کی دشواریوں سے باخبر تھا مگر اپنے حیرت انگیز استقلال کی بدولت جس سے وہ ہمیشہ کام لیتا رہا اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں کامیاب رہا اپنی فراست، تدبر، خوش بیانی، اور کامیابی کی وجہ سے اس نے بااثر افغان سرداروں کی نظروں میں عزت حاصل کر لی۔ اُنھوں نے خوشی کے ساتھ اُسے بالاتفاق اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔

بخلاف بہلول لودی کے وہ تخت پر بھی بیٹھا اور ان تمام مناصب مراتب کا خیال بھی رکھا

آداب سلطنت جن کے مقتضی تھے، اس نے قادر شاہ حاکم مالوہ کو سزا دینے میں بہت پیش بینی سے کام لیا جس نے اپنی برتری کا اظہار یوں کیا تھا کہ بجواب فرمان جو خط شیر شاہ کو لکھا اس میں اپنی مُہر سرے پر لگا دی تھی۔ شیر شاہ نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ سلطنت کے بڑے بڑے امراء بھی اس سے ڈرتے تھے۔ وہ کسی مجرم کو سزا دینے میں پس و پیش نہ کرتا تھا خواہ اس کا رتبہ کتنا ہی بڑا ہو خواص خاں، اپنے سب سے زیادہ معتبر اور وفادار وزیر کو بھی اس کی تقصیروں پر سب کے سامنے بُرا بھلا کہنے سے باز نہ آیا شجاعت خاں ایک دوسرے بڑے امیر کی جاگیریں کم کر دیں اور ایسی تنبیہ کی کہ وہ گھبرا اُٹھا اور سب سے بڑے سردار ہیبت خاں نیازی نے تو اپنے قبیلے کے بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالنا اُس کے ناراض کرنے سے زیادہ مناسب سمجھا عباس خاں نے بہت سچ کہا ہے کہ :-

"شیر شاہ کا رعب افغانوں کے دلوں پر ہمیشہ چھایا رہتا تھا خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور کوئی اسکی مخالفت میں سانس بھی نہ کھینچ سکتا تھا" یہ وہی افغان تھے جو اپنی سرکشی اور تلون طبع کے لیے سارے جہان میں مشہور تھے۔

لیکن باوجود اس خوف و دہشت کے کوئی اُس سے نفرت نہ کرتا تھا۔ کوئی ایسا صریح واقعہ نظر نہیں آتا جس سے ثابت ہو کہ کسی امیر نے بھی اس کے احکام کی تعمیل بجبر و اکراہ کی ہو چہ جائیکہ کوئی اس کی مخالفت میں کھڑا ہوتا، امراء اُسے افغانوں کا نجات دہندہ خیال کرتے تھے اور اس لیے اُس کے ہر حکم کی خوشی سے تعمیل کرنے کو تیار رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی وفات کے بعد سوا اعظم ہمایوں کے اور کسی نے اُس کے لڑکوں سے غداری کا خیال بھی نہ کیا اور خواص خاں شجاعت خاں کی مثالیں تو مجسم وفاداری ہیں۔ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو بلا شک ایک زمانہ تک کے لیے اُن واقعات کا سدباب کر جاتا جنھوں نے نہ صرف لودی سلطنت بلکہ سوری حکومت کو بھی برباد کر دیا۔

احساسِ فرائضِ منصبی | شیر شاہ بلا شک و شبہ ایک جفاکش بادشاہ تھا۔ وہ دن رات مصروف رہتا تھا کوئی بات خواہ بڑی ہو یا چھوٹی اس کی تیز نگاہوں سے بچی نہ تھی۔ صبح تین بجے اُٹھتا غسل کرتا

اور نماز پڑھتا پھر مختلف افسروں کی عرضداشتیں سنتا اور اس کے بعد مختلف محکموں کے صدر اپنے معاملات پیش کرتے تھے جن پر فارسی میں احکام صادر کرتا جو باقاعدہ لکھ لیے جاتے تھے۔ اس وقت تک سورج افق پر ظاہر ہو جاتا تھا اور وہ وضو کرکے نماز[۵۱] باجماعت ادا کرتا۔ اس کے بعد وہ امرا اور فوج کے سلام لیتا اور بعضوں سے ملاقات بھی کرتا یہاں تک کہ ایک گھنٹہ گزر جاتا اور نماز کا وقت آجاتا۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ سرداروں اور سپاہیوں کی ضروریات کے متعلق دریافت کرتا اور گھوڑوں کے انتظام کا معائنہ کرتا۔ اب فیصلہ مقدمات کا وقت آتا۔ یہ ایسا کام تھا جس سے شیر شاہ کبھی گھبراتا نہ تھا۔ اس کے بعد خزانوں کا معائنہ کرتا جو باہر سے برابر دارالسلطنت میں آتا رہتا تھا۔ پھر امیروں یا ان کے نائبوں کی رپورٹیں۔ زمینداروں کی عرضیاں اور دوسرے فرمانرواؤں کے پیغام سنتا اور سب کا مناسب جواب دیتا۔ اس طرح دن کا ابتدائی حصہ گزرتا۔ اب وہ اپنے دربار کے علما اور فضلا کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے اٹھتا کھانا کھا کر پھر کام شروع کر دیتا اور برابر دوپہر تک کام کرتا رہتا جبکہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے اٹھ جاتا۔ قریب دو بجے وہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا اور پھر کام میں لگ جاتا۔ اسی طرح وہ تمام دن اور رات کا زیادہ حصہ ان مشغلوں میں گزارتا۔ اس اعتبار سے وہ اورنگ زیب جیسے نفس کش آدمی کا ہم پلہ کہا جاسکتا ہے شیر شاہ کے انتظاموں میں کسی خاص اختراع کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک بڑا موجد نہ تھا لیکن اس نے اپنے زمانہ کے سارے آئین و قوانین نئے سرے سے مرتب کیے۔

عدل | اسلامی قوانین میں انصاف پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ابن بطوطہ جس نے محمد بن تغلق کے زمانہ میں ہندوستان کا سفر کیا لکھتا ہے کہ بعض اوقات بادشاہ بھی قاضی کی عدالت میں ایک معمولی مجرم کی طرح کھڑا نظر آتا تھا۔ شیر شاہ ان معاملات میں خاص طور پر سخت تھا وہ اپنے ایک فرمان میں انصاف کی تعریف یوں کرتا ہے۔ "صرف ظلم سے باز رہنے کو انصاف نہیں کہتے۔ بلکہ ہر شخص کے ساتھ مناسب سلوک کا نام عدل ہے"۔ یہ ماننا پڑے گا کہ آمد و رفت کی دشواریاں

---

۵۱ : نہ معلوم یہ کس وقت کی نماز تھی غالباً فجر کی خرابی کی گئی ہے۔ (احراری)

انصرام اور عدل میں تاخیر کا باعث ہوتی تھیں لیکن یہ کمی بادشاہ اور اُس کے جاسوسوں کے خوف اور ڈاک کے سلسلے سے بہت کچھ پوری ہو جاتی تھی۔ یہ دشواریاں تار ریل اور ڈاکخانہ کے جاری ہونے سے قبل ہر ملک میں پیش آتی تھیں۔ کوئی شخص بلالحاظ منصب و مرتبہ جرم یا قانون شکنی کی سزا سے بچ نہ سکتا تھا۔ باقاعدہ عدالتیں ہوتی تھیں جو دارالعدل کے نام سے مشہور تھیں۔ امیر، قاضی اور میر عدل مقدمات سُننے اور انصاف کرنے کی خاطر اجلاس کیا کرتے تھے۔

شرعی قضیے قرآن اور حدیث کے احکام کے مطابق فیصل کیے جاتے اور مقدمات جو قانون رائجہ کے تحت میں آتے مقامی رواجوں کے مطابق طے ہوتے تھے۔ ہندوؤں کے لیے کوئی علٰحدہ انتظام معلوم نہیں ہوتا۔ غالباً یہ لوگ زیادہ تر پنچایتوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو اسلامی عہد میں اس قدر ناکارہ نہ ہوچکی تھیں جیسی کہ اب ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شاہی عدالت سے محروم رکھے جاتے تھے بلکہ جب چاہتے اس میں مرافعہ کرسکتے تھے۔ ایسے مقدمات کے فیصلہ میں فریقین کی سوسائٹی کے رسم و رواج کا خیال کیا جاتا تھا۔

تعزیری قانون عام اور سخت تھا افغانوں کا قانون قصاص جاری تھا۔ سزائے قید۔ تازیانہ۔ قطع اعضا۔ جرمانہ اور دار عموماً مروج تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ سزا دینے کے لیے کچھ معمولی قوانین موجود تھے مگر عبرت دلانا اصل الاصول تھا اور اس لیے بعض اوقات چوری اور رشوت ستانی کی سزا بھی موت ہوتی تھی۔ شیر شاہ نے افسران جیل کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کسی قیدی کو اُس وقت تک سخت سزا نہ دی جائے جب تک کہ پند و نصائح کے سارے طریقے ناکام نہ ثابت ہولیں۔

شیر شاہ کی سلطنت ۴۷ صوبوں میں منقسم تھی اور ہر صوبہ میں بہت سے پرگنے ہوتے تھے کم و بیش گیارہ ہزار تین سو (۱۱۳۰۰) پرگنے براہ راست بیت المال کے ماتحت تھے۔ ہر پرگنہ میں ایک شق دار، ایک امین، دو محرر (ایک ان میں سے فارسی میں اور دوسرا ہندی میں حساب رکھتا تھا) ایک منصف اور ایک خزانچی ہوتا تھا علاوہ ان عمال سرکاری کے ایک پٹواری

اور ایک چودھری بحیثیت نمایندہ رعایا ہوتے تھے اور حکومت انھیں مانتی تھی۔ ان کے اوپر ایک "افسر شِق دار" اور "افسر منصف" ہوتا تھا جن کی عملداری پورے صوبہ (سرکار) پر ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ ہر سرکار کے لیے ایک "امیر" ہوتا تھا جس کے اختیارات موجودہ زمانہ کے گورنر کے برابر ہوتے تھے۔

یہ متذکرہ بالا عمال اُن علاقوں میں ہوتے تھے جو بیت المال کے تحت میں تھے۔ زمیندارون یا جگزار امیروں، جاگیرداروں اور متولیان وقف کو عام طور پر اپنی عملداریوں میں انتظام کی اجازت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جائداد موقوفہ ایک مجلس کے زیر اختیار ہوتی تھی جو مقامی باشندوں کی بنائی جاتی۔ مزید براں سرکاری عمال کا فرض تھا کہ وہ ان کی نگرانی کرتے رہیں اور رعایا پر ظلم نہ ہونے دیں۔ محرر پرگنہ کا فرض تھا کہ وہ رقبہ آراضی کا جو ہر کاشتکار کے پاس ہو اور مقدار لگان کا جو اسے حق ملکیت و کاشت کے عوض دینی ہو صحیح صحیح اندراج کرے علاوہ اس کے انھیں حکام بالادست کو نقض امن اور بارش وغیرہ کے متعلق معلومات بہم پہونچانی پڑتی تھیں مقامی حکام قیام امن کے بھی ذمہ دار ہوتے اور اگر کوئی جرم ان کے علاقہ میں بلا تفتیش رہجاتا تو وہ مستوجب معزولی سمجھے جاتے۔

محاصل و مالیات: یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شیر شاہ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے آراضی کی صحیح پیمائش کرائی عباس خاں کہتا ہے کہ شیر شاہ کے زمانہ سے پہلے پیمائش کا رواج نہ تھا بلکہ ایک قانون گو ہوتا تھا جس سے پرگنہ کے ماضی حال و مستقبل کے حالات دریافت کیے جاتے تھے۔ یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ پیمائش آراضی جیسی کار آمد چیز فرمانروایان دہلی کے علم سے باہر رہی ہو جبکہ ایران میں شیر شاہ سے مدتوں پہلے سے اس کا رواج چلا آتا تھا اور انھوں نے ایران کا طرز حکومت اختیار کیا یہ صحیح ہے کہ زمین کی عام پیمائش کا تذکرہ شیر شاہ سے پہلے فارسی تاریخوں میں نہیں آتا لیکن پیمائش کی اصطلاحیں مدتوں پہلے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو معلوم تھیں جس سے پیمائش کا امکان ثابت ہوتا ہے ضیاء برنی میں ایک عبارت

جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، حقیقت امر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مقامات کے قانون گو جہاں پیمائش خلاف رواج نہ سمجھی جاتی تھی اپنی ہدایت کے لیے ایسے اندراج کرتے تھے لیکن مرکزی حکومت کی طرف سے عام پیمائش کی کوشش شیر شاہ سے پہلے عمل میں نہیں آئی۔ کچھ بھی ہو یہ تو ظاہر ہے کہ شیر شاہ نے بھی ایسے مقامات پر پیمائش نہیں کرائی جہاں یہ خلاف رواج سمجھی جاتی تھی۔ ہمیں اس کا ایک حکم اعظم ہمایوں کے نام ملتا ہے جس میں اس نے پیمائش کو منع کیا ہے۔ اور پیداوار کا ایک جزلے لینے کا حکم دیا ہے۔

پیمائش آراضی احمد خاں کی نگرانی میں لائق برہمنوں کی مدد سے عمل میں آئی تھی دفتر بیت المال میں ایک جسٹر ہوتا تھا جس میں حقوق مالکانہ اور صحیح رقبہ آراضی قابل زراعت یا ناقابل زراعت درج ہوتا تھا زمین مختلف قسم کی ہوتی تھی اور ہر ایک کا نرخ علیحدہ مقرر ہوتا تھا۔ زمین ہر فصل کے وقت ناپی جاتی تھی اور اس کے مطابق لگان وصول ہوتا تھا۔ نقد مالگذاری وصول ہونے میں کوئی دقت نہ ہوتی مگر جنس کی وصولی کے متعلق صاف اور صریح ہدائتیں تھیں کہ کس قسم کا غلہ لینا چاہیئے تاکہ عمال کاشتکاروں کو ستا نہ سکیں اگر بارش کی کمی یا کسی غیر معمولی سبب سے فصل خراب ہو جاتی تو کاشتکاروں کو حکومت کی استعداد کے مطابق تقاویاں بھی دیجاتیں۔ اگر کاشتکاروں کو مالگذاری کے علاوہ اور کچھ نہ دینا پڑتا تو غالباً ان کی حالت اچھی رہتی مگر اس زمانے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے محصول حکومت اور عمال کی طرف سے لگائے جاتے تھے اور رسم و رواج کی بنا پر مخصوص ہو گئے تھے۔ ابوالفضل نے "آئینہ اکبری" میں ان کی ایک طویل فہرست دی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیر شاہ کی وفات کے بعد بھی قائم رہے ان میں سے خاص خاص یہ تھے۔ مویشیوں کا محصول۔ مختلف عمال کے حقوق۔ ٹھیکہ لینے کا نذرانہ۔ درختوں اور تیل پر محصول۔ فصل کاٹنے۔ مویشی بیچنے اور مچھلی مارنے کی اجازت کے محصول وغیرہم یہ ظاہر ہے کہ ان سے کاشتکاروں کو بہت دقت اور تکلیف ہوئی ہو گی۔

محاصل کی وصولی کے بارہ میں شیر شاہ بہت سخت تھا وہ کہا کرتا تھا کہ ایک بادشاہ

کے لیے بہتر ہے کہ پیمائش کے وقت کاشتکاروں کے ساتھ رعایت برتے لیکن جب ادائیگی کا وقت آئے تو کسی قسم کی رعایت نہ کرنی چاہیئے۔ اور بہت سختی کے ساتھ لگان وصول کرلینی چاہیئے۔ اس اُصول کی پابندی حکومت اور کاشتکاروں کے مفاد کےلیے بہت ضروری تھی۔

آمدنی | مالیات کا مسئلہ شرع محمدی میں کچھ پیچیدہ ہے اگرچہ وہ اصول جن پر یہ مبنی ہے بہت سادہ اور آسان ہیں۔ شریعت کی رو سے آمدنی کی دو بڑی مدیں قائم کی جاسکتی ہیں۔ دنیاوی اور دینی موخرالذکر میں زکوٰۃ داخل ہے جو مویشیوں کے گلے۔ سونے چاندی۔ تجارتی مال۔ پیداوار زمین پر عاید ہوتی تھی اور اول الذکر میں وہ محاصل شامل ہیں جو غیر مسلموں پر لگائے جاتے تھے مثلاً خراج۔ جزیہ۔ غیر مسلم تاجروں پر محصول۔ مال غنیمت اور کانوں پر محصول زمینوں اور لاوارث شخصوں کی جائداد پر محصول۔ ان ذرائع آمدنی کے علاوہ حکومت اور حاکم کی ضروریات اور نئے شرعی محصولوں کے اضافہ پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ زمانہ گزرنے پر رواج میں داخل ہوجاتے تھے۔ اگرچہ ان اصولوں کی کماحقہٗ پابندی نہ ہوتی تھی اور اسلام کی بتائی ہوئی تفصیل محاصل پر کم عمل ہوتا تھا۔ تاہم مسلمانوں کے عہد میں یہ بنیادی اُصول تھے برنی عفیف اور ابوالفضل کی تصانیف پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت روشن ہوجائے گی۔

اخراجات | بیت المال حقیقت میں رعایا کی ملک تھا اور بادشاہ کی ذاتی جائداد سے باہر خیال کیا جاتا تھا۔ قانون اسلامی کی رو سے آمدنی کا ۱/۵ امیر کا حصہ ہوتا تھا اور ۴/۵ مومنین کا لیکن آسانی کے لحاظ سے ہم اخراجات کی بھی دو مدیں قائم کرلیتے ہیں۔ دینی اور دنیوی۔ اول الذکر میں اخراجات متعلق نفع عامہ شامل ہیں مثلاً علما کے وظیفے لنگر خانے۔ سرائیں۔ غربا۔ مساکین یتیم، بڈھوں اور بیواؤں کی امداد اور موخرالذکر میں حکومت کے اخراجات فوجی اور دیوانی اسی میں حاکم کے اخراجات خانہ داری بھی شامل ہیں جو ان کی مرضی پر منحصر تھے فیروز شاہ اگر نفس کش نہ تھا تو مسرف بھی نہ تھا اور عموماً اس کی ضروریات بہت سادہ ہوتی تھیں سپاہیوں

اور افسروں کی تنخواہ یا فوج کی آراستگی کے معاملہ میں وہ بہت سخت تھا۔ اس کو ایک بڑی فوج رکھنی پڑتی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ یہ فوج اکبر کی فوج سے بھی بڑی تھی چنانچہ فوجی مصارف بہت زیادہ تھے۔ محکمہ تعمیرات عامہ میں بھی خرچ بہت زیادہ ہوتا تھا اس لیے کہ یہ اس کے سارے عہد حکومت میں کام کرتا تھا۔

خیرات و اوقاف | خیرات کے کاموں پر بھی کافی خرچ ہوتا تھا۔ اس محکمہ کا صدر قاضی ہوتا تھا لیکن اکبر کی طرح شیر شاہ بھی عطیات کے مسئلہ میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ بہت سی سیاسی اور اخلاقی مصلحتوں کی بنا پر وہ متقی اور متشرع آدمیوں کو اور خیراتی مدارس کو اس فراخدستی سے وظیفے دیتا کہ آخر زمانہ کے تاریخ نویسوں نے بہت سخت الفاظ میں اس کے خلاف لکھا ہے۔ لیکن وہ نہ تو لاپرواہ تھا اور نہ از حد مخیر۔ اس نے ان تمام عطیات کو منسوخ کر دیا جو اس کے قبل غیر افغانی ہاتھوں سے دی گئی تھیں لیکن اس نے لوگوں کو مفلس نہ بنا دیا۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ وہ عالم اور پابند مذہب طبقہ کو اپنی یعنی افغانوں کی طرف کر لینا چاہتا تھا۔ اور وہ ان عطیات کو بہر معقول اور مناسب طریقہ پر تقسیم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ کوئی مستحق شخص محروم نہ رہ جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ نہ پا جائے۔

شیر شاہ نے اس معاملہ میں بہت زیادہ نرمی اور سہولت سے کام لیا اس وجہ سے وہ ان تمام الزامات سے بچ گیا جو علاء الدین خلجی اور خصوصاً اکبر پر عائد کیے جاتے ہیں۔ ایک پرگنہ کے سارے جاگیردار ایک ساتھ دربار میں بلائے جاتے تھے ان کے ساتھ بہت نرمی کا برتاؤ کیا جاتا اور واپس کرتے وقت انھیں زاد راہ بھی دیدیا جاتا تھا سب سے زیادہ اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کاتب لوگوں کو پریشان نہ کریں اور دھوکہ نہ دے سکیں لہذا شیر شاہ ہر کاغذ کو خود دیکھ لیتا اور اسے متعلقہ پرگنہ میں اپنے معتمد ملازموں کے ذریعہ سے بھیجتا تھا۔

مسجدوں اور مدرسوں کے انتظام کرنے کے علاوہ وہ حقدار طلبا اور معلموں کو وظائف بھی دیتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک طالب کو ۱۵۰۰ روپیہ اور ۵۰۰ بیگہ زمین عطا کی۔ بیمار، ضعیف غربا، بیوگان اور اندھوں کے واسطے کافی انتظام تھا۔ غریب خانے جہاں قیام اور طعام مفت

تھا اکثر مقامات پر کھولے جاتے تھے سفر میں اس کے ہمراہ ایک لنگر خانہ ہوتا تھا جس میں محتاجوں کو ہر وقت کھانا ملتا خواہ وہ سپاہی ہوں یا کاشتکار یا فقیر۔ اس کے لنگر خانہ کا خرچ اس زمانہ میں ایک لاکھ اٹھارہ ہزار اشرفی تھا جبکہ چیزیں آج کل سے کئی گنی ارزاں ملتی تھیں۔

موجودہ ذرائع سفر کے ایجاد ہونے سے قبل سفر کرنا ایک زحمت تھی اور اس وجہ سے مسافر کے ساتھ ہر جگہ ہمدردی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مسلمان اور ہندو دونوں مسافر نوازی کو ایک اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ شیر شاہ بھی اور بڑے بڑے بادشاہوں کی طرح مسافروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سڑکوں کو اچھی حالت میں اور خطروں سے محفوظ رکھنے کی بہت زیادہ کوشش کی کچھ نئی سڑکیں بنوائیں اور پرانی سڑکوں کی مرمت کرائی۔ شاہراہوں میں ایک گور (بنگال) سے اودھ تک دوسری بنارس سے مانڈو اور سرحد دکن تک تیسری آگرہ سے بیانا تک ہوتی ہوئی سرحد جودھپور تک اور چوتھی بیانا سے جونپور تک جاتی تھی۔ اس نے آگرہ اور دہلی کے درمیان جنگل کاٹ کر ایک سڑک نکالی جس سے مسافت بہت کم ہو گئی ورنہ مسافروں کو دوآب سے گزر کر جانا پڑتا تھا اور اس میں چکر بہت تھا۔

سڑکیں آج کل کی سڑکوں کی طرح لمبی اور سنسان نہیں ہوتی تھیں۔ ہر بڑی سڑک پر اور خصوصاً شاہراہ عظمیٰ پر جو سونار گاؤں سے اٹک تک جاتی تھی اور اس سڑک پر جو آگرہ سے برہان پور کے قریب تک جاتی ہے ہر ہر کوس پر ایک سرائے۔ ایک پختہ کنواں ایک باغ اور ایک مسجد ہوتی تھی۔ اور اوقاف کی مدد سے جو اسی غرض کے لیے مخصوص تھے یہ ایران کی مرمت ہوتی رہتی تھی۔ ان سراؤں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قیام کا علیحدہ علیحدہ انتظام تھا ہندو اور مسلمان ملازم مسافروں کے واسطے ستو اور گرم پانی پختہ یا خام جنس اور دیگر ضروریات کے مہیا کرنے کے لیے رکھے جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان سڑکوں پر مسافر نہایت اطمینان سے اپنا اسباب کسی درخت کے نیچے رکھ کر اپنے گھوڑے یا مویشی چرانے جا سکتا ہے اور ایک بڈھی عورت بھی بلا خوف خطر زر و جواہر ساتھ لے کر تنہا سفر کر سکتی ہے مسافروں کو سب سے زیادہ آرام ان ثمردار درختوں

سے پہنچاتا تھا جو دو رویہ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ صرف تمازت آفتاب سے بچانے کے لئے ہی نہ تھے بلکہ مسافر اکثر ان کے پھلوں سے بھی فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ آم۔ جامن بیر اور کھرنی کے درخت سڑک کے دونوں جانب لگائے جاتے تھے اور مسافر بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے مفت انھیں توڑ توڑ کر اپنی اشتہا دور کرتے تھے۔ یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ سڑکیں پختہ تھیں یا خام غالباً خام ہی ہونگی۔

پولیس | مسلمانوں کے عہد میں ہندوستان میں بڑے بڑے پولیس کے محکمے نہ تھے تاہم مشہور مقامات اور سراؤں میں کوتوال اور شحنے سپاہیوں کے دستوں کے ساتھ موجود رہتے تھے شیر شاہ نے چوری ڈاکہ قتل یا اور جرائم کے انسداد کے لیے مقامی ذمہ داری کے اُصول سے کام لیا تھا اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آتا تو "مقدم" اس کی تفتیش کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے اور اگر وہ تفتیش میں ناکام رہتے تو انھیں تاوان ادا کرنا پڑتا تھا اور شق دار تو برخاست ہی کر دئیے جاتے تھے۔ اس طرح عمال سرکاری اور غیر سرکاری دونوں جرائم کی تفتیش اور انسداد کی کوشش میں رہتے تھے۔ سارے مورخ اس طریقہ عمل کی تعریف میں یکزباں ہیں اور معلوم ہوتا ہی کہ یہ طریقہ بہت زیادہ قابل اطمینان تھا۔ معمولی پولیس کے علاوہ محتسب بھی ہوا کرتے تھے جو عوام کے اخلاقی محافظ ہوتے اور شراب خواری یا دوسرے اخلاقی جرائم کے انسداد کی فکریں کرتے اور دیکھتے تھے کہ مذہبی احکام کی کہاں تک پابندی ہوتی ہی۔

فوج | افغانی سلطنت کی دوبارہ تنظیم اور غیر ملکی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک بڑی اور مرتب فوج کی ضرورت ہوئی چنانچہ مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے فوج کے دستے سارے ملک میں پھیلا دئے گئے۔ ملتان۔ رہتاس (غربی) سرہند۔ دیپل پور۔ دہلی۔ ہٹکانٹ بیانا۔ گوالیار۔ چنار۔ رہتاس (شرقی) پٹنہ۔ گور۔ رنتھنبور۔ چتوڑ۔ رائسین۔ اور مانڈو میں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ سب سے زیادہ فوج دہلی اور رہتاس (غربی) میں رہتی تھی شیر شاہ ڈیڑھ لاکھ سوار اور پچاس ہزار پیادے اپنے ہمراہ رکھتا تھا

فوج کے چار حصے تھے۔ فیل۔ سوار۔ پیدل اور توپخانہ سواری فوج کی ساری طاقت تھے۔ توپخانہ اس وقت تک بہت اچھی حالت میں نہ تھا۔ ہندوستان میں ہمیشہ جنگی ہاتھیوں سے کام لیا گیا اور ایک ہاتھی پانچ سو آدمیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ شیر شاہ کا ہاتھیوں کا دستہ اکبر کے دستہ سے چھوٹا نہ تھا۔ اس میں کم و بیش پانچ ہزار ہاتھی ہوتے تھے۔

فوج کی تنظیم عموماً قبیلہ وار ہوتی تھی۔ قبیلہ کا سردار اس کا فوجی قائد بھی ہوتا تھا اور اس کی طاقت یا فضیلت کا انحصار اس کے پیرؤوں کی تعداد پر تھا۔ قبیلہ سور کی عظمت سب سے زیادہ تھی اگرچہ وہ سب سے بڑا قبیلہ نہ تھا۔ دوسرے نمبر پر نیازی تھے جن کا سردار ہیبت خاں اعظم ہمایوں تھا۔ اس کی کمان میں تیس ہزار سوار تھے ان کے بعد شروانی اور جلوانی قبائل کو اہمیت دی جاتی تھی جن کے سردار علی الترتیب عیسیٰ خاں اور جلال خاں تھے۔ ان کے علاوہ ہر سرکار میں ایک فوجدار ہوتا تھا جو اپنی عملداری میں فوج کے انتظام کے لیے مقرر ہوتا تھا اور بوقت ضرورت حکومت کو بغاوت فرو کرنے میں مدد بھی دیتا تھا۔

شیر شاہ خوب سمجھتا تھا کہ فوج کو خوش اور منتظم رکھنے میں کیا فائدے ہیں۔ افغان سپاہیوں کی جو کثیر تعداد میں اس کی فوج میں برابر داخل ہوتے رہتے۔ بہت خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ غریب سپاہیوں کو اسلحہ اور گھوڑا بھی دیا جاتا تھا لیکن عام طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ سپاہی خود اپنا انتظام کر لیں گے۔ سپاہی جب چاہتے شیر شاہ تک پہونچ سکتے تھے۔ وہ ان سے بہت شوق سے ملتا اور ان کی عرضداشتیں سنتا۔ اکثر جب سپاہیوں کو تنخواہ تقسیم کی جاتی تو وہ بنفس نفیس موجود ہوتا اور اگر انھیں کوئی شکایت ہوتی تو اُسے دور کرتا۔ باوجود ان باتوں کے وہ ڈسپلن قائم رکھنے میں بہت سخت تھا اور قواعد کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں دیتا بعض اوقات تو پھانسی کا حکم دینے سے بھی نہ چوکتا۔ جب فوج گاؤں سے ہو کر گزرتی تو سپاہیوں کو سخت تاکید کر دی جاتی تھی کہ رعایا کی جائداد کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اگر کاشتکاروں کا کچھ نقصان ہو جاتا تو انھیں کافی معاوضہ دیا جاتا تھا۔ کارگر توپوں کے استعمال سے قبل جنگ

میں قلعوں کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ ہر جنگی مرکز پر ایک قلعہ موجود تھا اور اگر کہیں نہ تھا تو وہاں شیر شاہ نے خود تعمیر کرالیا۔ سب سے زیادہ اہم قلعے جو اس نے بنوائے پٹنہ اور رہتاس (غربی) کے تھے۔

شیر شاہ ایک لائق مدبر تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ شورش پسند افغان، قنوج اور روہیلکھنڈ کے رہنے والے، وسط اور مغربی پنجاب کے باشندے جو اپنے تلون طبع کے لیے بہت کچھ مشہور تھے۔ مجبور کیے گئے کہ امن پسند شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ سڑکوں کی حفاظت تاجروں اور مسافروں کے ساتھ اچھا برتاؤ تجارت کی ترقی کا باعث ہوئے۔ تاجروں کو صرف دو محصول ادا کرنے پڑتے تھے ایک تو سلطنت میں داخل ہوتے وقت اور دوسرا بیچنے کی جگہ پر۔ حکومت کے اہلکاروں کو سخت تاکید تھی کہ وہ مقررہ نرخ سے کم قیمت پر کوئی چیز نہ لیں۔ اگر کوئی تاجر مرجاتا تو اس کے مال و اسباب کی حکومت کی طرف سے نگرانی ہوتی تھی اور جب کوئی جائز وارث مل جاتا تو اس کے حوالہ کردیا جاتا تھا۔ عام خریداروں کے مفاد کی بھی کافی نگہداشت کی جاتی تھی۔ دکانداروں اور تاجروں کو ہدایت تھی کہ اوزان برابر رکھیں، ایک قسم کی چیز کی ایک ہی قیمت لیں اور اس جدول کے مطابق فروخت کریں جو حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا تھا۔ بازار کے شحنوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ان قانونوں پر عمل کرائیں۔

شیر شاہ صرف حکم صادر کرنے پر ہی اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ اس کے نفاذ کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے جاسوسوں اور ڈاک چوکیوں سے بہت مدد ملتی تھی۔ وہ خفیہ طور پر خود بھی لوگوں سے اہلکاروں اور زمینداروں کے متعلق دریافت کیا کرتا تھا اور دوسرے معاملات کی بھی خبر لیا کرتا تھا اس سے ہر شخص مل سکتا تھا وہ سب کی شکایتوں کو نہایت اطمینان سے سنتا اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرتا۔

شیر شاہ خود تو سنی مسلمان تھا لیکن دوسرے مذہب اور عقیدہ والوں سے خواہ مخواہ

تعرض نہ کرتا۔ یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کو اس کی اجازت نہ تھی کہ اسلام کے خلاف تبلیغ کرے لیکن ہر شخص اپنے مذہب کی پوری پابندی کر سکتا تھا اور کوئی مانع نہ ہوتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہندوؤں کو ان کے مدارس کے لیے اوقاف بھی عطا ہوتے تھے اور اس کا انتظام بالکل ان کے ہی ہاتھوں میں چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے مفاد کے مطابق جو چاہیں کریں۔

وہ خود چست و چالاک اور جفاکش تھا اور اس نے حکومت میں زندگی کی ایسی روح پھونک دی کہ سارا ملک امن اور چین سے بسر کرنے لگا۔ اس کی توصیف میں وہ مورخ بھی رطب اللسان ہیں جو اسی زمانہ میں رہتے تھے جبکہ افغانوں سے اظہار ہمدردی جرم سمجھا جاتا تھا۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتا تو تاریخ کے صفحات پر اس کا نام اکبر سے زیادہ روشن نظر آتا تاہم اس قلیل عرصہ میں اس نے وہ کارہائے نمایاں کیے کہ لوگوں کے دلوں میں ایک مدت تک اسکی یاد تازہ رہی

(ترجمہ)

عبدالعلیم احراری

ترکی کا مستقبل

مشیر حسین صاحب قدوائی

میرا ایک پرانا شعر ہے

اوراقِ روزگار پہ ہم نے لکھا ہے نام   اب آسماں سے بھی وہ مٹایا نہ جائیگا

ہم سے یہاں مراد مسلمان ہیں۔ ترکوں کو اللہ سلامت رکھے۔ اُنھوں نے اس شعر کو محض تخیل کی حد سے نکال کر واقعیت کا جامہ پہنا دیا۔ کیا کیا کوششیں گردشِ روزگار نے ترکوں کے جو عرصہ دراز سے اسلام کے علمبردار ہیں مٹانے کی نہ کیں۔ مگر اللہ رے ہمت۔ اللہ رے اسلامی جوش کہ وہ متفقہ اور متحدہ قوتیں جنھوں نے سلطنت آسٹریا و سلطنت جرمنی کی سی قدیم، مضبوط اور دولتمند سلطنتوں کو اپنے احکام نادرشاہی کا مطیع بنا کر چھوڑا ترکوں کے آگے لو۔ اُن ہی صلح کے وہ شرائط ماننے پر مجبور ہوئیں جو ترکوں نے خود سے پسند کیے۔ اور جن کو وہ اپنی شکست کھانے پر ایک قومی عہد میں اپنے لیے خود تجویز کر چکے تھے۔ جرمنی غریب کوشاں ہے کہ کسی طرح فاتحین کا دباؤ کم ہو۔ صلحنامہ ورسیلز میں کچھ بھی رعایت ہو مگر اور سختی بڑھتی جاتی ہے۔ دشمن بیچے ہوئے حصہ ملک پر بھی قبضہ بڑھا رہے ہیں لیکن الحمد اللہ، کہ ترکوں نے عہدنامہ سیورے کی کبھی تصدیق نہ کی اور اب چینی ہی کی طرح اس کو پاش پاش کر کے چھوڑا۔

ترکی کا مستقبل سنہ ۱۹۱۸ء میں کس قدر تاریک ہو گیا تھا اب اس کا ذکر بھی دل کو ناگوار ہوتا ہے۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جو اُس وقت سراسیمہ نہ ہو گیا ہو۔ لیکن مقدر نے اُس سے بھی زیادہ تاریک مستقبل قریب لکھا تھا۔ تین سال تک روز بروز حالت بدتر ہوتی جاتی ہی

سنہ ۱۹۱۹ء میں جب کہ فاتح طاقتوں کے نمایندے بلگیریا۔ آسٹریا ہنگری۔ اور جرمنی کی زبردست سلطنتوں کو اپنی مرضی کے موافق حکم سنا چکے۔ تو وہ غریب بے سروساماں ترکوں کی طرف بھی مخاطب ہوئے۔ ترکوں کی اُس وقت حالت عجیب زار تھی۔ اُن کے

دارالسلطنت دارسلمان عالم کے دارالخلافت میں سب زبردست طاقتوں کے جنگی جہاز لنگرانداز تھے۔ سلطان کے محل کے گرد غیر سپاہ کا پہرا تھا۔ خود جامع صوفیہ کو غیر سپاہ گھیرے ہوئی تھی کہ یونانی اُس کو پھر گرجا نہ بنادیں۔ یا ترک حالت یاس میں اُسے ڈائنامائٹ ( ) سے اُڑا دینا گرجا بننے سے بہتر نہ سمجھ بیٹھیں۔ ترکوں کی تمام فوجی قوت اُس وقت ٹوٹ چکی تھی سامان حرب ضرب سب غنیم کے قبضہ میں آگیا تھا۔ دوران جنگ میں ترکوں نے قسطنطنیہ خاص کو اس قدر محفوظ سمجھا تھا کہ سب کارخانہ بندوق و توپ کارتوس وغیرہ کے بنانے کے اُنھوں نے وہیں رکھے تھے۔ قسطنطنیہ جب قبضہ دشمناں میں آیا تو سب کارخانہ بھی انہی کے قبضہ میں آ گئے۔ جو لڑائی کا متفرق سامان اسمرنا یا اناطولیہ وغیرہ میں بچ رہا تھا وہ بھی ترکوں کے یا تو ہاتھوں سے نکل گیا۔ یا بیکار کر دیا گیا۔ ترکوں کی فوجی تنظیم میں درہم برہم ہو گئی۔ اوران کے بڑے بڑے فوجی ماہر و سپہ سالار یا تو جلاوطن ہو گئے۔ یا دشمنوں کے ہاتھوں قید۔ اُدھر ترکوں کی یہ حالت زار تھی۔ اِدھر فاتحین کی رعونت کی انتہا نہیں تھی۔ اور اُن کا جذبہ انتقام (انگلستان نے سب سے زبردست بری اور بحری شکستیں ترکوں ہی کے ہاتھوں سے کھائی تھیں) پورے جوش پر تھا۔ وہ سمجھے تھے کہ ترکی اُس وقت اُن کے قدموں کے نیچے ہے۔ جو وہ حکم دینگے اُسے قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔ چنانچہ ترکی کے متعلق جو یکطرفہ کمیشن یونان کے کہنے سے مقرر کیا گیا تھا اُس نے یہ فیصلہ قطعی سنادیا کہ ٹرکش امپائر مسٹ سیز ٹو اگزسٹ ( ) رپوٹر ( ) نے یہ نادری حکم تمام دنیا کو پہونچا دیا۔ یہ سُن کر غریب ترکوں نے پیرس ( ) ایک کمیشن بھیجا۔ کہ وہ اس نادری حکم کے ہرگز مستحق نہیں ہیں۔ لیکن اس کو بھی ۲۷ جون ۱۹۱۹ء کو کاؤنسل آف ٹن ( ) نے یہ رعونت مآب جواب دیا کہ ترکی قوم سے زیادہ ظالم اور سفاک کوئی قوم دنیا کے پردے پر نہیں رہی ہے۔ ترکوں میں حکومت کرنے کی مطلق قابلیت ہی نہیں۔ اس لئے وہ بلا فوج و قوت مدافعت اناطولیہ کے ایک مختصر سے رقبہ میں جو زیادہ تر بنجر ہے محدود

کر دئیے جائیں گے۔ اُن کے چاروں طرف اُن کے پشتینی اور جانی دشمن صاحب حکومت و اختیار ہوں گے جن کے پاس فوج بھی ہوگی۔ اور سب سامان حملہ آوری و جنگ۔ اور اُن دشمنوں کی پشت پناہی پر یورپ کی متفقہ قوت رہے گی۔ یہ مایوسی بخش جواب سُن کر ترکوں کا کمیشن واپس گیا۔ اور دشمنوں نے اُسی مقصد کو زیر نظر رکھ کر ایک صلحنامہ (بلکہ عتاب نامہ) مرتب کیا۔ جس پر کوئی حیادار ترک دستخط کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا حتی کہ فرید پاشا بھی پیرس (Paris.) سے بلا دستخط کئے واپس گئے تھے۔ لیکن سلطان معزول وحید الدین نے ایک خبطی شخص (جو فیلسوف مشہور بھی تھے) کو بھیجا۔ اور دشمنوں کے مرتب کردہ صلحنامہ پر پیرس کے ایک مشہور چینی برتن بنانے کے کارخانہ میں دستخط ہوگئے۔ وہ فیلسوف صاحب قسطنطنیہ واپس جانے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔ بلکہ انگلستان تشریف لائے۔ میں نے پیرس کے اسٹیشن پر دور سے اُن کی صورت دیکھی تھی۔ اس صلحنامہ سیورے (Sevres) کی رو سے سلطنت عثمانی عملاً فنا کر دی گئی تھی۔ اور اگر اُس کی ہستی اگر کچھ باقی رہتی بھی تو اُس سے بدتر اور کمزور تر جو ہندوستان کی کسی چھوٹی سی ریاست کی ہے۔ ترکوں پر اس سے جو یاس طاری ہوئی اُس کا اظہار مشکل ہے۔ عارضی صلحنامہ کے بعد سے چونکہ ترکوں سے دنیا سے بالکل قطع تعلق ہو گیا تھا۔ غنیم نے سخت ترین سینسر (Censor) خود قسطنطنیہ میں مقرر کر دیا تھا۔ خود اپنے ڈاکخانہ وغیرہ بھی کھول دیئے تھے۔ اس طرح ترکوں کو باہر کا اگر کچھ حال معلوم ہوتا تھا تو یہ کہ ہر طرف سے اُنھیں پر ملامت پڑ رہی ہے۔ اور ربع مسکون میں کوئی اُن کا ہمدرد نہیں۔ کاؤنسل آف ٹن Council of Ten نے نہایت فریب و دلیری سے یہ تک اپنے جواب میں لکھ دیا تھا کہ "اگر یہ کہا جائے کہ ایک تاریخی اسلامی سلطنت کے رقبہ کی کمی سے ہر جگہ مسلمانوں کے مقاصد کو نقصان پہونچیگا تو ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ ایک غلط خیال ہے۔ کیونکہ کل دنیا کے سمجھدار مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ کے حکمرانوں کی تاریخ حال نہ کچھ ذریعہ مسرت ہے نہ قابل افتخار"۔ اس کے علاوہ دوران جنگ میں ترک خود دیکھ چکے تھے کہ باہر کے مسلمان آ آ کر اُن سے جنگ آزما ہوئے۔ معلوم نہیں کن مشکلوں سے

ترکوں پر یہ حال روشن کیا گیا کہ اُن کے باہر کے مسلمان بھائی اُن سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور میں نے ترکی مسئلہ پر دوسری کتاب جو ۱۵ اگست ۱۹۱۹ء کو انجمن خدام الکعبہ کی طرف سے لندن سے مجلس عشرہ کے ۱۱ جون کے جواب میں دی سورڈ اگینسٹ اسلام آر اے ڈیفنس آف اسلامس اسٹینڈرڈ بیررس (The Sword Against Islam or A Defence of Islam's Standard Bearers) کے نام سے شائع کی اور اپنے ایک ترک دوست کے ذریعہ سے اُسے قسطنطنیہ بھجوایا (میں نے اس کتاب کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا۔ بلکہ دیباچہ میں خود لکھ بھی دیا کہ یہ کتاب صرف یورپ کے لئے ہے جس نے اسلام کے خلاف تلوار اٹھا رکھی ہے) تو وہاں فوراً ہی اُس کا ترکی زبان میں ترجمہ کر کے پچاس ہزار جلدیں ایک دم سے تشہیر کر دی گئیں۔ (تشہیر کرنے والے کو انگریز اسی جرم میں مالٹا پکڑ لائے تھے) ایک نئی روح ترکی قوم میں برق کی طرح دوڑ گئی، جس سے نیشنلسٹ ( ) حرکت پیدا ہوئی۔ یہ میرے دوستوں میں سے ایک نہایت قابل اعتبار شخص نے جو اُس زمانہ میں قسطنطنیہ میں موجود تھا پیرس میں بعد کو اطلاع دی تھی) چونکہ اس سے پتہ چلے گا کہ ایک لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ پر اعتقاد رکھنے والا مسلمان تاریک سے تاریک حالت میں بھی آفتاب امید کی کرنوں کو دیکھ سکتا ہے۔ اور حالت جذب میں دنیا کو اُن کے نمودار ہونے کی اطلاع دے سکتا ہے۔ میں اُس ۱۵ اگست ۱۹۱۹ء کے لکھے ہوئے رسالے کا (جب ترکی مستقبل تاریک ترین ہو رہا تھا) اختتام ترجمہ کر کے درج ذیل کرتا ہوں۔

اختتام | کاؤنسل آف ٹن Council of Ten (مجلس عشرہ) نے ترکی کی قسمت کا فیصلہ اُس سے زیادہ دردناک کرنے کی دھمکی دی ہے جو روم نے کارتھج کا کیا تھا۔

اوراق تاریخ عالم پر ایسے بہت سے موقع نقش ہیں جب کہ پر نخوت ہستیاں تخت جبروت اقتدار پر متمکن ہو کر اور تعصب ہوس کے جذبے سے اغوا پا کر اپنے سامنے سے شکست خوردہ اور مصیبت زدہ لوگوں کو دور باش کہہ کر ہٹا دیتے ہیں۔ اُس وقت وہ اپنی رعونت میں نہ تو اُس غائبانہ دست انصاف کی پروا کرتے ہیں جو گرتوں کو تھام لیا کرتا ہے اور نہ اُس حد انتقام

کی کڑک کو کان دیتی ہیں جو مغرورین کو ورطۂ تباہی سے متنبہ کرتا ہے۔ جوش غضب میں آکر اور خود اپنے سرغناؤں کے وعدوں کو فراموش کر کے مجلس عشرہ نے ایسے احکام جاری کیے ہیں جن سے قوم عثمانی شدید اذیتیں اٹھا کر فنا کر دی جاویگی۔ مجلس عشرہ کے اراکین یہ بات بالکل بھول بیٹھے کہ صاحب ہمت اور الوالعزم ہمت اقوام حیات جاودانی اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں شکستہ خاطر وغم چشیدہ خون افشاں و زخم خوردہ ہونے کے باوجود اور عارضی طور پر مغلوب ہو جانے کے باوصف وہ مکرر دوسرے مرد میدان بنتی ہیں اور خم ٹھوک کر کھڑی ہو جاتی ہیں کہ ظلم وستم توڑنے والوں یا ان کی اولاد در اولاد سے وہ اپنا جدی ملک و مال واپس لیں۔ وہ قوم جو فتح اور کامیابی کے موقع پر دور اندیشی اور رحم سے کام نہیں لیتی بہت جلد وہ دن بھی دیکھتی ہے کہ خود اس کو دوسروں سے ترحم و مروت کی التجا کرنی پڑے فنا کا دست دراز فاتحان و جوانمردان گیلی پولی د) و قطعہ کے جسموں تک پہونچ سکتا ہے۔ لیکن دشمنوں کی یہ امید رکھنا عبث ہے کہ ان کی کل قومی ہستی نیست و نابود کر دی جا سکے گی۔

اسلام ترک جوانمردوں پر برابر ناز کرتا رہے گا کیونکہ وہ اس کے صدیوں تک علم بردار رہے ہیں اور ہمیشہ اس کے نشان کو فلک رفعت بنائے رکھا ہے۔ اگر اب حوادثات زمانہ سے مجبور ہو کر ترک اس نشان مقدس کو اسی بلندی پر نہ اٹھا سکیں جس پر اب تک انھوں نے اسے لاتعداد دشمنوں کے نرغہ میں بھی قائم رکھا تھا تو بھی ان پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ حجاز پاک کے عرب۔ اندلس کے مور۔ ہندوستان کے مغل علم اسلام کو خود اپنے ہاتھوں سرنگوں کر بیٹھے اس لیے کہ وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ تعیش میں مبتلا ہو گئے۔ فرائض میں بھی غفلت برتنے لگے۔ سامان جنگ کی فراہمی سے لاپروائی دکھانا شروع کی۔ اوصاف عالی سے معرا ہو جانے اور ہمت و مردانگی کی کمی کے باعث وہ اس مبارک علم کو بلند نہ رکھ سکے۔

لیکن ترک اب بھی ایک نہایت شریف الخصال جوانمرد قوم ہیں۔ اگر مسلمانوں میں ایک رمق برابر بھی اخوت کا جوشش اور حق برادری ادا کرنے کی ہمت ہے۔ اور اگر وہ اپنے اعلی منزلت

مذہب کے بیمثال نظم کے سمجھنے کا مادہ اور اُس کی قیمت کرنے کا خیال رکھتے ہیں تو وہ ترکوں سے اُسی طرح پائیدار دائمی محبت کا برتاؤ برقرار رکھیں گے جیسا پیشتر رکھتے تھے۔ بلکہ ترکوں کے حال کی مظلومیت اور مصیبت جو غیروں کے قومی تعصب۔ ہوس حکمرانی و خونیاشی کی ان پر لائی ہوئی ہے ترکوں کے ساتھ مسلمانوں کی ہمدردی میں اور اضافہ کا باعث ہوگی۔

پیرس کی مجلس عشرہ نے ترکوں کی قوم کو موت کا حکم سُنادیا ہے لیکن دنیا کی روز افزوں ساڑھے تین کروڑ مخلوق کی برادری نے ایسا کوئی حکم نہیں سنایا ہے۔ نہ اسلام نے سنایا ہے۔ نہ قادر حقیقی نے سنایا ہے۔

قوم ترک ہرگز ہرگز تباہ نہ ہوگی۔ اِنَّ اللہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

اب کہ ۹ راگست ۱۹۲۳ء ہے۔ ترکوں کا مستقبل کس قدر درخشاں ہے۔ میرے سے مجذوب کے نزدیک نہیں جو "ہوائی محل" بنانے کا عادی ہے۔ اور اب نہ جانے کیا کیا خواب اسلام کے آیندہ عروج کے دیکھ رہا ہے۔ بلکہ ایک نہایت تجربہ کار مدبر کی نظروں میں جو سراسر واقعات متدارہ پر نظر رکھتا ہو۔ اس کا اندازہ اس تار سے ہو سکتا ہے جو ہزہائنس آغاخاں نے خود لوزان پہونچکر ترکی نمایندوں سے مل کر صلح کے بعد ہی ہندوستان بھیجا اور جو ۳۰ رجولائی کے پاپونیر میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جس کا ترجمہ یکم اگست کے "ہمدم" میں حسب ذیل تھا:

"میں یہ پیغام لوزان سے ارسال کر رہا ہوں جہاں تاریخ جدید میں سب سے پہلی بار ایک مسلم سلطنت نے مغرب کی دول عظام کے ساتھ مساوات کے درجہ پر صلحنامہ پر دستخط کئے ہیں۔ اس صلحنامہ سے غازی اعظم مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کی اعلیٰ شان اور ثابت قدمانہ قیادت پر درخشاں ترین روشنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ فرانس اور دیگر دول مغربیہ ٹرکی اور اسلام کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہشمند ہیں۔ اس اعلیٰ صلحنامہ کے بموجب ۲۰۰ برس بعد ترکی ایک آزاد، خود مختار او رپیوستہ قومی سلطنت بن جاتی ہے۔ اُس کے اقتدار فرمانروائی کو اب ان امتیازی حقوق سے مضرت نہیں پہونچے گی جن سے اجنبی لوگ مستفید ہوتے

تھے۔ اب سرزمین ترکیہ پر غیر ملکی افواج کے قدم نہیں رہیں گے اور اس کی آزادی و خودمختاری جاپان کی طرح سے کامل ہے۔ تاریخی ادارۂ خلافت علیہ آستانہ میں قائم رہے گا۔ ترکوں کو قسطنطنیہ آدرنہ اور تراقیہ واپس مل گئے ہیں۔ اسلام اس نہایت ہی قابل اطمینان فیصلہ کے لیے ترکوں کی عظیم الشان شجاعانہ قربانیوں اور اُن کی بہادرانہ قوت برداشت و تحمل کا ممنون احسان ہے لیکن ساتھ ہی برطانیہ فرانس اور اطالیہ میں اکثر افراد کی خوش اعتمادی اور پرخلوص مصالحت پسندی کا بھی مشکور ہے۔ نیز ہم بہت کچھ ہز ایکسلنسی وائسرائے اور حکومت ہند کی مسلسل حمایت کے بھی احسان مند ہیں۔

اس صلحنامہ کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ تنازعات و مناقشات کا خاتمہ ہو کر وہ فراموش ہو چکے ہیں اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ترکی دولت علیہ۔ جو اب آزاد و خودمختار ہے۔ یورپ اور امریکہ کے ساتھ مستقل دوستانہ تعلقات بدرجۂ مساویانہ قائم رکھنے کے قابل ہو گئی ہے۔

مسلمانان ہند سے صرف اس قدر میں کہنا چاہتا ہوں کہ مدبرین ترکیہ انگلستان سے دوستی رکھنے کے تہ دل سے متمنی ہیں۔ اور مجھ کو یقین ہے کہ وہ انگلستان کے ساتھ اپنی تجارت کو وسعت بنا بنظر استحسان دیکھیں گے۔ میں اپنے احباب سے یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے موجودہ بحال شدہ دوستی اور تعلقات میں بدمزگی واقع ہو جائے۔ بجائے وہ سرگرمیاں دکھانے کے جو اب قیانوسی ہو گئی ہیں اور جن سے ٹرکی کا کوئی فائدہ نہیں۔ مسلمانان ہند کو چاہیے کہ ٹرکی سلطنت کو اپنی خوشحالی بحال کرنے میں مدد دیں مسلمانان ہند کو معلوم ہونا چاہیے کہ صلحنامہ ٹرکی کی تائید ملک معظم کے مشیران سلطنت نے کی ہے۔ اور اپنے ہندی مسلمان بھائیوں کو جو بہترین نصیحت کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ اس جدید دولت علیہ کو اس کی موجودہ حالت درماندگی میں مدد دیں۔ یہ کام عملی تدابیر اختیار کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ٹرکی نے سخت خوفناک نقصانات برداشت کیے ہیں۔ اور اب اہل ٹرکی کو براہ راست اعانت کی ضرورت ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ ٹرکی کو ہندوستان سے خاص خود روانہ کریں۔ تاکہ ما

جا کر بیماری کا سدباب حفظ صحت کی بحالی صحت عامہ کی درستی۔ پرورش اطفال کی ہمت افزائی اور عام مجلسی فلاح و بہبود کو نشو و نما دینے کا انتظام کریں۔ ٹرکی کی نجات کی امید تو خود فرزندان ٹرکی ہی سے ہے۔ مگر ہم یہ کام اُن کی امداد و اعانت کر کے انجام دے سکتے ہیں۔

میں ٹرکی نمایندہ مقیم لوزان کی معرفت ترکی یتامیٰ کے لیے ایک ہزار پونڈ روانہ کر چکا ہوں میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس صلحنامہ کی رو سے قوم عرب کی حالت ناقابل اطمینان رہ گئی ہے مگر میں یقین کرتا ہوں کہ معاملہ یاس انگیز نہیں ہے اگر ہم کوشش اور خوش اعتقادی کے ساتھ کام کریں تو اب بھی اس مسئلہ کا قابل اطمینان حل ہو سکتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں عربوں کے دوست بیشمار ہیں۔ میں مسلمانوں کی خدمت میں اس صلحنامہ کی دل سے تعریف کرتا ہوں جس کے ذریعے ٹرکی کو تاریخ میں ایک جدید مقام حاصل ہوتا ہے۔ اور امید ہے کہ وہ اس سے زیادہ کے اہل ثابت ہوگی۔ ہم مسلمانان ہند سیاسی طور پر ٹرکی کی مدد نہیں کر سکتے۔ مگر ہم اُسکی مدد اس طرح سے کر سکتے ہیں کہ یہ کام ہم اپنے ذمہ لیں کہ وہاں امن و صلح۔ بہبودی اور خوشحالی و صحت کی بحالی کی کوشش کریں۔ اور اس طرح اس کو تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر بننے میں مدد دیں۔ اس تار کے کچھ حصہ نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ خصوصاً وہ جس میں دول متحدہ کی دوستی کا تذکرہ ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ترکوں کی فتح اور اُن کی کامیابی محض قادر مطلق کی آسمان سے اعانت اور زمین پر ترکوں کی اپنی ہمت و جاں نثاری کا نتیجہ ہے۔ ورنہ یورپ نے اور سب سے زیادہ برطانیہ نے کوئی دقیقہ ترکوں کی سلطنت کو۔ اُن کی قوم کو۔ تباہ و برباد کر دینے کا اُٹھا نہیں رکھا تھا۔

اب بیشک امید کی جا سکتی ہے کہ انگلستان فرانس وغیرہ سب ترکوں سے دوستی کے خواہشمند ہوں گے۔ ترکی کی ایک مثل عرصہ ہوا ترکی سفارت انگلستان کے ایک مشیر نے سُنائی تھی کہ جو ہاتھ کاٹا نہ جا سکے اُس کو چومنا چاہیے۔ یورپ اور امریکہ اسی مثل پر عمل کرتے ہیں۔ خصوصاً انگریز اس لیے تعجب نہیں ہے کہ اب جب ترکی کو فنا کرنے کی ہر کوشش ناکامیاب ہوئی ہے تو اس سے

دوستی کی ٹھانی جاوے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اس سے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں پر قابو پانے میں آسانی ہوگی بلکہ اس لیے بھی کہ ترکی دوستی سے بالشوک خطرہ بالکل زائل ہو جاویگا میں اب یہ بات اپنے ہندوستانی بھائیوں سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے کہ ترکی فتح بولشوک مدد سے ہوئی۔ یا یہ کہ بولشوک ترکوں سے کسی خاص دوستی پر آمادہ ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ترکی اولوالعزمی کی یہ حد تھی کہ باوجود مغربی سلطنتوں کے ناقابل برداشت دباؤ کے ترکوں نے بولشوک شرائط امداد کو منظور نہ کیا۔ اور اپنی آزادی کو اُن کے ہاتھ میں فروخت کرنے سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ اناطولیہ میں جو کچھ ہوا اُسمیں ایک اجنبی کا بھی ہاتھ نہ تھا۔ خود ترکوں نے توپیں درست کیں۔ ریل کے انجن درست کیے۔ اور روپیہ بھی بلا ایک پیسہ کا قرض لینے کے یا کاغذ کا سکہ چلانے کے مہیا کیا اور ایک قہار فوج کو سب سامان سے خود اس طرح مہیا کیا کہ وہ فوج بھی جس کو تمام یورپ نے سامان جنگ رسد وغیرہ سے مضبوط کیا تھا سر پر پیر رکھ کر بھاگنے پر مجبور ہوئی۔ ترکوں کے دل بولشوک سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ اس لیے انگلستان وغیرہ کو ترکوں سے دوستی کرنے میں شاید آئندہ آسانی ہو۔ لیکن یہ ایسی حالت میں ممکن ہوگا جب انگلستان موصل کے مسئلہ میں اور فرانس شام کے معاملہ میں اپنی حرص سے باز آئیں۔ ورنہ میں دس برس کے اندر ہی اندر ان دونوں قوتوں سے یکے بعد دیگرے ترکوں سے تصادم کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

ترکوں کے آئندہ کے متعلق شروع سال رواں میں مجھ سے اور آغا خاں صاحب سے جو گفتگو ہوئی تھی اُس سے مجھے خطرہ پیدا ہوا تھا کہ موصوف یا تو اُس حد تک ترکوں کی قوم کے ضمیر سے واقف نہیں جس قدر میں ہوں۔ اور یا وہ چونکہ اور ذی اثر ہندوستانیوں کے سامنے مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اس وجہ سے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ یورپ (   ) یوں ہی ترکی کا دشمن ہے پین اسلامزم کے ڈر سے ہو رہا ہے وہ ترکوں کے صرف ایک نیشنل اسٹیٹ بننے کے ارادے پر زور دیتے تھے۔ کہ ترک اب اُسی طرح ایک پکیٹ ([illegible]) جس کا ترجمہ

ب صاحب نے ہمدم میں "پیوستہ" کیا ہی) دولت ملیہ National State بنانا چاہتے ہیں جس طرح پ کی دوسری سلطنتیں مثل اسپین وغیرہ کے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بعض تنگ نظر ترکوں کا وہ بھی یہی خیال ہی۔ اور اسی غرض سے خلافت کے متعلق وہ پالیسی برتی گئی ہی جو اسلامی نقطۂ اسے نہایت پست۔ خطرناک اور ناروا ہی۔ باوجودیکہ اُس کی تعریف میں بھی ہمارے "علماء" لسان اللسان ہو رہے ہیں جنھوں نے عرصہ سے اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہی کہ جو رطب و یابس اُن رہنماؤں کے منہ سے نکلے جن کا اثر عوام پر زیادہ ہی اُس پر "جی بجا حضور" کہہ دیں۔ بلکہ اگر ضرورت ہو تو ایک فتویٰ بھی حاضر کر دیں

ہز ہائینس آغا خاں نے اپنے لوزان سے فرستادہ تار میں بھی بار بار (نیشنل اسٹیٹ) National Sta کے جملہ کو دھرایا ہی۔ جس سے میں تو مایوس ہی ہو جاتا۔ اگر آخر میں خود آغا خاں سلطنت ترکی کے "تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر" بن جانے کی امید ظاہر کرنے پر مجبور نہ ہوئے ہوتے۔

ظاہر ہی کہ اگر سلطنت ترکی صرف قوم ترک کی ایک سلطنت بننے کی ہوس رکھتی ہی۔ اور اگر اُس نے ارادہ کر لیا ہی کہ وہ خلیفہ کو اُسی طرح رکھے گی جس طرح مصر کے سلاطین نے ایک وقت رکھا تھا۔ تو مسلمانان عالم کو اُس سلطنت میں کیسی وہ دلچسپی باقی رہ سکتی ہی۔ جو اُس کے علم بردار اسلام ہونے کا باعث ہی۔ آج تو مسلمانان عالم "چنگیز خانیوں" کو "قریشیوں" پر بھی محض اسلام کی خاطر ترجیح دے رہے ہیں۔ اور اُن کو آئندہ بھی ایسی بات کی قوی اُمید ہی کہ سلطنت عثمانی صرف قومی محدود سلطنت نہ ہو گی بلکہ واقعی وہ تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر ہو گی۔ میری امید تو سلطنت ترکی سے یہ ہی کہ وہ تاج ایشیا کا درخشاں ترین جوہر ثابت ہو گی۔ اور وہ ترکوں ہی کی تلوار ہو گی جو ایشیا کے پیر سے غلامی کی زنجیر کاٹ کر پھینک دے گی۔ ہم بھی شانتی شانتی پکارنے سے آزاد نہ ہوں گے۔

لیکن میں اس اندیشہ سے کہ اس وقت "فاش اگر گویم جہاں برہم زنم" فاش گوئی سے پرہیز کرتا ہوں۔ اور اس موقع پر صرف مستقبل قریب کی بابت تھوڑے سے تذکرے کو کافی سمجھتا ہوں۔

ظاہر دیکھنے میں تو نہ صرف مقابلہ طرابلس جنگ سے پہلے سے بلکہ اس عالمگیر جنگ سے پہتے سے
ترکی سلطنت لوزان کی کامیاب صلح کے بعد بھی نہایت مختصر رہ گئی ہے۔ افریقہ میں جو سیادت عم
پر برائے نام دولتِ عثمانیہ کی باقی تھی، وہ بھی اب باقی نہیں۔ یورپ میں صرف ذرا سی چیٹ ہی
باقی ہے۔ ایشیا میں ایک کثیر رقبہ دولتِ عثمانیہ سے بالکل نکل گیا۔ اور شام کا سا زرخیز ملک بھی
ہاتھ سے جاتا رہا جسکو مولانا محمد علی نے اپنے ترجمۂ قرآنِ پاک میں جنت سے تعبیر کیا ہے۔ ترکوں کو اب
بحرِ احمر سے، نہ بحرِ ہند سے، نہ خلیج فارس سے کچھ سیاسی تعلق رہ گیا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ لاہور
کے ایک ہندو اخبار نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اب اسلام کا زوال رُک نہیں سکتا۔ جب سلطنت عثمانیہ
اُس حالت میں قوت نہ پکڑ سکی جس وقت کہ وہ بہت وسیع تھی تو اب جبکہ وہ بالکل مختصر رہ گئی ہے
اُس کا یا اُس کے ذریعہ سے اسلام کا مستقبل کیسے درخشندہ ہو سکتا ہے۔

میں اس قسم کے معترضین کے سامنے تو یہ امر واقعہ پیش کرتا ہوں کہ رقبہ کی کمی سلطنت کے
عروج میں مانع نہیں ہوتی انگلستان ایک ذرا سا جزیرہ دنیا کے ایک گوشہ میں پڑا ہوا تھا زمین
جو تھوڑی سی میسر تھی وہ بھی زرخیز نہ تھی۔ آسمان ہر وقت اشک افشاں ہی رہتا تھا۔ کہر سے
اپنا ہاتھ سوجھنا مشکل ہوتا تھا۔ خلقت غبی الطبع تھی۔ مگر آج وہی انگلستان دنیا کے ایک
بڑے حصے پر قابض ہے اور اُس کی سطوت کا سکہ کل عالم پر بیٹھا ہوا ہے۔ مٹھی بھر انگلستان کے
باشندے تیس کروڑ ہندوستانیوں کی گلہ بانی کر رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ترکوں کی سلطنت
کے رقبے کے کم ہو جانے سے اُن کی قوت میں کمی نہیں آئی ہے۔ اور انشاء اللہ پھر چند دنوں بعد
جب وہ پھر بڑھنا شروع کریں گے تو اُس مرتبہ اُن کو کوئی بھی روک نہیں سکے گا۔ زیادہ تر جو
حصہ ملک عرب کا ترکی کے قبضے سے نکل گیا ہے وہ ترکوں کی قوت کے بجائے اُن کی کمزوری
کا باعث تھا۔ مثلاً یمن جہاں ۲۰ سال سے ترک نوجوان آ آ کر اپنی جانیں نثار کرتے تھے اور
سلطنت کو کچھ بھی فائدہ نصیب نہ ہوتا تھا اور اس جاں نثاری سے ترکوں کی چھوٹی سی قوم روز
بروز کم ہوتی جاتی تھی کیونکہ یمن کی دائمی جنگ میں وہی لوگ زیادہ تر کام آتے تھے جو قوم کی روحِ رواں تھے

کے بڑھانے کا ذریعہ ہوتے اگر بچ جاتے۔ جنگ میں مشغول رہنے سے اقتصادی طور پر بھی ترکوں کا نقصان تھا اس لیئے کہ ترکوں کے کاروباری قابل یا کھیتی کسانی کے قابل نوجوان جبری فوجی بھرتی کے باعث دور دراز مقامات پر اس وقت بھی بھیجدیئے جاتے تھے جب صلح ہوتی تاکہ قلعوں اور سرحد وغیرہ کی حفاظت کریں۔ اس طرح اُنکا سب کام خراب ہوتا تھا اور غیر مسلم رعایا جو جبری بھرتی سے مستثنیٰ تھی ہر وقت اپنے ذاتی کاروبار میں مستعد رہتی تھی اور اُس سے فائدہ اُٹھاتی تھی۔ عرب زیادہ تر قومی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ اس لیئے اُن سے ترکوں کی فوجیں قوت میں زیادہ فائدہ حاصل نہیں کرسکتی تھیں۔ جو حصہ ملک اب ترکوں سے نکل گیا ہے اُس میں کا بعض جزو ترکوں پر شدید مالی بار کا بھی باعث ہوتا تھا۔ مثلاً حجاز پر ترکی حکومت لاکھوں روپیہ سال خرچ کرڈالتی تھی بجائے اس کے کہ بطور اپنے مقبوضہ کے اس سے کچھ خراج وصول کرتی۔ جیسا عربوں نے گزشتہ جنگ کے عین خطرناک وقت میں ثابت کردیا۔ ترکوں کو دشمنانِ اسلام سے جنگ کی حالت میں عربوں سے بجائے نفع کے نقصانِ عظیم ہی پہونچنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ الغرض یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ترکوں کو عربستان سے نکل جانے سے آیندہ کسی بڑی کمزوری کے محسوس کرنے کی کوئی وجہ ہے۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ شام کو وہ پھر دیر یا سویرے ہی فتح کریں گے۔

عربستان کے نکلنے کے بجائے ان کو بحر اسود (   ) کے پاس کا وہ قطعہ زمین حال میں مل گیا ہے جو ان کے لیئے ہر طرح از بس مفید ہے۔ اُس کی آبادی ترکی زبان بولنے والی ترکوں ہی کی ہم نسل ہے۔ اُس کے قبضہ میں آجانے سے جنگی نقطۂ نظر سے سلطنت ترکی اب روس (   ) کے حملے سے زیادہ محفوظ ہو گئی ہے۔ معدنیات بھی اس قطعہ آراضی میں زیادہ ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب بہت لمبی تورانی زنجیر کی یہ پہلی کڑی ترکوں میں آملی ہے۔ انشاء اللہ رفتہ رفتہ سب اسی طرح آکر مل جائیں گی۔ اور ایشیا کا وہ کل حصہ ایک ہو جائے گا۔

میں پیدائشی مین اسلامسٹ (   ) ہوں۔ مگر جیسا میں نے اُس وقت

دوران جنگ میں انگریزی اخباروں میں لکھا تھا جب ہر طرف سے ترکوں سے بدظنی دشمنانِ اسلام پھیلا رہے تھے۔ اور سب سے قوی ذریعہ اس بدظنی کے پھیلانے میں کامیاب ہونے کا نہ صرف اہل یورپ بلکہ ہمارے کرمفرمایانِ حجاز بھی یہ سمجھتے تھے کہ ترکوں کی پین تورانین ( ) خیال کی تشہیر کی جائے۔ میں پین تورانین جذبہ اور کوشش کو بھی پین اسلامزم ( ) سمجھتا رہا۔ اس لیے کسی تورانی معاملہ میں اور کوئی جذبہ اور کوئی تجویز جو اُن کو بیدار کرے وہ اسلام کی قوت کا باعث ہوگی۔ اصل تو یوں ہے کہ عین عالم یاس میں بھی اسلام کے عروج کے لیے میری نظر اُسی قطعہ کی طرف لگی ہوئی تھی جس نے نہایت اولوالعزم اور حملہ آور زمانہ گزشتہ میں پیدا کیے تھے۔ اب بھی میں ترکوں کے زیر اثر اُسی سمت سے مدد اسلام کی توقع رکھتا ہوں اور آئندہ کے لیے سلطنت ترکی کو قارص آرادہاں وغیرہ کا پھر مل جانا نہایت اچھی فال سمجھتا ہوں۔ بلکہ میری صلاح تو ترکوں کو یہ ہوگی کہ وہ عراق کے ریگستان سے پھر خود لینے کی کوشش کے بجائے اوران حیلہ ور باشندوں پر بھروسہ کرنے کے عوض جنکی اجداد نے اپنے پیغمبر کے عزیز نواسہ تک کو نہایت بیرحمی سے دھوکا دے کر ذبح کر ڈالا تھا ایران کو اس کی حوالہ کردیں کیونکہ شیعہ گروہ کے مقدس مقامات اسی خطہ میں بہت زیادہ ہیں۔ اور خود ایران سے اس کے بدلے ایرانی آذربائیجان لے لیں کیونکہ ایرانی آذربائیجان میں بھی ترکی زبان زیادہ رائج ہے۔ اور ترکی نسل آباد ہے۔ الغرض رقبے کے اعتبار سے اب ترکی حکومت زیادہ مضبوط ہے اور مستقبل منور ہے۔

مالی حیثیت سے بھی ترکی کی آئندہ یا موجودہ حالت بعد صلح لوزان بُری نہیں اور پہلے سے بہت اچھی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بہتر ہوجانے کی امید ہے۔ ترکی کا باہر کا قرضہ اب بہت ہی کم رہ جائے گا۔ گزشتہ عالمگیر جنگ نے علاوہ امریکہ کے اور بڑی سے بڑی دولت مند سلطنتوں کی بھی مالی نقطۂ نگاہ سے کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ انگلستان بھی باوجود اس کے کہ اُس کے پھندے میں سونے کی چڑیاں موجود ہیں اب ایک مقروض سلطنت ہوگیا ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہوا ہے

کہ جنگ عظیم نے قرضہ کا کچھ بھی بار اگر نہیں ڈالا تو اس قوت پر جو سب سے زیادہ قلاش تھی ترکوں نے دوران جنگ میں جس قدر قرضہ لیا تھا وہ دولتہائے متوسطہ سے اور وہ خود ترکی اور جرمنی وغیرہ کے دشمنوں نے کالعدم کرا دیا۔ یعنی ترک الزام سے بھی بری ہو گئے۔ بعد عارضی صلح کے ترکوں نے جو جنگ چار سال تک جاری دہ محض اپنی قوت پر اور انھوں نے ایک پیسہ بھی کہیں سے قرض نہیں لیا۔ نہ کاغذ کا سکہ ہی بنایا۔

قبل جنگ عظیم کے ترکوں پر باہر کا بہت قرضہ تھا اس میں جس قدر روس کا تھا وہ زار کی حکومت کے فنا ہونے کے بعد جس طرح ایران میں فنا ہو گیا اسی طرح ترکی میں۔ اب رہے دوسرے قرضے سو ان کی بابت لوزان میں یہ طے ہو گیا ہے کہ جنگ طرابلس و بلقان سے اس وقت تک جو ملک ترکی سلطنت سے الگ ہوئے ہیں ان کا قرضہ حصہ کے حساب سے علٰحدہ شدہ ممالک پر ڈالا جائے گا۔ ترکی کے ذمہ سے وہ اتر جائے گا۔ اس طرح ایک کثیر رقم کے قرضہ سے ترک سبکدوش ہو گئے۔ اور تازہ رقبہ جو ان کو واپس ملا ہے وہ قرضہ سے پاک و صاف ہے۔

لیکن سب سے دل خوش کن بات جو آیندہ کے عروج کی اور ترکی سلطنت کی بہتری کی سب سے زیادہ ضامن ہے وہ وہی ہے جس کی طرف آغا خاں صاحب نے توجہ دلائی ہے یعنی یہ کہ دو سو برس کے بعد ترکی حکومت کو واقعی خود مختاری نصیب ہوئی ہے اور آج ترکی اسی طرح آزاد ہے جس طرح جاپان یا خود انگلستان۔

کیپی چولیشن در (مراعات) جو اول اول ترکی سلطان نے اپنی اسلامی رواداری کے باعث خود اپنے سر منڈھے تھے اب ترکی کی گردن کے لیے ایسا بھاری پتھر بن گئے تھے جو اس کو پانی کے اندر روز بروز زیادہ گہرائی میں لیے جا رہا تھا۔ ان رعایات مخصوص کے باعث ترکی حکومت عرصہ دراز سے اپنی اصلی خود مختاری اور آزادی کھو بیٹھی تھی جبکہ نواب صاحب رام پور بھی اپنی ریاست میں ہر طرح کا ظلم و ستم برطانوی رعایا پر توڑ سکتے ہیں سلطنت عثمانی جو ہر سہ برِ اعظم پر پھیلی ہوئی تھی اس بات پر مجبور تھی کہ وہ ہر اجنبی خطاکار

کو فوراً اس کی عدالت کے جو سلطنت عثمانی کے اندر اجنبی دول نے قائم کرائی تھیں پیش کرے۔

جبکہ نظام حیدرآباد کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے یہاں چنگی کا جو محصول چاہیں لیں دولت عثمانی کے لیے ایک حد مقرر تھی جس سے زیادہ وصول کرنے کا اُسے مطلق حق نہ تھا۔ دولت عثمانی کی نوبت یہ پہونچی تھی کہ جو آمدنی اُس نے اپنے کسی قرضہ میں کسی کمپنی کے پاس مکفول کی تھی اُسے وصول کرنے کے لیے وہ کمپنی خود اپنے عہدہ دار مقرر کر سکتی تھی جس طرح کوئی چھوٹے سے زمیندار کی اُس جائداد کا حال ہو جس پر قبضہ مرتہنانہ ہو گیا

ترکی سلطنت کے اجنبی باشندے ٹیکسوں سے بھی مستثنیٰ تھے۔ الغرض قبل منحوس غیر مصدقہ عہدنامہ سیوریے کے بھی حکومت ٹرکی ہرگز کل طور پر خود مختار نہ تھی۔ اصل خود مختاری اسے اب ہی حاصل ہوئی ہے۔ اور قوی امید ہے کہ اسی طرح آزاد شدہ سلطنت ترکی جاپان سے بھی زیادہ قوت دار آیندہ ثابت ہوگی۔ اور دول عظمیٰ میں نمایاں رتبہ حاصل کرے گی۔

خداوند کریم کی عجب کارسازی ہے کہ جبکہ جرمن۔ اسٹریا ہنگری۔ بلگیریا سب پر شکست کے بعد سے فوجی قیود عائد کردیئے گئے ہیں اور بحری قوت سب کی فنا کردی گئی ہے، ترکوں نے اپنے کو ان قیود سے بھی آزاد کر لیا ہے۔ ابھی میرے پاس پورا معاہدہ لوزان نہیں پہنچا، مگر چونکہ میں ترکوں کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں مجھے یقین کامل ہے کہ اُنھوں نے جنگی جبری خدمت کے حق کو کسی طرح نہ دیا ہوگا۔ جو جرمنی وغیرہ سب سے لیا گیا ہے۔ اور یہ تو مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا جنگی جہاز گیوبن (جو جرمنی سے بھاگ کر آگیا تھا) جس کو میں نے بعد جنگ مارسیلیز کے سمندر میں معمولی جہازوں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر آہ سرد کھینچی تھی اُن کو واپس مل جائے گا۔ یونان نے بھی اُن کے سب گرفتار کردہ جہاز واپس دیئے۔ گو ترکوں کو اب بحری تیاری میں بہت نہ صرف کرنا پڑے گا اس لیے کہ ساحلی رقبہ سلطنت بہت گھٹ گیا ہے پھر بھی اگر ان کو ایک طاقت ور اثر دار دولت بننا ہے تو بحری اور ہوائی سامان کی بھی خبر رکھنی ہی پڑے گی۔ اس لیئے آیندہ کے لیے ہمارے سب کے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ جبکہ جرمنی کا بیڑہ جہازات سمندر کی

تہ میں پڑا سڑ رہا ہی تو ترکوں کے دو چار جو جہاز تھے وہ ان کو واپس مل جاویں گے۔ سلطنت ترکی جنگ کے بارے سے بھی قریب قریب بالکل بچ گئی ہی۔ انگریزوں نے جو دو جہاز واپس نہیں کیئے ان کی جگہ ترکوں کو چاہیے کہ جہاز خود اپنے یہاں بنالیں۔

سلطنت ترکی آیندہ اجنبی طلبگاران رعایات کی شکار نہ ہوگی۔ بلکہ اپنی اقتصادی ترقی اپنی سب مرضی کرے گی۔ ترکوں نے یہ دوراندیشی کی ہی کہ اقتصادی ترقی میں مدد امریکہ سے حاصل کی ہی۔ بجائے حالت ماسبق کے کہ یورپ کی دول کے سپرد سب کچھ ہو جاتا تھا۔

معاہدہ چسٹر (   ) بھی تاریخ عثمانی میں ایک نیا باب ہی۔ اور مستقبل کے لیے امید افزا۔ لیکن میں ترکوں کو آگاہ کرتا ہوں کہ وہ "سگ زرد برادر شغال" کی مثل کو نہ بھولیں۔ اور جلد سے جلد جاپان کی طرح خود اپنے ہات سے اپنی اقتصادی ترقی کی طرف متوجہ ہوں۔

خدا کا شکر ہی کہ اب اس میں ان کو آسانی حاصل ہو گئی ہی۔ اور کم سے کم چار پانچ سال تک تو اُنھوں نے سب اپنا کام خود ہی کیا ہی۔ بات یہ ہوئی کہ دوران جنگ میں چونکہ جرمنی ترکوں کا حلیف تھا اس لیے اُس نے اِس کی بہت کوشش کی کہ ترک صنعت و حرفت نیز فلاحت و زراعت میں ہوشیار ہو جائیں تاکہ اُس کو مدد دے سکیں اور خود بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ تاکہ جرمنی کو ان کی زیادہ مدد نہ کرنی پڑے۔ اس غرض سے جرمنی نے معلم اور کتابیں وغیرہ ترکی کے ممالک میں پھیلا دیئے تھے۔

عارضی صلح کے ہوتے ہی جرمن کا خود تو ایک متنفس بھی سرزمین عثمانی پر باقی نہ رہنے پایا لیکن تعلیم رائیگاں نہیں ہوئی۔ اور خود ترکی زبان میں بھی اک ذخیرہ جمع ہو گیا۔ پھر بھی ترکوں کو جاپانیوں کی حالت پر پہنچنے کے لیے جلد سے جلد ہزارہا نوجوان یورپ اور امریکہ حصول علم کے لیئے بھیجنا چاہیے۔ تاکہ وہ واپس آکر دوسروں کو تعلیم دیں۔ اور خود بھی کمپنیاں وغیرہ قائم کریں۔ تعلیم صنعت و حرفت کی ایک ایسی مکمل جامعہ (   ) فوراً کھلنی چاہیئے جہاں ہندوستان سے بھی طالب علم حصول علم کے لیے پہنچیں۔ جبکہ ترکوں کی آیندہ زندگی اُن کی ترقی

بحری و ہوائی قوت پر منحصر ہے اور لازمی ہے کہ وہ مضبوط اور آلاتِ حرب حال سے مسلح فوج، زبردست بیڑہ جہازات ہوائی و دریائی۔ نیز آبدوز کشتیاں موجود رکھیں۔ آیندہ کی ان کی بہبودی کا انحصار اس پر بھی ہے کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی ترقی سے مطلق غافل نہ ہوں۔ اور سب سامان حرب و ضرب خود اپنے ہی ملک میں تیار کریں۔ وہ یہ یاد رکھیں کہ آیندہ جنگ کے لیے بھی لازمی ہے کہ وہ طبیعات وغیرہ میں ترقی کریں۔ ورنہ ان کی معمولی بہادری و شجاعت بھی زیادہ کام نہ آئے گی۔ آیندہ جنگ میں علم کیمیائیت کام آئے گا اور کیمسٹری مسلمانوں کا اپنا ایجاد کردہ علم ہے۔ "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" ترکوں کا آیندہ موٹو ہو جرمنی ان کا بہترین معلم بنے گا۔ یہ کہ سلطنت عثمانی کس طرح تاج اسلام کا درخشندہ ترین جوہر بن سکے گی اور قومیت کے محدود دائرہ سے نکل کر وہ کس طرح پھر ایک عالمگیر زبردست سلطنت بنے گی اور اس کے لیے مسلمانانِ عالم کو کیا کیا کوشش کرنی پڑے گی یعنی ترکی کے مستقبل کا پین اسلامک پہلو کیا ہے ابھی ایک پین اسلامک دماغ ہی کے پردہ میں اس کا خاکہ عمل محفوظ رہنا مناسب ہے۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت پر نگاہ رکھ کر مجھے نہ صرف واسطے ہنود بلکہ مالوی شردھانند کے بھی یہ گوش گزار کر دینا ضروری ہے کہ ترکی کا مستقبل اور ہندوستان کا مستقبل ایک ہی زنجیر سے وابستہ ہے گو اس وقت درمیان میں بہت سی کڑیاں ہیں۔ بلکہ عرب کا ترکی سے علحدہ ہو جانے سے کچھ فاصلہ اور زیادہ ہو گیا ہے۔ مگر چونکہ ایشیا کا آیندہ اب ترکی سے اور زیادہ وابستہ ہو گیا ہے اس لیے ہندوستان کی حالت کا انحصار ترکی کی آیندہ حالت پر زیادہ ہے۔ یاد رہے کہ اب زمانہ آیندہ میں کل ایشیائے قریب کی رہنمائی ترکوں ہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ جو ہنود ہندوستان کی آزادی کے لیے جاپان کی طرف آنکھ اُٹھاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

میرے سینہ میں پین اسلامک جوش نہیں ہے بلکہ پین ایشیاٹک بھی ہے جب میں پین اسلامک سوسائٹی کو لندن میں چلا رہا تھا تو اسی زمانہ میں میں نے کوشش کی تھی کہ ایک پین ایشیاٹک سوسائٹی قائم کروں۔ چونکہ ایشیا کی سب سے زیادہ طاقت دار سلطنت جاپان کی تھی اسلیے

اس کے سفیر سے رجوع کیا۔ مگر اُس طرف سے مطلق کوئی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ
اور بیسیوں طرح سے جاپان نے یہ روشن کر دیا کہ اُس نے اپنی قسمت کو مغرب کی دولتوں کی قسمت
کے ساتھ آویزاں کر دیا ہے۔ اور اُس کی امکانی کوشش یہ ہے کہ وہ بجائے ایک ایشیائی قوم
کے ایک مغربی قوم سمجھی جائے۔ برخلاف اس کے ترکوں نے چار سو برس یورپ پر حکومت
کی لیکن اس صلح پر دستخط سے چند ہی روز پیشتر لوزان سے یہ خبر آئی تھی کہ لاکھ کوشش
کی جاتی ہے کہ ترک ایک یورپی قوم بنیں اور گو وہ چار سو سال سے یورپ میں ہیں مگر وہ وہی
ایشیائی قوم رہتے ہیں۔ میں نے مولانا ابو الکلام صاحب کے زبردست اخبار "الہلال"
میں دس بارہ سال ہوئے یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ ایشیا کی بہبود جاپان کے بجائے ترکی سے
متعلق ہے۔ اور گنگا پرشاد ورما کے سے زبردست قوم پرست اور اپنے مذہب ہندو کے عاشق
نے بھی میرے استدلال کو تسلیم کیا تھا۔ حال میں تو اپنے عمل سے جاپان نے اور بھی ثابت کر دیا
کہ ایشیا کے فوائد پر اُس کی مطلق نظر نہیں بلکہ لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اس جنگ میں اُس نے
ایشیا کو (   ) کر کے خود ہی نقصان پہنچایا۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی ایشیا کی رہنمائی
ترکوں ہی کے ذمہ عائد ہوگی۔ ہندو بھائیوں کو یہ یاد رہے کہ دریائے انڈس سے لیکر دریائے
مرتضیٰ تک یہ ایک طویل حصۂ عالم جس میں زیادہ تر ایشیائی ہی ہیں ایک وقت ترکی سیادت
میں متحرک ہوگا۔ اور ہندوستان کے لیے دو ہی راستے ہوں گے یا تو اس عظیم حرکت کا وہ
ساتھ دے اور بھائی کی طرح اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے اور یا اس حرکت کو اسی طرح اپنی طرف
کھینچ لے جس طرح پہلے ایک بار ہو چکا ہے۔ اور خود پھر دب کر رہ جائے۔ یاد رہے کہ شدھی اسندھی کی
تحریکیں۔ یہ سنگٹھن یہ ہندو اکھاڑے کام آنے والے نہیں۔ اگر ہندوؤں کو غلامی سے نکلنا ہے
اگر اپنے ملک کے لیے ان کو سوراج حاصل کرنا ہے تو ہندو مسلمانوں کو مل کر چلنا ہوگا۔ ورنہ ہندوستان
کی تاریخ پھر اپنے کو دُہرائے گی اور ہندوستان پھر فاتحین کا جولانگاہ بنے گا۔ مسلمانانِ عالم
بے تعلق ہو کر اور ہندوستان کے مسلمانوں سے بگاڑ کر کے ہرگز ہندوستان کی فلاح زمانہ

مستقبل میں ممکن نہیں۔

دنیا کا کوئی ملک اب سب سے الگ ہو کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ ہندوستانی بھی اب ہمالیہ کے اندر ہی دنیا کے حدود نہیں تصور کر سکتے۔ اب ایک قوم کو دوسری باہر کی قوموں سے رابطہ اتحاد قائم کرنا ضرور ہوگا۔ نیشنلزم کی جگہ اسلام کی اول اول قائم کردہ انٹرنیشنلزم کا دور دورہ ہوگا۔ ہندوستان کے لیے ترک ہی فطرتی دوست ہوں گے۔

وہ مسلمانان ہند کے بھائی ہیں اور یہ برادرانہ سلسلہ اب مسلسل برابر قائم ہو جائے گا۔ ابھی وقت تک جو بہت بڑی روک روس کی تھی وہ ٹوٹ گئی اور نہیں ٹوٹی تو جلد ٹوٹ جائے گی۔

اس وقت زار کی حکومت مانع تھی۔ قومی جوش مسلمانان روس میں نہیں پیدا ہونے پاتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اگر آج بالشوک بخارا اور خیوا کے اس طرف یا روسی آذربائیجان کے دوسری طرف جانے میں کامیاب بھی ہوئے، ترکمانوں کی آزادی میں حائل بھی ہوئے تو عنقریب ہی جب اس طرف افغانستان اور دوسری طرف ترکوں کا دباؤ پڑے گا۔

(اور زمانہ مستقبل میں ایران بھی بیچ میں دباؤ ڈالنے کی قابل انشاءاللہ ضرور ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عنقریب ہی ترک سورما اس کی فوجی حالت کو درست کرنے میں معاون ہونگے) تو روس کو اپنی ہی خیر منانا مشکل ہوگا۔ الغرض جہاں تک انسان مستقبل کا اندازہ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اب ہندوستان کا ہم سرحد صرف ایک ذرا سا افغانستان نہ ہوگا بلکہ کل اسلامی ایشیا۔ اہل ہند کو چاہیئے کہ اپنی اندرونی اور بیرونی سیاست میں اس امر کو فراموش نہ کریں۔

میں پھر کہتا ہوں کہ مستقبل ترکی مستقبل ہندوستان سے وابستہ ہے۔

ہندو مسلمان آٹھ نو سو سال سے بھائی بھائی کی طرح ہندوستان میں آباد ہیں۔ اگر اب بھی ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں تو دونوں پر لعنت۔ اب ہندوستان یہاں کے مسلمانوں کی اسی طرح ماں ہے جس طرح ہندوؤں کی۔ مسلمان ہرگز غیر بن کر نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کے بہت سے رسم و رواج کو بھی قبول کر لیا ہے۔ ہندوستان کی بہتری مسلمانان ہند

کی بہتری ہے۔ ہندوستان کا نقصان، ہندوستان کی غلامی اُن کی غلامی ہے۔ جب تک ہندو بھی آزاد نہ ہوں، ہندوستان میں فلاح نہ ہوگی۔ اور مسلمان ہرگز ہرگز آزاد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اگر ہندوستان دستِ غیر میں اسی طرح آلہ بنا رہا جیسا اس وقت تک ہے تو تمام ایشیا (ترک، عرب، ایران اور مصر) خطرہ میں رہیں گے۔ اس وجہ سے مسلمانانِ ہند کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ ترکی کی یا کسی اسلامی سلطنت کی بہبودی چاہتے ہیں تو ہندوستان کے ہندوؤں کو اپنے ساتھ رکھیں۔ اور دستِ غیر میں ان کو آلہ بننے دیں۔ جس طرح ہندوؤں کو اپنے ملک کی آزادی کا خیال ہو مسلمانوں کو بھی اسی طرح چاہیئے۔ جس طرح ہندوؤں کو بیرونی حملہ سے ہندوستان کو بچانے کی فکر ہو۔ مسلمانانِ ہند کو بھی ویسی ہی فکر چاہیئے۔ ایک مسلمان کو بھی اس کا حق اسلام نے نہیں دیا ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو غلام بنائے جس طرح افغان و ترک اور عرب اپنے ملکوں کی آزادی میں کوشاں ہیں ہم مسلمان اپنے ملک ہند کی۔ جس طرح قادرِ مطلق مالک الملک نے اُن کی مدد کی اسی طرح ہماری بھی مدد کرے۔ آمین۔

کشمیر بہشت نظیر

"جو لوگ کیفیات نفسی کے حقیقت شناس ہیں اُن پر یہ امر ہرگز پوشیدہ نہیں کہ اگر ایک انسان سے کسی خاص شئے کے متعلق بیان کرایا جائے تو اس کے طرز بیان کی ترتیب اس کے دماغی رجحانات کے موافق ہوگی۔ وہ سب سے پیشتر اس رجحان کی طرف متوجہ ہوگا جس کے سب سے زیادہ گہرے اثرات اس کے دماغ نے قبول کیے ہیں۔ اگر اس وقت میں شاعرانہ کیفیات سے مدہوش ہو کر اس مضمون کی ابتدا کرتا تو شدید عشق کی کرشمہ سازیاں اور حسن کی جلوہ پاشیاں میرا موضوع بحث ہوتا۔ لیکن نہیں میرا مقصد دوسرا ہے۔ کشمیر کے حسن رنگا رنگ سے زیادہ کشمیریوں کی ناگفتہ حالت نے مجھکو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ممکن ہے بد مذاقی کا الزام لگایا جائے کہ کشمیر بہشت نظیر کے تذکرہ میں محققانہ خشک مزاجی سے کام لیا گیا۔ ممکن ہے کوئی منچلا جس کو "فلسفۂ حسن" سے درک ہو کہہ اُٹھے کہ جمالیاتی پہلو ( ) بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ صرف واقعات کو پیش کیا جائے اور ان مقامات کا جہاں سے گذرنے کا اتفاق ہوا تذکرہ کر دیا جائے۔"

حدود اربع | کشمیر کے شمال میں مغربی چین، مشرق میں تبت، مغرب میں روسی ترکستان اور افغانستان اور جنوب میں پنجاب ہے۔ اپنے جغرافی موقع کی وجہ سے کشمیر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ پانچ خود مختار ممالک کے حدود اس کی سرحد سے ملتے ہیں۔ وسط ایشیا اور ہندوستان کی تجارت کا بھی یہی راستہ ہے۔

کشمیر کا رقبہ ۸۰۰۰۹ مربع میل ہے اور آبادی ۱۵ لاکھ ۵۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

گذشتہ تاریخ | اگرچہ کشمیر کی گذشتہ تاریخ کے متعلق ہمارے پاس صحیح واقعات اور مواد کی کمی ہے تاہم جو کتابوں اور مقامی مروجہ کہانیوں سے مستنبط کیا جا سکتا ہے وہ پیش کیا جائے گا۔

تمام ملکوں کے عہد قدیم کی تاریخ کے لیئے روایات قومی، مقامی مروجہ کہانیوں اور آثار کہن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ کام شاید وہ شخص اچھی طرح کر سکے گا جو وہاں کی زبان، رسم و رواج،

اور کشمیری قوم کی خصوصیات نسل سے واقف ہو۔

یہاں کی کہانیوں میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان کشمیر تشریف لائے اور لوگوں کو توحید کی تعلیم دی لیکن ہمارے پاس اس کے تاریخی شواہد موجود نہیں۔ کشمیر کی باقاعدہ تاریخ کا پتہ بدھ کے زمانہ سے چلتا ہے بدھوں کے زمانے کی پرانی عمارتوں نیز آثار قدیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر بدھوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ بدھوں کے بعد ہندوؤں (برہمنوں) کی حکومت اسی علاقہ پر ۱۰۰۰ء تک قائم رہی۔

اس زمانہ میں مسلمان تمام اقصائے عالم میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۰۱۸ء میں محمود غزنوی نے علاقہ کشمیر کو اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا۔ چونکہ افغانوں نے کوئی باقاعدہ نظام حکومت یہاں قائم نہیں کیا تھا اس لیئے تبت کے ہندو راجہ کو ۱۳۰۵ء میں کشمیر فتح کرنے میں کوئی موانع پیش نہیں آئے۔

اسی راجہ کی نسل میں شہزادہ یوفتن مشرف باسلام ہوا اور اس کا نام صدر الدین رکھا گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا وزیر شمس الدین سریر آرائے سلطنت ہوا شمس الدین کے زمانہ میں مقابلتہً کشمیر نے بہت ترقی کی۔

مغلوں کے زمانہ تک کشمیر آزاد حکومت کی حیثیت رکھتا تھا۔ بالآخر اکبر اعظم نے ۱۵۸۶ء میں اس صوبہ کو سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ جنرل قاسم خاں نے جو اکبر کے مشہور و معروف سرداروں میں تھا کشمیر کو فتح کیا لیکن اس کے بعد سے دربار شاہی کے تعلقات اس خطہ سے ایسے وابستہ ہوئے کہ یقیناً مغلوں کی حکومت کے آخر وقت تک قائم رہے۔ اکبر خود کشمیر گیا اور قلعہ ہری پت کی تعمیر اپنے سامنے شروع کرائی جس کو جہانگیر نے اپنے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ جہانگیر کو خطۂ کشمیر سے خاص انسیت تھی اس کے بنوائے ہوئے باغات اور عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ جہانگیر کی محبت کا اظہار اس کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی عمر کے آخری لمحوں میں کہے۔ "مجھ کو ویری ناگ لے چلو" اس کی یہ آخری خواہش تھی جو کارکنان قضا و قدر کے ہاتھوں کبھی نہ پوری ہونے والی تھی۔ چنانچہ وہ پیر پنجال کے دشوار گزار راستوں سے ویری ناگ

روانہ ہو گیا لیکن مقام بنا منگلہ پر اس نے اپنی آخری آرزو کو لیے ہوئے اس جہان تیرہ کو خیرباد کہا۔ ع۔ سے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

کشمیر جہانگیر کے زمانہ حکومت میں اس کی تفریح گاہ تھا۔ اس کی دل لگی کا سامان تھا۔ اس کے بعد شاہجہاں نے بھی اس خطہ کی قدر دانی اپنے والد ماجد سے کسی طرح کم نہیں کی۔ وہ بھی ان طرب آگیں مناظرہ قدرت سے ویسا ہی محظوظ ہوتا تھا جس طرح جہانگیر۔ فطرت کی نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کا وہ بھی اپنے والد کی طرح قدر دان تھا۔

۱۷۵۲ء میں جب سلطنت مغلیہ کے دست و بازو بالکل شل ہو چکے تھے عبدالبرکات نے جو ایک سردار تھا کشمیر کے صوبہ کو خودمختار کر لیا۔ کچھ عرصہ کے لیے پھر دوبارہ پٹھانوں نے کشمیر پر اپنا قبضہ کر لیا لیکن ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے پٹھانوں کو شکست دینے کے بعد اس کو سکھ حکومت میں شامل کر لیا۔

انگریزوں نے جب پنجاب فتح کیا تو ۱۸۴۶ء میں اُنھوں نے یہ صوبہ گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا اس کے بعد سے گلاب سنگھ کے خاندان میں کشمیر کی زمام حکومت ہے۔

طرز حکومت | دیگر دیسی ریاستوں کی طرح یہاں بھی حکومت کے جمہوری اصول پر شاذ ہی عمل درآمد ہے۔ یہاں طریقۂ استبداد کا نظارہ اپنی اصل آب و تاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

چند سال سے دوسری ریاستوں کی طرح یہاں بھی نام نہاد کونسل وزراء قائم کی گئی ہے جس کی غرض و غایت مہاراجہ صاحب کو امور سلطنت میں مشورہ دینا ہے۔ یہ کونسل مختلف شعبہ جات کے وزیروں پر مشتمل ہے۔

کشمیر کی آبادی میں ایک کثیر عنصر مسلمانوں کا ہے لیکن سخت افسوس اور تعجب ہے کہ ریاست کے اعلیٰ حکام سے لے کر ادنیٰ تک مسلمان شاذ ہی نظر پڑتا ہے۔ باوجودیکہ مسلمانوں کی آبادی کی نسبت ۹۵ فی صدی ہے لیکن ان کے حقوق کی کما حقہ نگہداشت نہیں کی جاتی۔

تعلیم | مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان اس کی سب سے بڑی وجہ بتلائی جاتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ

مسلمان غیر تعلیم یافتہ ہیں لیکن اس کی ذمہ داری بھی ریاست ہی پر آتی ہے۔

کیا ریاست کی طرف سے کوئی خاص انتظام کیا گیا؟ نہیں

کشمیر میں دو کالج ہیں۔ سری پرتاپ کالج سرینگر اور جموں کالج سری پرتاپ کالج (موجودہ والی کشمیر کے نام کے ساتھ موسوم ہے) میں ۲۰۰ کے قریب طالب العلم ہیں اور ساتھ ہی کالجیٹ اسکول میں تقریباً ۵۰۰ طلبا ہیں۔ ان طلبا میں مسلمانوں کا اوسط ۱۵ فیصدی ہے۔ سرینگر کالج کے ایک پروفیسر صاحب سے مجھ کو یہ سنکر تعجب ہوا کہ کالج کے مسلمان طلبا میں سے کوئی بھی کشمیری نہیں بلکہ سب پنجابی ہیں۔

مسلمانوں میں فقدان تعلیم کی یہی وجہ ہے کہ کسی قسم کی حوصلہ افزائی ریاست کی طرف سے نہیں کی جاتی۔ سرینگر میں ایک صنعتی کالج (ٹیکنیکل انسٹیٹوٹ) بھی ہے۔ اس کا انتظام ظاہر میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لوہاری، بڑھئی، معماری اور انجنیری وغیرہ کے علاوہ تصویر کشی کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ اسی کالج پرنسپل کی کوٹھی جو خود طلبا کالج کی تعمیر کردہ ہے نہایت عمدہ عمارت ہے اور اس امر کا بین ثبوت ہے کہ طالبعلموں سے عملی کام یورپ کے صنعتی کالجوں کے طریقہ تعلیم کے موافق لیا جاتا ہے۔

میں نے خاص طور پر مسلمانوں کی حالت اس لیے بیان کی ہے کہ اب تک نہ صرف ان کے حقوق کی کافی نگہداشت کی طرف سے بے اعتنائی برتی گئی ہے بلکہ ان کی آئندہ ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ جلد از جلد ان کی طرف قوم توجہ کرے۔

امرتسر میں کشمیریوں کی اصلاح و ترقی کے لیے ایک جماعت عرصہ سے قائم ہے۔ ہر سال کانفرنس بھی منعقد ہوتی ہے اور تجاویز بھی پاس کی جاتی ہیں لیکن عملی کام اب تک مطلقاً کچھ نہیں کیا گیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب خود وہاں کی صورت حالات دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور کشمیریوں کی اصلاح کے لیے انھوں نے قوم سے اپیل بھی کی تھی۔ لیکن جس طرح ان کی دھیمی آواز کی اپیل تھی اس سے بھی گری ہوئی آواز میں قوم نے اس کا جواب دیا۔

بہرحال اب اس وقت ضرورت ہے کہ کشمیریوں کی اصلاح و ترقی کی طرف مسلمان بہت جلد توجہ کریں۔

معاشرت و اخلاق کشمیریوں کے غربت و افلاس کی حالت اُس وقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے جب آپ کو کسی گاؤں سے گزرنے کا اتفاق ہو۔ گاؤں کے بچے جن کی صورتیں فرشتوں کی سی ہوتی ہیں چاروں طرف سے ہر مسافر یا سیاح کو گھیر لیتے ہیں۔ ہر طرف سے "بخشش" کی آواز بلند ہوتی ہے تا آنکہ ہر سخت دل رکھنے والا بھی ان معصوم صورتوں پر رحم کھا کر جو چشم براہ بیٹھے ہنستے ہیں کچھ نہ کچھ دے دیتا ہے۔ ذلت و نکبت کی انتہائی حالت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسی افلاس و عسرت کی وجہ سے کشمیریوں سے وہ تمام جذبات عالیہ فنا ہو گئے ہیں جو دنیا میں کسی قوم کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ انہیں کے پڑوس میں افغانوں کی غیور و اولوالعزم قوم آباد ہے لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

کشمیری قوم کے اخلاق کو برا نہیں کہا جا سکتا لیکن سخت افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سرینگر کی حالت اور خصوصاً ہانجی فرقہ (یہ لوگ عموماً ملاحی کرتے ہیں) کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ شراب خواری، عورتوں کی عصمت فروشی اور بے حیائی یقیناً ایسی بداخلاقیاں ہیں کہ پوری قوم کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میں نے اس امر پر غور کیا ہے کہ آیا ان کی بداخلاقیاں ان کے افلاس و غربت کا نتیجہ ہیں یا ان کی خواری و رسوائی کے اعمال کی مکافات میں ہے۔

میرے خیال میں ان کی ان تمام برائیوں کا اصل سبب ان کی عرصہ کی غلامی ہے۔

ہندوستان کے اکثر حصوں کی طرح کشمیر میں بھی اسلام صوفیائے کرام کے تصرف سے پھیلایا گیا۔ چنانچہ عرصہ تک رشد و ارشاد کے سلسلے برابر جاری رہے لیکن اب دوسرے مقامات کی طرح تصوف کی روحانی کارفرمائی ختم ہو چکی اور دنیا طلبی، حرص و آز کی گرم بازاری ہے۔ تصوف کے فیضان و برکات کی بجائے ہر طرف توہمات کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ افلاس و غلامی نے پہلے ہی کشمیریوں کی بلند حوصلگی کو خاک میں ملا دیا تھا جب ایسے بالطبع نیاز کیش موجود ہوں تو مرشد کی پانچوں گھی میں ہیں۔ انہیں نیازمندوں کی ان کو تلاش رہتی ہے۔

میرے خیال میں کشمیر کے موجودہ پیر وہاں کے تنزل اور عدم ترقی کی ایک بڑی وجہ ہیں کشمیری دماغ کی جو نشو و نما دانائی، فراست، اور ملک پیمائی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، ایک

عرصہ سے توہمات نے روک دی ہی۔ تعلیم کا فقدان جہالت کی تاریکی اور سب سے بڑھ کر غیروں کی غلامی نے خودداری اور خود شناسی کے احساس کو بالکل محو کر دیا ہی۔

علامہ اقبال ذیل کے اشعار میں کشمیریوں کی حالت کا کن پر درد الفاظ میں نقشہ کھینچتے ہیں:-

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالے بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او — نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے — نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے

بایں ہمہ ان میں اصلاح و ترقی کی استعداد موجود ہی۔ اس گئی گذری حالت میں بھی ان پر مذہب کا کافی اثر باقی ہی۔ نماز جمعہ میں مجھ کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہی لوگ جو دن بھر جھوٹ بولتے ہیں امام کے خطبہ کے وقت زار زار روتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سننے کے ساتھ ہی درود کی آواز سے تمام مسجد اُٹھ آتی ہی ان کے مذہب کا بین ثبوت یہ ہی کہ باوجودیکہ مسیحی مشنری تبلیغ عرصہ سے جاری ہی لیکن اب تک کسی کشمیری کے متعلق یہ نہیں سنا گیا کہ اس نے مذہب عیسوی کو قبول کیا ہو۔ سرینگر اور بارہ مولہ میں اسی غرض کے لیے مشنری اسکول قائم کیے گئے اور انجیل کا کشمیری زبان میں ترجمہ بھی کیا گیا لیکن عیسائیوں کو ابتک مطلقاً کامیابی نہیں ہوئی۔

<u>مشہور مقامات</u> میں کشمیر جموں کے راستہ سے گیا اور راولپنڈی کے راستہ سے واپس آیا میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری کشمیر کی سیر مکمل ہوئی کیونکہ اس کے لیے کم از کم چھ ماہ درکار ہیں لیکن میں نے وہ سب مقامات دیکھ لیے جو زیادہ مشہور ہیں اور جن تک راستہ کی آسانیاں ہیں۔

میں نے اپنا زیادہ وقت تین وادیوں کی گلگشت میں صرف کیا جو یقیناً خلاصہ کشمیر

کی جا سکتی ہیں یعنی وادی کشمیر، وادی لدر وادی سندھ۔

وادی کشمیر | یہ وادی سو میل طویل اور ۲۰ میل چوڑی ہے۔ ریاست کشمیر میں یہ وادی سب سے زیادہ زرخیز اور گنجان آباد ہے۔ ریاست کے مشہور شہر اور دارالسلطنت بھی اسی وادی میں واقع ہیں۔

سرینگر | بہ حیثیت ایک شہر کے یہاں کوئی قابل تعریف نہیں۔ مقامات میں باغات کی بہتات ہے۔ جہانگیر کے عہد کی تعمیر کردہ جامع مسجد قابل دید ہے۔ اس کی عمارت عالیشان اور طرز تعمیر کعبۃ اللہ کے نمونہ پر ہے۔

قلعہ ہری پربت اکبر کے زمانہ کی تعمیر ہے جو جہانگیر کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہونچی۔

تخت سلیمان۔ ہندوؤں کا ایک بہت پرانا مندر کوہ سلیمان پر واقع ہے۔ اشوک کے بیٹے جلاکہ نے ۲۰۰ سال قبل مسیح میں اس جگہ جہاں تخت سلیمان واقع ہے ایک مندر تعمیر کرایا تھا۔ راجہ گیاد تھ نے ۲۵۳ء میں پرانے مندر کی جگہ یہ مندر بنوایا جو اب تک موجود ہے۔

اسلام آباد | کی آبادی دس ہزار ہے۔ وادی کشمیر میں سرینگر کے بعد بڑا شہر ہے۔ یہاں گندک کے چشمے ہیں جہاں لوگ دور دور سے نہانے آتے ہیں۔

بون | اسلام آباد سے پانچ میل پر واقع ہے۔ یہاں ایک خوشنما چشمہ ہے جس کے قریب جہانگیر کے عہد میں ایک باغ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس باغ کے چبوترہ کے نشانات اب تک باقی ہیں۔

اسی باغ کے قریب پانڈوؤں کے زمانہ کے غار ہیں جو ۲۰۰ فٹ پہاڑ کے اندر ہی اندر چلے گئے ہیں۔

متن | سطح مرتفع پر واقع ہے۔ وہاں سے منظر نہایت شاندار ہے۔ یہاں ایک مندر ہے جس کی ازسرنو تعمیر آجکل ہو رہی ہے۔ علاقہ کشمیر میں یہ مندر سب سے زیادہ قدیم خیال کیا جاتا ہے۔

وادی لدر | اس مقام سے وادی لدر شروع ہو جاتی ہے۔ اس وادی کے متعلق تمام سیاحان عالم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مناظر قدرت کی دلفریبیوں کے لحاظ سے یہ وادی دنیا کی سب سے زیادہ خوشنما وادیوں میں سے ہے۔ اور ہمالیہ کی تو بہترین وادی یہی ہے۔

فطرت معہ اپنی تمام رنگینیوں اور جلوہ آرائیوں کے یہاں ظاہر ہوتی ہے۔

عیش مقام: یہاں زین الدین صاحب کا مزار ہے جو ان صوفیائے کرام میں سے ہیں جنھوں نے کشمیر میں اسلام کی روشنی پھیلائی۔ یہ زیارت پہاڑ کے اندر تاریک غار میں واقع ہے جہاں پہونچکر بالطبع انسان کو ایک قسم کی ہیبت معلوم ہوتی ہے۔

یہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر نہر نکالی گئی ہے۔ نہر کے مصنوعی آبشار قابل دید ہیں۔

وادی سندھ: اس وادی سے وسط ایشیا کو راستہ جاتا ہے۔ دریا کے کنارہ کنارہ سڑک کے پیچ وخم بھی دور تک چلے جاتے ہیں۔ اس وادی سے پہاڑ رک مکھ (۰۰۰، ۱۷ فٹ) جو ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا ہے معہ اپنے وقار و تمکین کے صاف نظر آتا ہے۔

گاندربل۔ مانسبل اور کنگن اس وادی میں قابل دید مقامات ہیں۔

باغات: جہانگیر کو باغات کا بہت شوق تھا اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے کشمیر جیسی آسانیاں اور جگہ نہیں بہم پہونچ سکتی تھیں۔ فطرت خود ہاتھ بٹانے کو تیار، بہترین مواقع موجود پھر قدر دان شہنشاہ کے لیے کونسے موانع درپیش تھے۔

باوجود ان کی کس مپرسی اور عدم اعتنا کے جب ان باغوں میں جاکر بیٹھیے جو جہانگیر نے بنوائے ہیں تو اٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی اور ایک عجیب روحانی کیف و انبساط اور دلی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کے عہد کے تعمیر کردہ باغوں میں سے یہ مشہور باغات موجود ہیں۔

شالامار باغ اور نشاط باغ: یہ دونوں باغات ڈل جھیل کے کنارہ واقع ہیں۔ یہ باغ عین اس مقام پر واقع ہیں جہاں سے چشمے نکلتے ہیں اس لیے پانی کی قلت کبھی نہیں محسوس ہوتی۔ آبشاروں اور فواروں کا خاص اہتمام ہے۔ جو یقیناً کسی دوسری جگہ محال ہے۔

اچھابل: یہ باغ بھی جہانگیر کا تعمیر کردہ ہے۔ ایک مثلث پہاڑی پر چشمہ کے قریب واقع ہے۔ اس پہاڑ پر بہت گھنا چیڑھ کا جنگل ہے جس کی وجہ سے نظارہ دلفریب ہو گیا ہے۔ اور باغات

کی طرح یہاں بھی آبشار موجود ہیں اور کبھی کبھی فوارے بھی چلتے ہیں۔

ویری ناگ | سرینگر سے فاصلہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس باغ کی طرف بہت بے التفاتی برتی گئی ہے۔ حالانکہ موقع و محل کے لحاظ سے اس باغ کو کشمیر کے دیگر باغات پر فوقیت حاصل ہے۔ ویری ناگ دراصل وہ چشمہ ہے جو دریائے جہلم کا منبع ہے۔ اس چشمہ کے چاروں طرف جہانگیر نے ایک عمارت تعمیر کرا دی تھی اور اس کے بعد شاہجہاں نے آبشار بنوائے۔

شہنشاہ جہانگیر کو اس مقام سے انسیت تھی۔ کشمیر میں اس کا یہی مقام مرکز تھا۔ چنانچہ نورجہاں کے محلات کے آثار اب تک باقی ہیں اور دوسری عمارتیں ناقدری سے معدوم ہو گئی ہیں۔

جب جہانگیر کی زندگی کے چند لمحے باقی تھے اس وقت اس کی زبان پر اسی جگہ کا نام تھا اور اس کے دل میں کسی طرح پرواز کر کے اس مقام پر پہونچ جانے کی آرزو۔ یہ دراصل اسکی رنگینی مزاج کا اقتضا تھا کہ وہ ایسے مقام پر مرنے کی آرزو کرے۔

چشمہ کے گرد عمارت میں قطعات تاریخی بھی کندہ ہیں۔

"بادشاہ ہفت کشور شہنشاہ عدالت گستر ابو المظفر نور الدین جہانگیر پادشاہ ابن اکبر پادشاہ غازی بتاریخ ۱۵ سنہ جلوس دریں سرچشمہ فیض آئین نزول اجلال فرمودند۔ ایں عمارت بحکم آنحضرت صورت اتمام یافت ۞

قطعہ

از جہانگیر شاہ حیدر شاہ — ایں بنا سر کشید بر افلاک
بانی عقل یافت تاریخش — قصر آباد و چشمہ ورناک

دوسرا قطعہ یہ ہے

حیدر بحکم شاہجہاں پادشاہ دھر — شکر خدا کہ ساخت چنیں آبشار و جوئے
زیں جوئے دادہ است زجوئے بہشت یاد — زیں آبشار یافتہ کشمیر آبروئے
تاریخ جوئے آب بگفتہ سروش غیب — از چشمہ بہشت بروں آمدست جوئے

گلمرگ مرگ مرغزار کو کہتے ہیں۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۸۵۰۰ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ گلمرگ ایک سبزہ زار ہے۔ جدھر آنکھ اُٹھتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر پڑتا ہے۔ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں بمقابلہ وادیوں کے سردی زیادہ ہوتی ہے۔ گلمرگ سے دو میل پہاڑ کی چوٹی پر کھلن مرگ بہت وسیع مرغزار ہے۔ اس مقام سے دو میل فاصلہ پر ایک جھیل ہے جس کی سطح آب پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔ یہاں سے ہندوستان سے سب سے بڑی جھیل وُلر صاف دکھائی دیتی ہے بشرطیکہ ابر نہ ہو۔ یہ بھی کشمیر کے ان چند مقامات میں سے ہے جن کے بیان کے لیے قلم کی زبان کی بجائے شاعر کی زبان زیادہ موزوں ہے اور اچھی طرح ادائیگی فرض سے عہدہ برا ہو سکتی ہے۔ جذبات، کیفیات اور احساسات کی صحیح ترجمانی صرف شاعر ہی کر سکتا ہے اس لیے بہتر ہوگا اگر میں یہ ذمہ داری کسی شاعر کے لیے چھوڑ دوں۔

یوسف حسین خاں
متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ

رفتار تعلیم

ڈاکٹر بٹلر، صدر کولمبیا یونیورسٹی نے لندن کی ایک انجمن اساتذہ کے جلسہ میں یہ بیان کیا کہ تعلیم کا قدیم معیار یہ تھا کہ معلومات میں کس قدر اضافہ ہوا لیکن انھوں نے بتایا کہ در اصل صحیح معیار تعلیم یہ ہونا چاہیئے کہ (۱) مادری زبان کا صحت و خوبی کے ساتھ استعمال کرنا آجائے۔ (۲) شریفانہ آداب و اخلاق پیدا ہوں (۳) حسن و خوبی، قدر و منزلت اور اخلاق و آداب کے پرکھنے کا مذاق سلیم پیدا ہو (۴) نتائج پر غور و فکر کرنے کی قوت اور عادت ہو۔ (۵) نظم و نسق کے ساتھ کام کرنے کی قابلیت اور صلاحیت پیدا ہو۔ ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ ہماری تعلیم میں یہ مقاصد ہمیشہ مد نظر ہونے چاہئیں، نہ یہ کہ بقول شخصے "چل پڑیں اور معلوم نہو کہ کدھر جا رہے ہیں"۔ اس پر آپ نے پروفیسر ہکسلے اور گاڑی بان کا قصہ بیان کیا کہ ایک بار پروفیسر ہکسلے چلتے چلتے ایک سڑک کے سرے پر جا پہونچے۔ دیر ہو ہی رہی تھی، وہ فوراً ایک گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی بان سے کہا کہ "ہانکو" چلتے چلتے انھیں خیال آیا اور گاڑی بان سے پوچھا کہ "کہاں لے چل رہے ہو؟" اس نے جواب دیا "مجھے کیا معلوم؟ میں تو آپ کے حکم کے مطابق چل رہا ہوں"

ڈاکٹر بٹلر کے ان خیالات سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی اس کے کون نہیں جانتا کہ ہمارے طلبا کی کثیر جماعت ایک ایسی راہ پر گامزن ہے جنھیں خود منزل مقصود کا پتہ نہیں اور ہندوستان کی کونسی یونیورسٹی ہے جو زبان حال سے یہ نہیں کہہ رہی ہے کہ "معلوم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، آؤ ساتھ چلے چلو"

بابو جگل کشور برلا نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے پندرہ روپے ماہانہ کے ننانوے وظائف عطا کیے ہیں جنمیں سے ۲۵ برہمن طلبہ کے لیے مخصوص ہیں۔ ۵۰ دیگر ذات کے

طلبہ کو دیئے جائیں گے۔ دو دو وظیفے سکھ اور چینی طلبہ کو ملیں گے۔ اور ۲۵ وظائف نیچی ذات کے لڑکوں کو دئے جائیں گے۔

---

۲۵ ہزار ڈالر کی سالانہ رقم جاپان کی طرف سے اس غرض کے لیے مقرر کی گئی ہے کہ اس سے جاپان کے چینی طلبہ کو ۵۰ وظائف دیئے جائیں۔ ہر وظیفہ کی رقم ۵۰۰ ڈالر ہے جو دس ماہ تک جاری رہے گا۔ چینی گورنمنٹ سے دریافت کیا گیا ہے کہ وہ طلبہ کو نامزد کردے۔ ؎

گر فتم کز حریفاں بیش یا کم میتواں گفتن
"ز دستت تا چہ آمد؟ آخر ایں ہم میتواں گفتن"

مسٹر پربھت چندر سربدھیکاری جو تین سال سے سائنس کالج لندن میں نباتیات کی تعلیم پا رہے تھے، ابھی حال میں لندن یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ سند لینے سے قبل انھیں ایک سو پونڈ کا وظیفہ دیا گیا اور اس وقت سے انھیں ۱۵۰ پونڈ کا دوسرا وظیفہ ملا ہے تاکہ وہ اور ایک سال تک اپنے فن میں تحقیق جاری رکھ سکیں۔

تعلیم کے اغراض و مقاصد اور علم و فن کے فضایل و مکارم علما و فضلا کی زبان سے تو ہم نے بہت سُنے ہیں لیکن ذرا یہ بھی دیکھیں کہ یورپ کا ایک سیاسی مدبر یعنی وزیر انگلستان نے اس موضوع پر کیا کچھ کہا ہے۔

"اب جبکہ ہم ایک شہری بننے کی غرض سے تعلیم دینا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ہم خواہ تاریخ و معاشیات، ریاضی یا اور کسی دوسرے علم کی تعلیم پاتے ہیں، ایک مقصد اپنے پیش نظر رکھیں (۱) یہ کہ اپنے دماغ کو لاف زنی سے پاک رکھیں (۲) یہ کہ منطقی طرز دلائل کو سمجھ کر مغالطہ کی گرفت کر سکیں۔"

اس ضمن میں مسٹر بالڈوین نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک لیڈی نے ایک بار میرے ایک دوست سے پوچھا کہ "کیا یہ جدید وزیر اعظم تعلیمیافتہ شخص بھی ہی؟" یہ فقرہ اس امر کے لیے کافی ہے کہ "تعلیمیافتہ شخص" کا تصور اس شخص کے لیے کس قدر بلند ہی اور کہ وزارت کے لیے تعلیمیافتہ شخص کی ضرورت ہی۔

کسی قوم میں انقلاب کے بعد سب سے پہلا تعمیری کام جو شروع کیا جاتا ہی وہ تعلیم کا ہوتا ہی۔ روسی قوم نے بھی ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد اب جو ذرا دم لیا تو سب سے پہلے قومی تعلیم میں ہاتھ لگایا۔ اور اس کے لیے دامے درمے قدمے ہر ممکن ذریعے سے کام کر رہے ہیں۔

جمہوریہ روس (سویٹ کانگریس) کے دسویں اجلاس نے یہ طے کر لیا ہی کہ تعلیم عامہ کے لیے انتہائی کوشش اور موثر ترین ذرائع عمل میں لائے جائیں گے چنانچہ آجکل حسب ذیل فقرے تمام بڑے بڑے مقامات پر چسپاں نظر آئیں گے۔

"ایک بہت ہی اہم مسئلہ آجکل ہمارے سامنے ہی۔ اپنی تمامتر کوششوں سے ہم کو اپنی تعلیم کو عام بنانا اور ترقی دینا ہی۔"

"ہماری جمہوریہ میں اسکولوں کا کام آجکل رو بہ زوال ہی۔ مدارس کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہی۔"

"روس کی مجلس انتظامی تمام مرکزی و مقامی جماعتوں سے یہ اپیل کرتی ہی کہ وہ اپنی قابلیت اپنے تجربے، اپنی معلومات اور اپنے مادی ذرائع اسکولوں کو تباہی سے بچانے میں صرف کر دیں اور آیندہ ان میں استقلال اور نشو و نما پیدا کریں۔"

"اسکولوں کے کارکنان خود بھی ہماری جمہوریہ کے علمی و تمدنی ترقی میں حصہ لیں۔ اسکول کا ایک تعلیمیافتہ کارکن ہی جو سویٹ حکومت کا ہوا خواہ ہو، اسکول کی تعمیر کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہی۔"

"ہمارے اسکول کب تک غلام بنے رہیں گے؟ انہیں لڑکے کی طرح نہیں رکھنا چاہیے بلکہ

اپنی اراکین حکومت (سوویٹ) اور مزدور پیشہ جماعتوں کے حقیقی فرزند کی طرح ہونا چاہئے"

غرض یہ کہ اب ان کا تکیہ کلام یہ ہوگیا ہے کہ

"دشمن حالت کے مقابلہ میں صرف بستہ ہوکر بڑھو سوشلسٹ جمہوریہ کو بالاتر یہ کہ علمی جمہوریہ بننی چاہیئے"

یوں تو تعلیم عامہ کے لحاظ سے ریاست میسور ہندوستان میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتی ہے لیکن اس لحاظ سے بھی خاص طور پر قابل داد ہے کہ اس کے ہاں اندھوں اور بہروں کی کے لیے بھی ایک مخصوص درسگاہ ہے۔ حکومت اور پبلک دونوں کی عدم توجہی و غفلت کے باوجود یہ درسگاہ جو ایک عرصہ سے قائم ہے اپنا کام نہایت مستعدی اور انہماک کے ساتھ برابر انجام دے رہی ہے۔ ۱۹۲۲-۲۳ء میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۶۱ تھی جن میں سے ۲۳ بہروں کی اور ۳۶ اندھوں کی اور ۲ صحیح و سالم لڑکوں کی تھی۔ ان میں ایک اندھی اور ۲ بہری لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ درسگاہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سال مذکور میں ۴ طالب علم احاطہ بمبئی اور ۶ احاطہ مدراس کے موجود تھے۔ بہروں کو بننے وغیرہ کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اندھوں کو موسیقی مثلاً ہارمونیم اور بانسری وغیرہ بجانے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اندھوں کو پڑھانے کے لیے ایک طرح کے ابھرے ہوئے حرفوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک پریس بھی اب کھولا گیا ہے جس میں کمپوزنگ کا کام وہ لڑکے خود کرتے ہیں اور اس طریقہ سے ان کی کتابوں کے دشواری کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔

اس دور جدید کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر طرف علوم و فنون کی گرم بازاری نظر آئیگی تعلیم کے متعلق ہمیشہ نئے نئے اصول و مبادی مرتب ہوتے رہتے ہیں جس سے رفتار تعلیم میں روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ذیل کے چند اصول جو مختلف بکھروں۔ کتابوں اور تعلیمگاہوں کے

مطالعہ و معائنہ کے بعد جمع کیے گئے ہیں۔

۱۔ یہی نہیں کہ طلبہ تک معلومات صرف پہنچا دی جائیں بلکہ انھیں خود کتابوں اور اصلی ذرائع معلومات سے فراہم کرنے اور تحقیق و تفتیش کرنے کا موقع دو۔

۲۔ حتی الامکان باقاعدہ جماعتوں کی پابندی سے پرہیز کرنا چاہیئے اور اس کی بجائے ہر متعلم کو ایک مخصوص کام دیا جائے جسے وہ خود اپنی تلاش و سعی سے کرے۔

۳۔ بعض تعلیمگاہوں میں ایسے علمی کام ایک فرد کی بجائے جماعت کے سپرد کیے جاتے ہیں جو مسئلہ مخصوص پر ایک مشترکہ رپورٹ پیش کریں۔

"معلم"

مطبوعاتِ جدید

المومن

از مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری

یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے جو مولوی محمد یحیٰ صاحب مومن کی ادارت میں دفتر المومن نمبر ۲۳ بنیا پوکھر روڈ کلکتہ سے شائع ہوتا ہے۔ اب تک تین پرچے نکل چکے ہیں۔ ضخامت ڈھائی جز۔ اور لکھائی چھپائی کاغذ وغیرہ پسندیدہ ہے۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ۱۲؍ ہے۔
یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے خصوصیت کے ساتھ قوم مومن یعنی نوربافوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے ہے نیز بالعموم مسلمانوں کی بہبود بھی اس کے پیش نظر ہے۔
قوم مومن ہندوستان میں کثیر التعداد ہے۔ اور دینداری۔ عبادات اور تقوے میں نہایت ممتاز۔ ہم نے ان میں سے بہت سے ایسے مسلمان دیکھے ہیں جو ہندوستان کی دوسری قومیں ہم کو نہیں مل سکے۔ علوم اسلامیہ میں اس قوم کے بہت سے لوگوں نے نمایاں شہرت حاصل کی ہے۔ اب بھی علمار دین اس میں بکثرت ہیں۔ اور تاریخ اسلام میں تو بہت سے ائمہ حدیث علمار دین ایسے ملتے ہیں جن کا یہی پیشہ تھا۔ مگر ہندوستان کے اہل اسلام پر یہ رونے کا مقام ہے کہ نسلی عصبیت نے ان کے اوپر ایسا غلبہ پا لیا۔ اور ہندوؤں کے اثر سے خاندانی شرافت کا خیال اس طرح ان کے اوپر مسلّط ہو گیا کہ وہ اس قوم کو جو ہندوستان کی جماعت اسلامیہ کا ایک نہایت صالح جزو ہے اور دینی و دنیوی ہر لحاظ سے مفید تر ہے پست اور ادنیٰ سمجھتے ہیں یہاں تک کہ یہ رسالہ جو اس قوم کی طرف سے نکلا ہے اس میں اس کے تمام مقاصد میں سے سب سے اول مقصد یہ ہے کہ

"مسلمانو! ہم کو ذلیل اور رذیل نہ سمجھو"

افسوس صد افسوس۔ کیا مسلمانان ہند باوجود اس کے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ اسی نبی برحق

کے پیرو ہیں جس نے فخر بالانساب کو فتح مکہ کے دن پاؤں سے روند ڈالا۔ اور فرمایا۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر۔ الناس کلہم من آدم وآدم من التراب

نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے۔ نہ عجمی کو عربی پر نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر سارے آدمی آدمؑ کی نسل سے ہیں۔ اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے

اسلام ہر قسم کی نسلی تفریق کو مٹا کر تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بناتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ مشت خاک جس کا نام گوشت۔ پوست اور استخوان ہے ہرگز فخر کے قابل نہیں ہے۔ بلکہ بزرگی کا مدار صرف تقوے پر ہے۔ قرآن میں ہے۔

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

لوگو۔ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنا دیئے تاکہ آپس میں پہچان ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ بزرگ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

نسب کو جس کے اوپر بعض لوگ گھمنڈ رکھتے ہیں قرآن محض دنیاوی شے قرار دیتا ہے۔ قیامت میں یہ سارے جسمانی تعلقات فنا ہو جائیں گے چنانچہ اس میں ہے۔

فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینہم یومئذ ولا یتسائلون فمن ثقلت موازینہ فاولئک ہم المفلحون ۝ ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسہم فی جہنم خالدون ط

جب صور پھونکا جائیگا تو ان میں کسی قسم کا نسب ہوگا نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے جن کا (میزان عمل) پلہ بھاری ہوگا وہ نجات پا جائیں گے۔ اور جن کا ہلکا ہوگا۔ انھوں نے اپنے آپ کو خسارہ میں رکھا وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

الغرض جو شخص نسب پر فخر کرے اور اس گھمنڈ میں اپنے کو شریف اور دوسروں کو رذیل سمجھے وہ ابھی جسمانیت کی جہالت اور جاہلیت کے آب و گل میں ہے۔ نہ اسے روحانیت کی ہوا لگی ہے نہ اسلام کی روشنی اس نے دیکھی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرے والد مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم وزیر تعلیمات ریاست بھوپال کے یہاں مولانا حافظ عبداللہ صاحب مرحوم غازی پوری جو قوم مومن سے تھے مہمان تھے۔

میں بہت نو عمر تھا۔ ایک دن غصہ میں کسی نوکر کو "جلاہا" کہہ بیٹھا۔ والد مرحوم نے ایسی غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا جس نے اس جاہلیت کے دلدل سے نکال کر مجھے کوسوں فاصلہ پر پھینک دیا اور ہمیشہ کے لیے میری اصلاح کر دی۔

میں المومن کے اڈیٹر صاحب کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس مقصد کو اپنے رسالہ سے خارج کر دیں۔ کیونکہ جو مسلمان فخر بالانساب میں مبتلا ہیں وہ حقیقت میں خود ہی ذلیل و خوار اور مجرم و گنہگار ہیں۔ ان کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ ان سے اس استدعا کی کہ وہ آپ کو شریف سمجھیں۔ ان کے سمجھنے یا کہنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنافقین لایعلمون ؁ — عزت اللہ اور اُس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔

جماعت نورباف کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی دینی اور دنیوی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ اس قوم میں جیسا دینی اثر اور باہمی اتحاد ہے اس سے ہم کو توقع ہے کہ انکی ترقی جلد اور آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس قوم پر تحقیر کی نظر ڈالتے ہیں وہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر خود اپنی جہالت پر افسوس کریں گے۔

اپنی ہر آبادی میں پنچایت قائم کرنا۔ ہر مقام پر مدرسے کھولنا۔ دینی علوم کے ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم دینا۔ خاصکر اپنے پیشہ کی۔ معاشرت اور تمدن کو خالص اسلامی تعلیم کے مطابق کرنا۔ قرب جوار میں دین کی تبلیغ۔ مشترکہ سرمایہ سے تجارتی کاروبار کو بڑھانا۔ جو لوگ اعلیٰ تعلیم کے قابل ہوں اُن کو وظائف دینا وغیرہ۔

یہ اجمالی مقاصد ہیں جن کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور فوراً پوری توجہ سے تمام جماعت کو کوشش میں لگ جانا چاہیئے۔ قوم نورباف میں حسن معاملت۔ جفاکشی۔ باہمی محبت۔ اور اپنے سرداروں کی اطاعت وغیرہ ایسے بے نظیر صفات ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان کی ترقی بالکل مشکل نہیں ہے۔ صرف ان کے رؤسا کو ہمت اور کوشش کی ضرورت ہے۔

رسالہ المومن بے شک ہوا رہونا چاہیئے۔ لیکن اسی کے ساتھ سستے داموں کا اگر روزانہ نہیں تو کم سے کم ہفتہ میں دوبار یا ہفتہ وار ہی سہی ایک اخبار بھی ہونا چاہیئے۔ فقط

بصائر القرآن ۔ مرتبہ محمد مہدی صاحب۔ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فرمانروائے بھوپال کے قدردانی علم اب محتاج تعارف نہیں۔ اکثر مطبوعات دفتر تاریخ سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بصائر القرآن اسی قسم کی ایک کتاب ہی جس کو محمد مہدی صاحب نے نہایت محنت سے ترتیب دیا ہی۔ یہ دو سو آٹھ صفحہ کی کتاب ہی۔ بڑی تقطیع کاغذ معمولی سفید اور طباعت نہایت صاف اور روشن ہی۔

مرتب صاحب نے جلیل القدر پیغمبروں کے حالات اور قرآن کریم کے مشہور قصص حکایات کو ایک جگہ نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں جمع کیا ہی اور ہر قصہ یا بیان کے بعد نتیجہ کے عنوان سے بچوں کی ہدایت کے لیے کچھ الفاظ اُس بیان یا واقعہ کے متعلق اضافہ کیے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہی کہ نتیجہ کے عنوان سے جو کچھ اضافہ کیا گیا ہی وہ اگر بالکل نہ ہوتا تب بھی کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ بعض جگہ نتیجہ اخذ کرنے میں بچوں کی استعداد کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا۔

کتاب اس قابل ہی کہ بچوں کو مدارس اور گھروں میں پڑھائی جائے۔

کلامِ جوہر

"مولانا کے برادر مکرم ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر سے مولانا اور نیز شوکت علی صاحب کو اپنے زمانہ نظر بندی اور بیتول جیل میں کچھ شکایات پیدا ہو گئی تھیں۔ ذوالفقار علی خاں صاحب نے اُن شکایات کا جواب ایک غزل میں دیا تھا جس کا مطلع یہ ہے

جور اعدا کے گلے تیری جدائی کے گلے
اس دلِ تنگ میں ہیں۔ ساری خدائی کے گلے
(گوہر)

مولانا نے گلے شکووں کا جواب بڑے مزے سے اپنے انداز میں لکھا ہے"
(مدیر)

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے
خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے

کثرتِ شوق سے تھا ہجر بھی ہم رنگِ وصال
ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے

کششِ شوق تھی اور لذتِ بُعدِ منزل
سب طرف خار تھے اور آبلہ پائی کے مزے

طبع آزاد، اسیری میں بھی پابند نہ تھی
قید میں ہم نے اُٹھائے ہیں رہائی کے مزے

سمجھے ہر سجدے کو معراج جو زاہد چکھ لے
درِ تو بہ پہ مری ناصیہ سائی کے مزے

آ گئی وادیٔ پر خار بڑھاؤ تو قدم
پھر نہ کہنا نہ ملے راہ نمائی کے مزے

میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں
بندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے

درگہِ حسن پہ سب ایک ہیں محمود و ایاز
بادشاہوں کو بھی ملتے ہیں گدائی کے مزے

شعر جوہر کی ہو کیا قدر سخن سازوں کو
ہم سے پوچھے کوئی اس ہرزہ سرائی کے مزے

جزیرۃ العرب

مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری

"مولانا اسلم صاحب کے نتائج فکر کا دوسرا ہدیہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یوم جزیرۃ العرب عنقریب تمام ہندوستان میں منایا جائے گا، مولانا نے ذیل کی پُراثر نظم اسی موقعہ کے لیے تحریر فرمائی ہے۔"
مدیر

وہ عرب کہ دینِ برحق۔ ہوا جس سے آشکارا
کہ مٹا جہاں سے باطل۔ کیا کفر نے کنارا

حرمِ خدا ہے اُس میں۔ حرمِ نبی ہے اُس میں
کہ ملائکہ کی فوجیں جہاں رہتی ہیں صف آرا

ہے اُسی میں گھر خدا کا۔ کہ جو چشمہ ہے ہُدے کا
کہ جہانِ تیرہ میں ہے وہی حق کا اِک منارا

وہ کتابِ آسمانی۔ کہ ہے نورِ جاودانی
اُسی سرزمیں میں رب نے اُسے عرش سے اُتارا

وہ رسولِ فخرِ آدم کہ ہے رحمتِ دوعالم
اُسی خاک میں ہے پنہاں۔ وہیں تھا وہ جلوہ آرا

حرمین جانے والے ۔ قدم ادب سنبھالے!!
کہ وہاں کا ذرّہ ذرّہ ۔ مری آنکھ کا ہے تارا

کفِ پائے شاہِ دیں کے ۔ یہ لیے ہونگے اُس نے بوسے
مجھے سنگپارہ بطحا کا ہے لعل سے بھی پیارا

مُتوّلیِ حرم سے کوئی کاش جاکے کہہ دے
کہ ہے آبروئے ملّت کا یہ آستاں سہارا

یہ حرم کی سرزمیں ہے ۔ یہ متاعِ مسلمیں ہے
نہ کسی کی ہے تجارت ۔ نہ کسی کا ہے اجارا

یہاں مُلحدی[۵] کا شیوہ کوئی چل نہیں سکے گا
کہ تجھی کو پھونک دے گا ترے فتنہ کا شرارا

یہ حریمِ کبریائی ۔ کہ ہے قلعۂ خدائی
یہاں غیر کی رسائی ۔ نہیں مطلقاً گوارا

یہ جزیرۃ العرب ہے ۔ یہاں آستانِ رب ہے
کہ ہم اُس کے پاسباں ہیں وہ ہے پاسباں ہمارا

---

[۵] اس آیت پاک کی طرف اشارہ ہے۔ "وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ" "ظلم سے اسمیں جو اتحاد کا ارادہ کرے گا اُس کو ہم دردناک عذاب چکھائیں گے"!

سیرِ بہشت

مولانا آزاد عظیم آبادی

کل سیرِ خلد کو جو مجھے لے گیا خیال — وہ نہر و باغ و نعمتِ الوان وہ حوریں
کیا ذکر خورد و نوش کہ خود بھوک تھی نہ پیاس — حوریں تو تھیں سرے سے مرے کام کی نہیں
حیراں ہوا کہ کیجئے کیا اس بہشت کو — کچھ خوبیاں تو ہو نہ سکیں اس کی دلنشیں
لیکن ملا یہ نکتۂ نایاب بیدرنگ — شایانِ شکرِ مائدہ نعمت آفریں

یک گروہ نانِ تازہ و یک جام آبِ سرد
بروقت ہاتھ آئے تو جنت ہی بس یہیں

العلم عند اللہ

اے محو جلوہ ہائے طلسمِ تصورات — کیا حاصل تصورِ میلاد و ممکنات
جس پر کوئی دلیل نہیں وہ قیاس کیا — کچھ بھی چلا کسی کی خلقت کا جب پتا
اے آزرِ بتانِ خیال و خدا تراش — کس واسطے معارجِ تکوین کی تلاش
عاجز ہوے ہیں جسکی ذات سے سب حکیم — صبح ازل کے صدق و صفا کا خدا علیم

آزاد عظیم آبادی

شذرات

عالم اسلامی میں جو عظیم الشان انقلاب اس وقت ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ اُن کی اہمیت کا صحیح اندازہ تو ابھی نہیں کیا جا سکتا لیکن آل عثمان کی جانبازی و حق پرستی کے جو ثمرات اولین اب قسطنطنیہ و سلطنت ترکی میں نظر آ رہے ہیں اُن کو البتہ دنیا دیکھ رہی ہے۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں اتحادی افواج نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تھا اور اُس وقت واقعات کا رُخ ایسا تھا کہ ہمدردان اسلام مایوس ہو چلے تھے اور امید نہ تھی کہ ۲ راکتوبر ۱۹۲۳ء بھی آئیگی جبکہ ان قبضہ کرنے والوں نے غالباً ہمیشہ کے لیے قسطنطنیہ کو الوداع کہا اور اس طرح ترکی فتح و لازین کی عظیم الشان کامیابی پر گویا مہر ثبت ہو گئی۔ غالباً ترکی قوم کے لیے اپنی جنگی کامیابیوں سے فائدہ اُٹھانے کا گزشتہ پچاس سال میں یہ پہلا موقع ہے اور اس اعتبار سے جس جوش مسرت کا اظہار اس وقت تمام ممالک اسلامی میں ہو رہا ہے وہ ذرا بھی غیر متوقع نہیں کہا جا سکتا۔

ترکوں نے اپنی آزادی کا پہلا عملی ثبوت انسداد مے نوشی کے قابل قدر قانون سے پیش کیا ہے جس کا نفاذ اب قسطنطنیہ و حدود ترکی میں نہایت سختی سے ہو چکا ہے۔ اہل یورپ و یورپ پرست ترک آپ انگور کے اس طرح دفعتاً غایب ہو جانے سے اپنی تشنہ کامی کو اس امید موہوم سے تسکین دے رہے ہیں کہ غالباً مے پرستوں پر یہ جبر و تشدد زیادہ عرصہ قائم نہ رہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ میخانہ ہستی کے جن بادہ خواروں نے اس رسم کہن کو پھر تازہ کیا ہے وہ اپنے ملکہ جنوں سے کہیں زیادہ سرشار و مدہوش ہیں اور یہ نشہ آسانی اُتر ہی نہیں سکتا اس لیے کہ موجودہ دور قسطنطنیہ کے عہد قدیم سے بالکل مختلف ہے۔

بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے!

حکومت انگورہ نے اپنا جدید نظام اساسی طیار کیا ہی اور سلطنت ترکی کے لیئے جمہوری طرز حکومت کا اعلان ہو چکا ہی۔ دار السلطنت بھی بجائے قسطنطنیہ کے انقرہ تجویز کیا گیا ہی ہر چند کہ ترکی قوم کو حق حاصل ہی کہ وہ اپنے لیئے جو طرز حکومت مناسب سمجھے اختیار کرے اور نہ جمہوریت موجودہ تمدن و آئین اسلام کے خلاف ہی لیکن آل عثمان کا جو تعلق اب تک عالم اسلامی سے رہا ہی اور منصب خلافت کی وجہ سے جو اقتدار اُن کو صدیوں حاصل رہا اُس کے اعتبار سے اس فیصلہ کو ہندوستان کے بعض حلقوں میں اک گونہ تعجب کی نظر سے دیکھا گیا ہی۔ بعض حضرات کے نزدیک مسئلہ خلافت کی صورت اب بالکل نئی ہو گئی، کچھ لوگ خلافت و حکومت کی اس تقسیم سیاسی کو مذہباً ناجائز اور مصلحتاً نامناسب تصور فرماتے ہیں حکومت ہند گو بظاہر خاموش ہی لیکن ہمدردان حکومت اس واقعہ کی تاویل کچھ اس انداز سے کر رہے ہیں کہ گویا آتش خاموش کے لیے سامان اشتعال کی تلاش میں ہیں۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس اہم اور نہایت نازک مسئلہ کے متعلق مسلمانان عالم کے متفقہ فیصلہ کی ضرورت ہی اور اکابرین قوم کو جلد اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے ہم نے مسئلہ کی اہمیت کا خیال کرکے جامعہ میں اک سلسلہ مضامین شائع کرنے کا قصد کیا ہی لیکن اس مقصد میں کامیابی کی صرف یہ ہی صورت ہی کہ بزرگان قوم بھی ہماری اعانت فرمائیں اور اپنے خیالات کے اظہار میں جامعہ کے صفحات کی طرف متوجہ ہوں۔

مسئلہ کینیا کے متعلق سر تیج بہادر سپرو کے مساعی جمیلہ کا ذکر ہمارے صوبہ کے بعض اخبارات اور رائیٹر کے تاروں میں نہایت تفصیل سے رہتا ہی کاش برٹش امپائر کانفرنس کی بجائے کسی زیادہ مفید و با اثر ذریعہ کو سر تیج بہادر اپنی کوششوں کا وسیلہ بناتے تاکہ اُسمیں کامیابی کی کوئی امید ہو سکتی۔ موجودہ صورت میں اگرچہ اُنھوں نے اپنا فرض نہایت قابلیت کے ساتھ ادا کیا، لیکن غریب ہندوستان کے لیے وہ کچھ زیادہ سود مند نہیں ہو سکتا

اس لیئے کہ جس انجمن سے وہ حق پرستی و دادرسی کی توقع فرماتے تھے اُس کا حال یہ ہے کہ خود اُس کی متفقہ قراردادوں کو جو گزشتہ سال منظور کی جا چکی ہیں آج جنرل اسمٹس جو امپائر کانفرنس کے رکن رکین ہیں طاق نسیاں کے نذر فرما چکے ہیں اور اس تجاہل عارفانہ کی تلافی بھی نہیں کرنا چاہتے۔ اُن کے نزدیک اُس تجویز پر جس کے تسلیم کرنے والوں میں ایک وہ بھی تھے اب عمل ہی نہیں ہو سکتا! ایسی حالت میں ڈاکٹر سپرو کی "کامیابیاں" واقعیت اور حقیقت کے اعتبار سے کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ کیا کینیا کے معاملہ پر دوبارہ غور کرنے کی امید موہوم اُن غریب ہندوستانیوں کے درد دل کی دوا ہو سکتی ہے جو اپنے وطن سے دور سرمایہ داری کی بے پناہ تلوار اور نسلی تعصبات کی کند چھری سے ذبح کیئے جا رہے ہیں

انگلستان کے بلند پایہ مصنفین میں نارمن اینگل کا نام جو عظمت و اقتدار حاصل کر چکا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ صرف انگلستان ہی نہیں تمام عالم میں "گریٹ الیوژن" کے مصنف نے دسمبر ۱۹۱۹ء میں جو ہل چل پیدا کر دی تھی وہ آج بھی کہ یورپ کا سیاسی مطلع تیرہ و تار ہے اور ایشیا کی سرزمین ہیجان و اضطراب کی بجلیاں اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے' فراموش نہیں کی جا سکتی۔

حال ہی میں نارمن اینگل نے انگلستان کے مقتدر اخبار "نیشن" میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ہے جس میں پریس کا روز افزوں اقتدار اور ہیئت اجتماعی و سیاسی زندگی پر غیر معمولی اثر دکھانے کے بعد اُنھوں نے اُن خطرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو خود غرض و تاجر صفت مالکان اخبار کے وجہ سے ملک میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شراب نوشی کا عام رواج اور دیگر مسکرات کی حکومت کی طرف سے اشاعت اس درجہ خطرناک نہیں' ڈاکٹر اگر مریضوں کے لیئے غلط علاج تجویز کریں تو وہ اس قدر اندیشہ ناک نہیں، لیکن جو زہر کہ اخبارات کے ذریعہ سے ملک میں پھیلایا جاتا ہے اور جو نہ بجھنے والی پیاس غلط خبروں کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے

اُس کے نقصان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُس کی تلافی بہ آسانی ممکن ہے۔

دورانِ جنگ میں ایک اخبار نے جرمنی میں ایک ایسا کارخانہ دریافت کیا تھا جہاں لاشوں کو ضائع کر کے اُن سے تجارتی فائدہ حاصل کیا جاتا تھا۔ آج کل بھی بجائے امن و سکون کی کوشش کے پریس آئے دن ہوٹل کے نوکروں، کارخانہ کی لڑکیوں، اسکول کے بچوں میں انقلاب و اضطراب پیدا کرنے کی فکر میں مبتلا ہے۔ اور یہ زہریلا اثر رفتہ رفتہ تمام ملک میں پھیلتا جاتا ہے۔

اسی مضمون کی تائید انگلستان کے دوسرے نامور صحافی و ادیب مسٹر چسٹرٹن کی طرف سے ہوئی ہے جنھوں نے کیمرج یونیورسٹی کے مباحثہ میں ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی۔

مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ پریس کا غیر معمولی اثر ملک کے لیئے مضر اور اس لیے قابلِ افسوس ہے مسٹر چسٹرٹن نے دورانِ تقریر میں پریس کی جس حیثیت کو سب سے زیادہ قابلِ افسوس و مضرت رساں ثابت کیا وہ "اجارہ داری" ہے۔ یعنی بعض دولتمند افراد کا مقتدر و با اثر اخبارات کو تجارتی اُصول پر قائم رکھنا اور چلانا۔ اس اجارہ داری کی تازہ مثال ہلٹن پریس کی بیع ہے اور لارڈ رانھمیر اور لارڈ نارتھ کلف کا وہ خطرناک اثر ہے جو برطانوی حکومت کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی یکساں محسوس کیا جاتا ہے۔ لیکن باوجود 'ڈیلی میل'، 'ٹائمز' جیسے اخبارات نہ ہونے کے ہندوستان خداوندانِ صحافت کے ہاتھوں جس مصیبت میں گرفتار ہے اُس کے مظاہر نہایت عبرت خیز و درد انگیز ہیں۔

پنجاب، مدراس، صوبہ متحدہ، بنگال کسی صوبہ کو لے لیجئے اور وہاں کے سیاسی مذہبی و اجتماعی اختلافات و مناقشات پر غور فرمائیے تو حیرت ہوتی ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ عقل و دانش کے طویل دعاوی کے باوجود تعصب و جہالت کی گرم بازاری کیوں ہے؟

مکتبہ جامعہ ملیہ کی خاص کتابیں

تاریخ الامت۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ آغاز اسلام سے آخر زمانہ سلاطین بنی امیہ و بنی عباس تک مکمل تاریخ اسلام اس سے قبل اردو میں موجود نہ تھی۔ تاریخ الامت نے اس ضرورت کو پہلی مرتبہ پورا کیا ہے اور اسی وجہ سے وہ علمی حلقوں میں خصوصیت سے مقبول ہوئی۔ تاریخ اسلام پر اس سے بہتر جامع مختصر اور مسلسل کتاب موجود نہیں۔ قیمت حصہ (سیرۃ) ۸عہ حصہ دوم (خلافت راشدہ) عار
حصہ سوم (بنی امیہ) ۸عہ حصہ چہارم (بنی عباس) عار

ترکوں کی کہانیاں آل عثمان کے جنگی کارناموں اور ترکی بہادروں کی جوانمردی اور اسلامی اخوت و ہمدردی کی سچی تصویریں (جو موجودہ واقعات سے لی گئی ہیں) کہ اس کتاب میں نظر آتی ہیں۔ قیمت ۱۴ر

مبادی معاشیات پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب ہے جو علم المعیشت کے تمام اصول نہایت خوبی کے ساتھ سہل اور عام فہم طریقہ سے ذہن نشین کر دیتی ہے۔ قیمت عہ ر

مجموعہ کلام جوہر رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب جوہر کی تمام جدید و قدیم کلام کا مجموعہ جس کا زیادہ حصہ بیجاپور جیل میں تصنیف ہوا ہے مع مقدمہ از مسٹر عبدالماجد بی۔اے و تازہ فوٹو مولانا صاحب۔ قیمت ۶ر

ازہار العرب مولانا محمد سورتی صاحب نے ادب عربی حصہ نظم کا ایک مختصر انتخاب فرمایا ہے جو عام طور پر طلبہ و اہل علم میں مقبول ہوا۔ قیمت ۸ر

ضروری تصحیح اس نمبر میں صفحہ ۲۱۴ کے بعد ۲۲۵ غلطی سے لکھا گیا ہے ۲۱۵ ہونا چاہئے اسی طرح ۲۲۴ تک صفحوں کے سب نمبر بدل جائینگے اس غلطی سے مضمون کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے ناظرین تصحیح فرمالیں۔ منیجر

دیوان غالب اُردو

جس طرح نظم اُردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہی اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہی اُس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہی کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سُرخ جلد پر سُنہرا کام ہی اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہی، اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دئیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالبؔ مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہی جو شروع میں درج ہی اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہی ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہنچ سکے بہرحال درخواست خریداری بھیج دیجیے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہ ہو۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے۔

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد ۲	ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۲۳ء		نمبر ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۵

تاریخ تصوف کا ایک ورق

کشف المحجوب

(شیخ علی بن عثمان ہجویری ؒ)

"تصوف کا اثر ہندوستان پر اس قدر شدید و وسیع ہے کہ اُردو زبان بھی جو اپنی کم عمری سے قدم قدم پر تصوف کی ممنون ہے، فن شعر جو ایشیائے ادب کا جزو اعظم ہے تصوف ہی کے سہارے اوج رفعت پر پہونچا ہے، حتیٰ کہ روزمرہ کی زندگی میں بھی مسائل تصوف پر دار و مدار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُردو میں تصوف کے متعلق کوئی مفید و مستقل تصنیف تو درکنار فارسی کتابوں کا معقول و قابل فہم ترجمہ بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے مکرم جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے جب سے رمز شناسی کو فلسفہ دانی پر ترجیح دی اُن کے قلم سے اس مسئلہ پر متعدد مضامین شائع ہوئے، لیکن آج جس مضمون کے شائع کرنیکا فخر ہمیں حاصل ہے وہ محض ایک آرٹیکل نہیں بلکہ مستقل تصنیف

"تاریخ تصوف" کا ایک باب ہے جو باقساط جامعہ میں شائع ہوگا۔

مدیر

عربی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کا نام کتاب اللمع ہے۔ جس سے ہم روشناس ہو چکے۔ فارسی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کشف المحجوب ہے۔ کتاب اللمع آج سے چند سال قبل دنیا کے لیئے معدوم تھی، اور اب بھی مشرق کے لیئے اُس کا عدم، اس کے وجود سے کچھ ہی بہتر ہے۔ خوش قسمتی سے کشف المحجوب اس حجاب گمنامی میں نہیں۔ داتا گنج بخش لاہوریؒ کا نام اکثروں کی زبان پر ہے، بالائی ہند کے بہ کثرت گھرانے اس ذات کے ساتھ عقیدتمندی کے مسکن ہیں۔ لاہور میں مدت ہوئی اصل فارسی نسخہ طبع ہو چکا ہے۔ اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ چند سال ہوئے سینٹ پٹرسبرگ یونیورسٹی (روس) کے پروفیسر "ژوکووسکی" کے زیر اہتمام کتاب یورپ میں چھپنے والی تھی، ممکن ہے چھپ چکی ہو۔ یہ سب کچھ ہے تاہم استفادہ کرنے والوں کا حلقہ اب بھی محدود ہے اور تصنیف و مصنف کے تعارف کرانے کی ضرورت باقی ہے۔

(۱) مصنف

مصنف علیہ الرحمۃ کا پورا اسم گرامی ابوالحسن علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلالی الہجویری اللاہوری ہے۔ ہندوستان میں عرف عام داتا گنج بخش مشہور ہے وطن غزنین تھا۔ مضافات غزنین میں ہجویر و جلاب دو قریے ہیں۔ دونوں میں قیام رہا، آخر عمر میں لاہور میں سکونت اختیار فرمائی تھی۔ یہیں انتقال کیا۔ اور یہیں مدفون ہوئے۔ اس ساری نقل و حرکت کے اظہار کے لیئے نام کے ساتھ غزنوی۔ جلابی ہجویری لاہوری کا ضمیمہ لگا ہوا ہے۔

سید حسنی نے شجرۂ نسب بعض تذکروں میں یوں دیا ہے۔ علی بن سید عثمان بن سید علی بن عبدالرحمن بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن امام حسن بن علی مرتضیٰ۔ بیعت شیخ ابوالفضل بن حسن سے تھی۔ جو شیخ ابوالحسن حصری کے مرید تھے۔ شجرۂ طریقت سید الطائفہ جنید بغدادی تک پہونچتا ہے۔ متعدد دیگر مشائخ کبار سے بھی استفادہ کیا تھا۔

کشف المحجوب میں جا بجا ان مشائخ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اپنے اور اُن کے تعلقات پر روشنی ڈالتے جاتے ہیں، مثلاً امام ابو العباس شقانی کے تذکرہ میں کہتے ہیں:-

"مرا باوے اُنسے عظیم بود، وو ی را بر من شفقت صادق، و اندر بعضے علوم، استاد من بود"
(کشف المحجوب، مطبوعہ لاہور، صـ ۱۲۱)

شیخ ابو القاسم گرگانی اور اپنے تعلقات کے تذکروں میں ایک عجیب واقعہ تحریر فرماتے ہیں:-

"روزے من اندر پیش شیخ نشستہ بودم، و احوال ہا و نمودہائے خود را برمی شمردم، بہ حکم آنکہ روزگار خود برِ وے سرہ (؟) کنم، کہ ناقد وقت است، وے بہ کراہت آں از من می شنید و مرا نخوت کودگی و آتش جوانی بر گفتار آں حریص می کرد، و خاطر بے صورت می بست کہ مگر ایں پیر را در ابتدا درین کوے گزرے نہ بودہ است کہ چندیں خضوع می کند اندر حق من و نیاز می نماید۔ اندر باطن من آن بدید، و گفت اے دوست پدر (؟) بدانکہ ایں خضوع من نہ با تر او حال تر است کہ محول احوال بر محل محال آید (؟) بلکہ ایں خضوع من محول احوال را می کنم، و ایں عام باشد مر ہمہ طلاب را نہ خاص ترا۔ چوں ایں بشنیدم از دست بیفتادم وے اندر من بدید، و گفت اے پسر آدمی را بدیں طریقت نسبت بیش ازاں نبود کہ چوں وے را بہ طریقت باز بندد۔ پندار یافت ناگرانند پس ازاں کہ وں کنندش بہ عبارت پندارش برسد۔ پس نفی و اثبات فقد و جود وے ہر دو پندار باشد، و آدمی ہرگز از بند پندار نرہد۔ وے را باید کہ درگاہ بندگی گیرد و جملہ نسبتہا را از خود دفع کند بجز نسبت مردمی و فرمانبرداری و از بعد آں مرا باوے اسرار بسیار بود اگر بہ اظہار آیات وے مشغول گردم از مقصود بمانم" (ایضاً، صـ ۱۲۲)

ایک جگہ خواجہ ابو احمد مظفر سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے وہ بھی ارباب حال کے لیے اسی قدر دلچسپ ہے:-

"روزے من اندر گرمائے گرم بہ نزدیک وے اندر آمدم با جامہ راہ و ژولیدہ موئے، مرا گفت یا ابا الحسن، ارادت حالے مرا گوے تا چیست۔ گفتم مرا سماع می باید، اندر حال کس فرستاد

تا قوالے بیاوردند جماعتے را از اہل عشرت۔ و آتش کودکی و قوت بادت و حرکت ابتدا مرا اندر سماع کلمات مضطرب کرد۔ چوں زمانے برآمد و سلطان و طغیان آں طاقت اندر من کمتر شد مرا گفت چگونہ بود مر ترا ایں سماع گفتم ایہا الشیخ سخت خوش بودم گفت وقتے بیاید کہ ایں و بانگ کلاغ ہر دو مر ترا یکساں شود۔ قوت سماع تا آنگاہ بود کہ مشاہدہ نہ باشد۔ چوں مشاہدہ حاصل آید، ولایت سمع ناچیز شود۔ و کرد (؟) تا ایں را عادت نہ کنی، تا طبیعت نہ شود و بازیداں بمانی" (ایضاً ص ۱۲۳)

اسی طرح سلطان ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم قشیری وغیرہ دیگر مشاہیر صوفیہ سے اپنی ملاقات کے تذکرے لکھے ہیں:۔

حنفی المذہب تھے۔ امام ابوحنیفہ سے خاص عقیدت تھی۔ اُن کا نام "امام امامان و مقتدائے سنیاں، شرف فقہا، و عز علما" کی حیثیت سے لیا ہے، اور اُن کے کمالات کا بیان تفصیل سے کیا ہے (ص ۱۱۶)

اس ضمن میں اپنا ایک خواب بھی تحریر فرماتے ہیں، جس کا اقتباس لطف و نفع سے خالی نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ

"میں ملک شام میں تھا۔ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ (موذن) کے مزار کے سرہانے سو گیا۔ خواب میں دیکھتا ہوں، کہ مکہ میں حاضر ہوں، اور پیغمبر خدا صلعم باب بنی شیبہ سے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ اور اس طرح کہ کوئی کسی بچہ کو گود میں لیئے ہو، ایک مسن شخص کو اپنی گود میں لیئے ہوئے ہیں۔ میں دوڑتا ہوا حضور میں پہونچا، پاے اقدس کو بوسہ دیا، اور دل میں سوچنے لگا، کہ یہ مرد مسن کون ہیں۔ حضور صلعم کو میرے مضطر قلب پر اطلاع ہو گئی۔ ارشاد ہوا، کہ یہ شخص تیرا اور تیری قوم کا امام ہے، یعنی ابوحنیفہ۔ اس سے مجھے اپنے اور اپنی قوم کے حق میں بہت کچھ امیدیں ہو گئیں۔ اور اس خواب سے مجھ پر یہ بھی منکشف ہو گیا کہ ابوحنیفہ ان لوگوں میں ہیں جو اپنے صفات ذاتی سے خالی ہو چکے ہیں، اور محض احکام شرعی کے لیئے باقی ہیں، اس لیئے کہ اُن کے حامل رسول خدا صلعم تھے۔ اگر میں انھیں خود چلتے ہوئے

دیکھا تو معلوم ہوتا کہ وہ باقی الصفت ہیں۔ اور باقی الصفت کے لیئے خطا و صواب دونوں کا امکان ہے لیکن چونکہ انھیں رسول خدا صلعم کی گود میں دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ اُن کا وجود ذاتی فنا ہوچکا ہے اور اب جو ان کا وجود قائم ہے وہ رسول خدا صلعم کے وجود سے قائم ہے اور چونکہ رسول خدا صلعم کے لیئے کسی طرح کی خطا کا امکان نہیں اسلیئے جس کا وجود اُن میں فانی ہوچکا ہے وہ بھی امکان غلط سے پاک ہے (ایضاً صفحہ ٢٥-٢٦)

سفر و سیاحت میں اکثر رہا کرتے تھے۔ شام سے لے کر ترکستان اور ساحل سندھ سے لے کر بحر قزوین تک یعنی اپنے زمانہ کی تقریباً ساری اسلامی مملکت کی سیاحی کا ذکر کیا ہے۔ آذربائیجان، بسطام، دمشق۔ رملہ۔ بیت، نیمن، طوس۔ جہنہ اور جبل اسلام کے نام اپنے سفرناموں کے ذیل میں تصریح کے ساتھ لئے ہیں۔ ایک بتہ دوران قیام عراق میں معلوم ہوتا ہے کہ دولت بہت جمع ہوگئی تھی، اور اُس کے اسراف سے قرضداری کی نوبت آگئی تھی۔ فرماتے ہیں:-

"وقتے من اندر دیار عراق اندر طلب دنیا و فنا کردن آں تاباکے می کردم (؟) و وام بسیار برآمدہ بود، شوبہ ہر کسے راکہ بایستے بوشے (؟) رشنے بہ زن آوردہ بودند، ومن در رنج حصول ہوائے شان ماندہ بودم" (صفحہ ٢٦٨)

عرصہ تک پریشانی رہی۔ بالآخر ایک رویش کی موعظت کے اثر سے فراعت نصیب ہوئی۔ قید از دواج سے غالباً ہمیشہ آزادی رہی۔ البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایک بتہ کسی کے خدنگ نظر سے گھائل ہوگئے تھے، اور ایک سال تک اس زخم کی تڑپ نے بیتاب کیا، بالآخر فضل ایزدی نے زخم کا مرہم بھی پیدا کردیا عبارت اس قدر مبہم ہے کہ تفصیلات کا پتہ بالکل نہیں چلتا:-

"من کہ علی بن عثمان الجلابی ام از پس آنکہ مرا حق تعالیٰ یازدہ سال از آفت تزویج نگاہ داشتہ بود، ہم تقدیر کرد تا بفتنہ اندر افتادم۔ و ظاہر و باطنم اسیر صفتے باشد کہ بامن کردند (؟) بے آنکہ رویت بودہ و یکسال مستغرق آن بودم چنانچہ نزدیک بود کہ دین بر من تباہ شود۔

تا حق تعالے بہ کمال لطف و تمام فضل خود، عصمت را بہ استقبال دل بیچارہ من فرستاد، و بہ رحمت خلاصی ارزانی داشت" (ص ۲۸۵)

استعداد علمی کی تفصیل کسی تذکرہ میں درج نہیں۔ لیکن کشف المحجوب کی تصنیف خود اس امر کا واضح ثبوت ہے، کہ اُس کا مصنف علوم ظاہری میں تبحر رکھتا ہے بعض تذکروں میں اجمالاً صرف اس قدر ہے "جامع بود میاں علوم ظاہر و باطن" اور یہ یقیناً صحیح ہے۔

بعض تذکروں میں ہے، کہ لاہور اپنے مرشد کے حکم سے آئے۔ اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے ایک ملفوظ میں تو ورود لاہور کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ فوایدالفواد میں ہے کہ شیخ علی ہجویریؒ و شیخ حسین زنجانیؒ دونوں ایک ہی مرشد سے بیعت رکھتے تھے۔ شیخ حسین زنجانیؒ عرصہ سے لاہور میں سکونت رکھتے تھے۔ ایک وز شیخ علی ہجویری کو مرشد کا حکم ملا کہ لاہور میں سکونت اختیار کرو۔ عرض کیا کہ وہاں تو شیخ حسین پیشتر سے موجود ہیں" مکرر ارشاد ہوا کہ "تم جاؤ"۔ تعمیل کی۔ شب میں لاہور پہونچے، اُسی شب میں شیخ حسین نے انتقال فرمایا، اور صبح اُن کا جنازہ اُٹھایا گیا[۱]۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کو مرشد کے حکم سے اپنا مسکن بنایا تھا۔ لیکن خود کشف المحجوب کی ایک عبارت سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے، کہ لاہور کا قیام مرضی کے خلاف کسی مجبوری سے تھا۔ فرماتے ہیں، کہ

"کتب من بہ حضرت غزنین ماندہ بود و من در دیار ہند در بلدہ لاہور کہ از مضافات ملتان است درمیان ناجنسان گرفتار شدہ بودم (ص ۶۵)	میری کتابیں غزنین میں چھوٹ گئی ہیں اور میں ہندوستان میں شہر لاہور میں ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔

اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ "گرفتاری" کا لفظ فقرہ بالا میں مجازاً استعمال کیا ہے، یا واقعۃً۔

عام لقب گنج بخش مشہور ہے، اس کی بابتہ یہ روایت ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیریؒ نے آپ کے مزار پر آکر چلہ کیا، اور اکتساب فیوض و برکات کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو

---

[۱] فوایدالفواد، مرتبہ امیر حسن علاء سنجریؒ، ص ۲۵ (مطبوعہ نولکشور)

مزار کے رخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا؎

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا　　　کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما

اُس وقت سے گنج بخش کا لفظ عام زبانوں پر چڑھ گیا[1]

سنہ وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ صاحب نفحات الانس خاموش ہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیاء نے دو روایتیں دی ہیں۔ ایک سنہ ۴۵۶ھ اور دوسری سنہ ۴۶۴ھ کی بابت[2]۔ آزاد بلگرامی نے ایک ضمنی موقع پر سنہ ۴۶۵ھ درج کیا ہے[3] نکلسن کا قیاس ہے کہ سنہ ۴۶۵ھ و سنہ ۴۶۹ھ کے درمیان وفات ہوئی[4]۔ مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے اُس سے بھی سنہ ۴۶۵ھ ہی نکلتا ہے۔ راقم سطور کے نزدیک بھی اسی کو صحیح ماننا چاہیئے۔ مزار شہر لاہور کے باہر سمت غرب میں واقع ہے۔ ہر جمعرات و جمعہ کو زایروں اور حاجتمندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ چالیس روز متصل یا پچیس شبہائے جمعہ کو طواف مزار کرنے سے ہر مشکل آسان اور ہر حاجت روا ہو جاتی ہے[5]

اس قدر یقینی ہے کہ تصوف پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن آج ان تصانیف کا وجود تو الگ رہا، ان کے نام تک کسی تذکرہ میں محفوظ نہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیا اس سے زاید نہ لکھ سکے کہ

"حضرت پیر علی ہجویری را تصانیف بسیار است"

البتہ خود کشف المحجوب میں مصنف نے جابجا اپنی دوسری تصانیف کے حوالے دیئے ہیں۔ ان عبارتوں کے یکجا کرنے سے تصانیف ذیل کا پتہ چلتا ہے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں۔ اس قدر تو بہرحال قطعی ہیں:۔

نام کتاب	عبارت کشف المحجوب
۱۔ دیوان	یکے آنکہ دیوان شعرم کسے بہ خواست (ص ۱)

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، غلام سرور لاہوری، جلد دوم ص ۲۳۴　[2] سفینۃ الاولیاء، ص ۱۶۵
[3] مآثر الکرام ص ۶ (نسخہ شائع کردہ عبداللہ خاں، حیدرآباد دکن)، [4] مقدمہ ترجمہ انگریزی کشف المحجوب
[5] سفینۃ الاولیاء، ص ۱۶۵

۲۔ منہاج الدین — "دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف، نام آں منہاج الدین (صلے) نیز "پیش ازیں کتابے ساختہ ام مرآں را منہاج الدین نام کردہ اندر شرح مناقب [اہل صفہ] یک یک بہ تفصیل آوردہ" (ص۵۰) نیز "اندر کتابے کہ کردہ ام بجز ایں منہاج نام" (ص۱۱۱)

۳۔ کتاب الفناء والبقا — "و مر ازیں جنس سخن است اندر کتاب فنا و بقا" (ص۱۰)

۴۔ اسرار الخرق والموؤنات — "مر اندریں باب کتابے ست مفرد کہ نام آں اسرار الخرق والموؤنات (ص۳۵)

۵۔ کتاب البیان لاہل العیان — "من اندریں معنی تا حال ہدایت کتابے ساختہ ام و آں را کتاب البیان لاہل العیان نام کردہ شد (ص۱۹۵)

۶۔ بحر القلوب — "اندر بحر القلوب اندر باب جمع فصولے گفتہ ام" (ص۱۹۵)

۷۔ الرعایۃ لحقوق اللہ — "طالب ایں علم را ایں مسئلہ از کتاب دیگر باید طلبید کہ کردہ ام، و آں را الرعایۃ لحقوق اللہ نام کردہ" (ص۲۱۱)

ذیل کی عبارتوں میں دو کتابوں کے حوالے اور آتے ہیں، خدا معلوم اِن سے مراد کتب بالا ہی ہیں، یا یہ تصانیف ان کے علاوہ ہیں۔ نکلسن کا خیال ہے کہ یہ علٰحدہ تصانیف ہیں۔ اس حساب سے دو کتابوں کا اور اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

۸ ۔ "پیش ازیں اندر شرح کلام وے [منصور حلاج] کتابے ساختہ ام" (ص۱۱۱)

۹ "من اندر بیان ایں (ایمان) کتابے کردہ جداگانہ (ص۲۱۵)

آج یہ سب کتابیں عنقا ہیں۔

مخدوم موصوف علیہ الرحمۃ کے مرتبہ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہے۔ خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جیسے مسلم اکابر نے آپ کے مزار پر چلّے کھینچے ہیں، اور فیوض و برکات حاصل کیئے ہیں۔ باقی آئندہ

نامۂ جوہرؔ

(۱)

بزرگانِ قوم کی بعض خصوصیات جو دلیل بزرگی اور وجہ عظمت ہیں قوم کے سامنے اُن کی حیات میں نہیں آتی ہیں، یہی سبب ہے کہ اکثر اکابرِ ملت کی زندگی میں ان کے کارناموں کا صرف ایک ہی رُخ نظر آتا ہے اور موت کے بعد لوگوں کو جستجو ہوتی ہے کہ کسی طرح اس بزرگ کی زندگی کے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہوسکے فراہم ہو جائے۔ مکتوبات شائع کیے جاتے ہیں، احباب و رفقاء کی یادداشتوں سے کام لیا جاتا ہے، تصنیفات اور تالیفات کی اشاعت کی فکر ہوتی ہے، لیکن جن بزرگوں کی حیات میں علاوہ دیگر کارناموں کے متعلق اس قسم کی معلومات بھی فراہم ہوجائے تو اس کو اُن کی اور قوم دونوں کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے، اُنکی اسلیئے کہ اُنکی زندگی کے متعلق غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی اور قوم کی اسلئے کہ وہ اُن سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتی ہے:

"ہم اس مکتوب گرامی کی اشاعت اپنے مکرم جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے کی عنایت سے کر رہے ہیں اور امید ہے کہ یہ سلسلہ کچھ دنوں جاری رہے گا۔" مدیر

چھندواڑہ ۱۶ راگست ۱۹۱۶ء

مکرمی۔ السلام علیکم۔ عنایت نامہ مورخہ ۷ راگست چند روز ہوئے ملا۔ مجھے تو خوف تھا کہیں آپ میری تنقید سے ناراض نہ ہوجائیں[1] مگر نیت بخیر تھی اور جانبین کو صرف اصلاح مطلوب تھی نہ کہ

---

[1] مکتوب الیہ کا انگریزی رسالہ سائیکالوجی آف لیڈرشپ ۱۹۱۵ء کے آخر میں انگلستان میں شائع ہوا ہے، جون ۱۹۱۶ء میں حضرت جوہر کی نظر سے زمانۂ نظربندی چھندواڑہ میں گزرا ہے، اور اُنھوں نے اس پر ایک مبسوط اور پرزور تنقید اپنے عنایت نامہ میں لکھکر مصنف کو بھیجی ہے، جس میں زیادہ تر گرفتیں مذہبی نقطۂ نظر سے ہیں۔ مکتوب الیہ نے اس کے لیے شکریہ لکھکر بھیجا ہے اور ضمناً بعض مسائل کی مزید توضیح کی ہے۔ یہ مکتوب گرامی اسی کے جواب میں ہے، اس کے قبل کے عنایت نامہ افسوس ہے کہ انگریزی زبان میں ہیں، مکتوب الیہ کے پاس اب تک محفوظ ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ میں اُن کا پورا لطف باقی نہیں رہ سکتا۔

افساد اس لیے میرا خیال صحیح نکلا کہ آپ کو ایک سچی اور دلسوزی کی تنقید محض تقلیدی تعریف و توصیف سے زیادہ پسند ہوگی۔ عریضہ نہایت ہی مفصل تھا مگر پھر بھی اگر ہم دونوں ساتھ ہوتے تو جزئیات کے متعلق بھی بہت کچھ عرض کر سکتا اس زمانہ میں استبداد و استعباد نے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے دو لفظ گھڑ لئے ہیں (Construotivé Destruotive یا تعمیری اور تخریبی) اور اس میں سے موخر الذکر کو تو ہر سچی تنقید کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور مقدم الذکر کو اس عنقا صفت تنقید کے لئے مختص کر رکھا ہے جو آج تک نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کبھی کانوں نے سنا اور جو نہ کسی متنفس کے دل و دماغ میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی جاگزیں ہوا حالانکہ اگر فن نقادی کو صحیح طور پر دیکھا جائے تو اس کا اولین فرض ہوتا ہے کہ اس قصر سربفلک کی تعمیر کے لیے جس کا نقشہ اس کے تصور ہی میں ہوتا ہے (یا کہیں کہیں کسی شاعر یا فلسفی یا ادیب کے کلام میں بھی کوئی محراب یا گنبد نظر آجاتا ہے) زمین کو صاف کرے اور آس پاس کے بوسیدہ مکانات بدنما جھونپڑے اور تنگ تاریک بے قاعدہ گلیاں وہاں سے دور کر دے بہر حال تعمیر سے پہلے تخریب تھوڑی بہت کرنا ہی پڑتی ہے اگر استبداد کے عام اعتراض میں کوئی اصلیت ہے تو محض اس قدر کہ تخریب صرف تخریب کی غرض سے نہ ہو بلکہ تعمیر کا پیش خیمہ ہو سو میں نے جو کچھ بھی لکھا اسی غرض سے لکھا تھا کہ جب کبھی نظر ثانی کا موقع آئے تو آخری فیصلہ کرتے وقت میرے پراگندہ خیالات میں سے جو ضروری اور مفید معلوم ہوں پیش نظر رکھے جائیں

پیغمبر اسلام (روحی فداک یا رسول اللہ) کے متعلق ظاہر ہے کہ آپ ان کو اتنا بڑا پیشوا مانتے ہیں اور کتاب کے ہر پڑھنے والے سے بھی منوانا چاہتے ہیں جتنا کہ کوئی پیشوا ہو گزرا ہو جس کی نظیر کتاب میں موجود ہے له ورنہ ایک مسلمان کو کچھ بھی ضرورت نہ تھی کہ جہاں نپولین وغیرہ کا موازنہ کیا جا ہو وہاں ذکر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا جاسے آج کل کی سیاست بین الاقوامی کی اصطلاح

له کتاب مذکور میں جہاں جہاں قائدین عظام یعنی بڑے بڑے لیڈروں کی مثالیں درج کی گئی تھیں وہاں مصنف نے اپنی جہات سے حضور سرور عالم صلعم کا اسم پاک بھی درج کیا تھا، اور اگرچہ حضورؐ کی ذات گرامی کو سب سے افضل قرار دیا گیا تھا، تاہم اسی طبقہ میں نپولین، سکندر، وغیرہ دنیوی سرداروں کا بھی ذکر تھا۔

میں آپ کا "غیر طرفدار رہنما" بھی ایک ایسی کتاب کے لکھنے میں جسے ہر ملت و مذہب والا پڑھے قرین مصلحت تھا میں نے اس خیال (Conception) پر ہرگز اعتراض نہیں کیا ہے اگر اعتراض ہے تو محض طرز عمل (Executiv) پر۔ اب چونکہ خود آپ کی تحریر سے واضح ہو گیا کہ آپ ہی چاہتے تھے جو میں سمجھا تھا کہ آپ چاہتے ہونگے اس لئے میری تنقید کی نوعیت بھی واضح تر ہو گئی اور وہ اسی طرح باقی ہے یعنی ایک عام پڑھنے والے پر آپ کے الفاظ اور جملوں کا اور نیز ان موقعوں کا جن پر تذکرہ آنحضرت صلعم کیا گیا ہے ایک حد تک ضرور یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ بار بار غور کرے کہ کہیں آپ آنحضرت صلعم کو مارگولیتھ سمجھے (یہ میری بدنصیبی تھی کہ آکسفورڈ میں جب میرا ارادہ تحقیق (Research) کی ڈگری لینے کا تھا تو یہ میرے رہنما مقرر کئے گئے تھے اس کے علاوہ پیشتر بھی کچھ عربی ان سے پڑھی تھی) وغیرہ کی طرح ایک چلتا ہوا لیڈر تو ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ چونکہ یہ کام آپ کا نہ مفہوم ہو سکتا تھا نہ ہے اس لئے میری یہ توقع بھی بیجا نہیں کہ آپ اپنی تصنیف کو ایک بار اس شبہ کو دل میں جگہ دے کر پڑھیں کہ مصنف کوئی غیر مذہب والا ہے جو مسلمانوں کو یا کم از کم غیر مسلموں کو تو ضلالۃ کی طرف آہستہ آہستہ لے جانا چاہتا ہے تاکہ وہ عظمت جو ایک وحی پانے والے رسولؐ کی ان کے دل میں ہو وہ دور ہو جائے اور اس طرح دور ہو کہ خود پڑھنے والوں کو بھی اس تبدیلی خیالات کا احساس نہ ہونے پائے اور اس لئے بطور ایک "بئس البدل" کے خلعت نبوت اتار کر لیڈری کی گون (Gown) پہنادی ہے یہ ہرگز آپ کا خیال نہ تھا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے مگر جس طرح سے حساب میں بچے اپنے سوالوں کے جوابات کی جانچ کرتے ہیں کہ تقسیم کا ہے تو ضرب دے کر دیکھتے ہیں اور تفریق کا ہے تو جمع کر کے اسی طرح ایک پڑھنے والے کے جذبات اور اس کے دل پر جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ تاثر کو الٹ دیا جائے اور جو تنقید کہ ایک نقاد پیش کرتا ہو اس کو صحیح تسلیم کر کے اور جو اثر کہ آخر کار پڑھنے والوں کے دل پر بقول اُس کے پڑنا ممکن یا اغلب ہو اُسے قبول کر کے پھر کتاب کو پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ جو نقوش پڑھنے سے پیشتر ہی دل پر منقش ہو گئے تھے باقی رہتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں یہ بھی یاد رہے کہ گھڑی ساز جو گھڑی کے کسی ٹوٹے ہوئے پرزے کو

سنبھالنا چاہتا تو خوردبین شیشہ لگا لیتا ہے جس سے نقص اصلیت سے کہیں بڑا معلوم ہوتا ہے یہ اس غرض سے کہ باریک سے باریک نقص بھی صاف نظر آجائے اور اصلاح کی جا سکے، اچھے سے اچھا نقاد بھی اکثر اسی غرض سے مبالغہ سے کام لیتا ہے اور عوام سے کہیں زیادہ اُسے لطیف اور باریک بین بننا پڑتا ہے چونکہ غرض اصلاح ہے نہ کہ افساد اس لیئے یہ بال کی کھال نکالنا اُس کے لیئے جائز ہی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کے لیئے اصرار کرنا چاہیئے اسی وجہ سے میں نے بھی اس تنقید میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور مصر ہوں کہ آپ خود اس سے بھی زیادہ مبالغہ سے کام لیں جوہری جب نگین تراشنے میں مصروف ہوتا ہے تو زیادہ وقت اس کا اس تراش خراش میں صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آسکے بلکہ ایسے باریک اصلاح میں جس کا نظر آنا تقریباً ناممکن ہے اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت میں تراشتا ہے وہ نہایت باریک خاک کے چند ذرے ہوتے ہیں جو تراشتے تراشتے ہی ہوا لے اُڑتی ہے مصنف کسی طرح جوہر فروش سے کم نہیں اور اس سے زیادہ باریک بین نقاد اُس کی تصنیف کا اور کوئی نہ ہونا چاہیئے فلسفۂ اجتماع[۱] کب تیار ہوئی ؟ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اُردو اپنی طرف سے شائع کردہ کتابوں کا کافی اشتہار نہیں دیتی، اُسے چاہیئے کہ اگر کسی کتاب پر ایک ہزار روپیہ صرف کرے تو کم از کم ۲۵۰ روپیہ اس کے متعلق اشتہاروں پر بھی صرف کرے۔ اخبار والے اُس کے ساتھ ضرور رعایت کریں گے میں نے خود ہمدرد میں یہی کیا تھا مگر خود انجمن کے کارکن اس معاملہ میں تساہل برتتے تھے آپ بیسویں صدی کی اس ضرورت اور Psychology of the Advertise پر عبدالحق صاحب کو ضرور کچھ لکھیئے۔

نفسیات القرآن[۲] پر آپ نے جو لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اُس کے متعلق کیا پوچھ سکتا ہوں کہ

---

[۱] مکتوب الیہ کی اردو کتاب کا نام ہے، جو اسی قسم کی مزخرفات سے لبریز تھی اور جس کی اشاعت اب اس نے دو تین سال سے روک دی ہے۔

[۲] مکتوب الیہ کا ارادہ اُس وقت انگریزی میں ایک دوسری کتاب Psychology of the Quran تیار کرنے کا تھا، بلکہ اس کا ابتدائی حصہ تحریر بھی ہو چکا تھا۔

کلام کا "نقشہ" اور "تخمینہ" (بہ اصطلاح تعمیرات) کیا ہے میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہونگے
زیادہ سے زیادہ ایک ایسی ریڈیکل کے جسم میں ایک مذہبی دقیانوسی کی روح رکھنے والا سمجھیں گے اگر میں
عرض کروں کہ بقول حالی ؏ "یاں جنبشِ لب، خارج از آہنگ خطا ہے" جو کچھ بھی لکھا جانے
وہ یہ سمجھ کر کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ محاورہ انسانی ہے مگر اس کی تمام Psychology خلاق زمین و
آسماں کی ہے غالباً آپ نفسیات القرآن سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بڑے سے بڑا Psychologist
بھی اس طرح انسانی نفسیات کے اسرار و نکات سے نہ واقف ہو سکتا ہے نہ اُن کے اظہار کے لیئے الفاظ
اور ترکیبیں اور فقرے کسی زبان میں پا سکتا ہے جس طرح خود اُس ذات پاک نے قرآن کریم میں ظاہر فرما دیا
عالم الغیب والشہادہ اور انسان کا پیدا کرنے والا ہے اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میدان نہایت وسیع ہے
مگر رہرو کو ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھانا پڑتا ہے میں ہرگز اُن لوگوں کے طرفداروں میں نہیں ہوں
جو کلام ربانی سے اس قدر خائف ہو جائیں کہ نہ اُسے کبھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں نہ اس کے
متعلق کچھ سوچیں نہ پوچھیں گچھیں، کلام پاک ریشم کے جزدانوں میں اور الماری کے بالاترین حصوں
میں اور وہاں کی گرد و غبار کے لیئے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا
ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان۔ کاغذ کی پٹیاں بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے
اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے
کسی کتاب کو نہیں پڑھتے نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر مجھے اُن لوگوں
سے ہمدردی ضرور ہے جو قرآن کو نہایت احتیاط و اہتمام کے ساتھ چھوتے ہیں گو برس دو برس میں
ایک ہی دفعہ کیوں نہو، یہ اُمّ الکتاب ہے اور اس کا ادب باقی رکھنا اس لیے لازم ہے کہ اگر اتنی احتیاط
نہ برتی جائے تو تحریف کا اندیشہ ہے، اور تمام صحف ماقبل اس خطرہ کے بیجا نہ ہونے کا کافی سے زیادہ
اور سخت دلخراش ثبوت ہیں اس لیئے ایک صاحب نے جب ایک ترجمہ بلا متن میرے پاس ریویو
کے لیئے بھیجا تو میں نے انھیں اطلاع دے دی کہ مجھے ایندھن کی آج کل ضرورت نہیں ہے کیا مسلمانوں
کے لیے یہ بات مایۂ ناز نہیں کہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر مسلمانوں نے اس اُمّ الکتاب

کو اِس احتیاط سے رکھا کہ آج تک ایک لفظ یا حرف تو کجا ایک زیر زبر کا بھی فرق نہیں ہونے پایا اور تمام فرقے اِس پر اتفاق کُلّی کرتے ہیں قرآن پاک تو قرآن پاک دوسرے صحائف ہمارے کتب حدیث کی تحقیق و تدقیق اور صحت و حفاظت کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے قصہ مختصر مجھے اُمید ہی کہ جو کچھ بھی آپ لکھیں گے ادب قرآن کو ہر طرح ملحوظ رکھیں گے مگر لکھئے ضرور اِس سے ہرگز نہ خائف ہوجیئے یہ تو ایسی سیدھی سادی کتاب (غیرِ ذی عوج) ہی کہ عرب کے گنوار مدینۂ منوّرہ جاتے اور نبی اکرمؐ سے اسے سُنتے اور ہم سے کہیں زیادہ سچے مسلمان بن کر اپنے بالوں والے خیموں اور اپنے ریگستان اور گلّوں میں واپس آجاتے مفسرین کا جہاں شکریہ ادا کرنا ہی وہاں یہ شکایت بھی باقی ہی کہ باوجود سچی محبت اور احترام کے اُنھوں نے بھی ایک حساب سے ادب قرآن پاک قائم نہ رکھا جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر اس نیت سے کہ اپنا کمال تمام اس صحیفۂ اکرم پر صرف کردیں مگر بعض اوقات یہ بھول گئے کہ کہیں حاشیہ متن کو اپنے بوجھ اور پھیلاؤ سے چھپا اور دبا نہ لے یہی حال شیکسپیر کے جرمن شارحین کا ہی ان کا ساری دُنیا پر احسان ضرور ہی کہ شیکسپیر کو خود اس کے ہموطنوں کے تغافل سے نجات دی مگر اب تو بعض نے شیکسپیر کو محض اپنی مضمون آفرینی کا آلہ بنا لیا ہی خدا مسلمانوں کو قرآن پاک متعلق اس شر سے بچائے[1] آمین۔

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہوگئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا رام پور میں اُس زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا، داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کررہے تھے، خود میرے خاندان میں بھی شعرگوئی کا ذوق ہوا تین چار عزیز اُستاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب

سلہ ان اشارات و مواعظ عالیہ کی قدر مکتوب الیہ کو ان کے وقت تحریر سے ۶-۷ سال بعد جا کر ہوئی۔

اور ان کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوق شامل تھے گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو
نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورش
سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض کار بیکاراں کی نذر نہ ہو، یہ میرے مکان
کے عقب میں تھا، اس لیے روزانہ ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی، اور اب اس بذلہ سنج
کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں۔ جنھوں نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا، ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو کہ
آیا دہلی سے ایک مشکی خر ۔ آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا، داغ کی غزل کے

کیجئے سہ

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا ؛ خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور
نہ تھا، اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کچھ شعر بھی یاد ہیں میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے
کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے، جنھیں میں نہایت زور و شور سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے
داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیئے سن کر پھڑک اٹھے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا، کہ
اس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں۔ کہ شعر و سخن کی گود
میں پلا ہوں۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنیئے، میں نہ صرف شعر و
سخن کی گود میں پلا ہوں۔ بلکہ اسی لونڈ پر کودا ہوں۔ اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض
کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۸۱ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و
فضول شعر مگر با معنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میرے
(یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری امت" Official Biography
کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا۔ تو میرے سیرۃ نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس بچر لوچ کو ڈوی وال

بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے۔ یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے، ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک چڑیا چرونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چرونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے، مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور روٹی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو، اور جوابدہی ہمارے سر آپڑے۔

آپ نفسیات کے ماہر ہیں، کیا ممکن نہیں کہ میرا یہ جنے والا سیرۃ نگار باوجود نقاد سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا۔ کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشنضمیر ہوں اور اُن اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالامال کر دیں۔ اس لیئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لیئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن اُستاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سُنیئے کہ گیارہ برس کی عمر میں میں علیگڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ "المامون میز پر رکھا تھا۔ اُٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے۔ اُس کا ایک شعر عربی کا پڑھا۔ تو اُس کا مجھے ترجمہ سُنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے"۔ مولانا کو یقین نہ آیا۔ اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی۔ پھر اُس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اُسی وقت دیا۔ اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اُسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی۔ اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہمارے لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی۔ اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی۔ تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں

البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، اُن میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسین صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعدہٗ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا۔ اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی، کرکٹ کا لان جلسۂ مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہوگئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرحی میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ہے

فرش پر مردیں نہیں وہ چاندنی نہیں لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اہمیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو "اور سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و تورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا اور محض حالات گرد و پیش کا تقاضا اس کا محرک تھا۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے پہنے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا گزشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا۔ تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے۔ اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنگ آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں۔ اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے۔

کہ پوری غزلیں لکھ بھیجوں۔ اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں Touch stone کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں A poor thing but mine own اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بقول آپ کے میری "اُمت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیئے ہیں۔"

دولت موریہ

دولت موریہ کا آغاز کیونکر ہوا

۱۔ سکندر رومی کے حملے سے جو بے ربطی و توزبت کے عناصر پیدا ہو گئے تھے وہ ایک زبردست شہنشاہی کے بال و پر بن گئے جس نے دو سو برس تک ہندوستان پر نہایت سطوت و جبروت سے حکومت کی۔ دولتِ نندہ کا غیر مستقل اور زوال آمادہ نظام اس طوائف الملوکی کی تاب نہ لا سکا جو رومی حملے سے پیدا ہوئی تھی اور بدنظمی کے پھیلتے ہی خاندان نندہ خیال باطل کی طرح منتشر ہو گیا لیکن قدرت نے اس عام بدنظمی اور بے ربطی میں ایک ایسا بے وطن مشکل پسند شخص پیدا کیا جس نے منتشر قوم کی شیرازہ بندی کی۔ اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے سکندر کی فوج میں رہ کر مرتب و مستعد لشکر کے فائدے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اُس نے محمد علی پاشا کی طرح محسوس کیا تھا کہ بڑی سلطنتیں جن کا نظام بے ربط ہو آسانی سے دشمن کا شکار بن جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کا وزیر چانکیا دور اندیش اور ہوشیار مدبر تھا جس کی مدد سے اس اولوالعزم نوجوان نے ایک لشکر ترتیب دے کر شاہان نندہ کے دار الامارت پٹالی پتر پر قبضہ کر لیا۔ سلطنت موریہ کے قیام سے (یعنی سنہ ۳۲۲ ق۔م سے) ہندوستان کی سیاسی تاریخ حقیقی معنوں میں شروع ہوتی ہے۔

چندر گپت

۲۔ چندر گپت معمولی بادشاہ نہ تھا سکندر کے حملے کے نتائج اس کے ذہن سے محو نہ ہوئے تھے بادشاہ ہوتے ہی اُس نے ایک زبردست لشکر تیار کر کے شمال ہند پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی کامیابی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ سنہ ۳۰۵ ق۔م میں جب سلوکس نکاتار (فاتح) نے جو سکندر کے ممتاز افسروں میں تھا اور جس نے سکندر کے ایشیائی مقبوضات کو بآسانی فتح کر لیا تھا اپنے نامور آقا کے نقش قدم پر چلنے کے ارادہ سے دریائے سندھ پار کیا تو ایک جرار ہندی لشکر اُس کے مقابلہ کے لئے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر موجود تھا جس نے اچھی طرح اُسے اس گستاخی کی سزا دی اور بالآخر

سلوکس کا حملہ اور اس کی شکست

سلوکس کو اریانہ (دریائے سندھ کا مغربی علاقہ) ہاتھ اٹھالینا پڑا اور پانچسو ہاتھیوں کے حقیر معاوضے میں کابل قندہار اور ہرات کے صوبے ہندی تاجدار کے نذر کرنا پڑے مزید براں سلوکس کو مجبوراً اپنی لڑکی کا عقد چندرگپت کے ساتھ کرنا پڑا۔ چندرگپت کے بلند دماغ ہونے کی یہ دلیل کیا کم ہے کہ بائیس برس کی قلیل مدت میں جو سکندر رومی اور سلوکس کے حملوں کا فصل ہے اس نے شمالی ہند کا نظام سیاسی ٹھیک کر لیا اور ایسی فوج تیار کر لی جس سے سلوکس کی یونانی فوج پیش نہ پا سکی۔

ہندی شہنشاہی کے حدود اربعہ

۳۔ یہ امر قابل غور ہے کہ پہلی ہندی سلطنت کے حدود قندہار اور ہرات تک پھیلے ہوئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان ہند کی خواہش جہاں ستانی ہندوستان کے عقلی و فطری حدود پر ختم ہوتی تھی جیسا کہ شاہان مغل اور موریہ کے عہدوں میں کابل اور قندہار کے سرحدی مورچے ہونے سے ثابت ہوتا ہے۔

چندرگپت کا تدبر اور سیاست

۴۔ خوش قسمتی سے چندرگپت کے عہد کی دو تصنیفیں موجود ہیں جن سے اس کے تدبر و سیاست کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک اس کے ہوشیار برہمن وزیر اور گرو کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔

ارتھاشاستر

یہ کتاب ارتھاشاستر کے نام سے موسوم ہے اس میں علم سیاست پر بحث کی گئی ہے اور اس عہد کے مروجہ حالات درج ہیں دوسری تصنیف یونانی سفیر میگاس تھینز کی ہے یہ سفیر عرصہ دراز تک پٹالی پتر میں مقیم رہا اس لیے جو کچھ اس نے لکھا ہے ذاتی مشاہدہ سے لکھا ہے ان دونوں کتابوں میں متفق الخیالی پائی جاتی ہے کہ ان سے چندرگپت کے عہد کے سیاسی حالات صاف صاف معلوم ہو جاتے ہیں اور تخیل پر زور دینا نہیں پڑتا۔ ان کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ چندرگپت ایک مستقل اور مرتب لشکر طیار رکھتا تھا فوج کو شاہی خزانہ سے ماہوار تنخواہیں تقسیم ہوتی تھیں فوج کے لیے ہتھیار بھی شاہی خزانے سے مہیا کیے جاتے تھے چندرگپت کے لشکر میں چھ لاکھ پیدل تیس ہزار سوار اور نو ہزار جنگی ہاتھی تھے۔

سو یہ نظارت حربیہ میں تیس رکن ہوتے تھے یہ تیسوں ارکان چھ چھ کی جماعتوں میں پیدل، سوار، رتھ (جنگی) ہاتھی بری اور بحری فوج کے پانچوں صیغوں کے ساز و سامان کی بہم رسانی کا انتظام کرتے تھے۔

سلطنت کا بطنی نظام

۵۔ سلطنت کا بطنی نظام اس نہج پر تھا کہ شخصی حکومت تھی بادشاہ اوتار سمجھا جاتا تھا مختلف صوبوں پر بادشاہ کے نائب حاکم ہوتے تھے صوبیداروں کی نگرانی جاسوسوں کے سپرد تھی اور جاسوسوں کا محکمہ اعلیٰ درجہ کا تھا شاہی خزانے سے نئی سڑکیں نکلوائی جاتی تھیں اور پرانی سڑکوں کی مرمت ہوتی تھی شاہی محاصل کا بڑا جزو غالباً اُس عہد میں بھی لگان ہی ہوگا تجارت کے مال کو محصول سے بچانے اور تاجروں کے دوسری قانونی خلاف ورزیوں کے لئے محکمہ علیحدہ تھا آبپاشی پر جیسا کہ ایک ہمدرد حکومت کا فرض ہے۔ چندر گپت کے عہد میں خاص توجہ کی گئی تھی آبپاشی کا محکمہ بالکل الگ تھا اور بادشاہ کو اُس سے خاص دلچسپی تھی کیونکہ کاٹھیاواڑ کے دور اُفتادہ علاقہ میں چندر گپت نے نہایت اہتمام سے رقم کثیر خرچ کر کے نہریں اور تالاب بنوائے تھے۔ یونانی سفیر میگاسس تھنیز تعجب کے ساتھ رقم طراز ہے کہ شاہی افسر مصریوں کی طرح نشیب و فراز کی پیمائش کر کے پانی کے بہاؤ کا اندازہ لگاتے ہیں تاکہ پانی متعدد نہروں میں بہے اور ہر شخص حصہ رسدی سے بہرہ اندوز ہو سکے۔

چندر گپت کے دارالامارت کا بلدی نظام

۶۔ چندر گپت کے دارالامارت کا بلدی نظام حیرت انگیز تھا نظارت حربیہ کی طرح دارالامارت کا بلدی نظام ایک مجلس کے سپرد تھا اس مجلس میں تیس رکن ہوتے تھے یہ ارکان چھ چھ آدمیوں کی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہوتے تھے اور ہر جماعت کے سپرد ایک خاص صیغہ بلدی نظام کا ہوتا تھا۔ شہر کی غیر معمولی وسعت اور آبادی نے از خود بلدی نظام کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ مجلس بلدی غیر ممالک والوں کی فہرست طیار رکھتی تھی اور اوزان و پیمانوں وغیرہ کی دیکھ بھال رکھتی تھی۔ اگر یہ صحیح ہو تو پاٹلی پتر کسی طرح شاہان فارس کے قدیم دارالسلطنت اصطخر (پرسی پولس) سے کسی طرح آن بان میں کم نہ ہوگا۔

چندر گپت کا حکومت سے دستکش ہونا | ۷۔ جن روایات کے مطابق ۲۹۸ ق۔م میں چندر گپت سلطنت سے دستکش ہو کر خانقاہ نشین ہو گیا اور اُس کا بیٹا بندو سار تاج و تخت کا مالک قرار پایا بندو سار نے یونانیوں سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے اُس کے دربار میں میگاس تھینز کے بجائے ۔ڈیمی ماکیو یونان کا سفیر تھا یونانی سفیر کے علاوہ شاہ مصر کا سفیر بھی اس فرماں روا کے دربار میں رہتا تھا کیونکہ چندر گپت کے بادشاہ ہوتے ہی ہندوستان دنیا کے بین الاقوامی سلسلے میں داخل ہو گیا تھا (پرانی دنیا کا یہ بین الاقوامی سلسلہ مصر سے آسام تک پھیلا ہوا تھا)

بندو سار | ۸۔ بندو سار کے عہد میں چندر گپت کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور دکن کا علاقہ مگدھ کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا اس بادشاہ کی سیاست داخلی کی شہادتیں موجود نہیں اور بجز اس کے ہم اُس کی تعریف میں کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے اپنے باپ کا نظام حکومت کامیابی کے ساتھ قائم رکھا بندو سار کی عظمت کے لئے اتنا بس ہے کہ وہ ایک جلیل القدر تاجدار کا نور نظر تھا اور ایک عظیم القدر بادشاہ کے باپ ہونے کا فخر اُسے حاصل تھا۔ بندو سار نے ۲۷۳ ق۔م میں وفات پائی اُس کے بعد اُس کا بیٹا پیا داسی تخت سلطنت پر متمکن ہوا جسے تاریخ اشوکھ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

اشوک | ۹۔ عنفوان شباب میں شاہ اشوکھ کو ولیعہدان سلطنت کی طرح ملکی و انتظامی مسائل طے کرنا پڑتے تھے کیونکہ باپ ہی کے زمانے میں وہ ٹیک سیلا اور اُجین کی صوبے داریوں کا عامل مقرر ہو چکا تھا یہ دونوں صوبے سلطنت مگدھ کے عظیم ترین صوبہ شمار کیے جاتے تھے شہنشاہ اشوکھ باپ کے تخت پر بغیر کسی مخالفت کے جلوہ افروز ہوا اور چالیس برس تک سلطنت مگدھ کا انتظام کروفر کے ساتھ کرتا رہا اس کے عہد کا پہلا قابل ذکر واقعہ ریاست کالنگا پر فوج کشی کرنے کی ہے یہ لڑائی غالباً خاندانی روایات کی تقلید میں حدود سلطنت کی توسیع کی غرض سے چھیڑی گئی تھی لیکن جنگ و جدال کے خونریز ہنگاموں کا اشوکھ کے نرم دل پر یہ اثر پڑا کہ اُس نے عہد کر لیا کہ آیندہ پھر وہ کبھی لشکر کشی نہیں کرے گا۔ شاید اسی نرم دلی نے اُسے بدھ مذہب

اصول کا پیرو بنا دیا اور انھیں خیالات کی وجہ سے ہم اس کے ایک جبلی کتبہ میں یہ فرمان دیکھتے ہیں (فرمان نمبر ۱۳) "انسان کی سب سے بڑی کامیابی وہ ہے جو زہد و تقوے سے حاصل ہو"

اشوک کے بدھ مذہب اختیار کرنے سے سلطنت پر اثر پڑا

۱۰۔ بادشاہ کے خیالات کی تبدیلی امور سلطنت میں بھی ظاہر ہونے لگی آج تک اس کے کتبے افغان پہاڑوں اور چٹانوں پر کھدے ہوئے ملتے ہیں ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوکھ کی زندگی تمام تر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں صرف ہوئی شاہ اشوکھ کے کتبوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہے ان میں چودہ جبلی کتبے ہیں جن میں اشوکھ کے اصولی سیاست کا ذکر ہے۔ آخر۔ آخر میں اسنے سات عمودی سے کتبے کھدوائے تھے جن میں کم و بیش اگلے کتبوں کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ ان تمام کتبوں میں ساتواں کتبہ بہت مشہور ہے ان میں وہ سب تدبیریں ایک ایک کر کے گنائی گئی ہیں جو شہنشاہ اشوکھ نے دھرم پھیلانے کے لیئے اختیار کیں۔ شہنشاہ اشوک کے کتبوں کی حیثیت فرامین سلطنت کی ہے جو مواعظ حسنہ سے لبریز ہیں۔

اشوک اور دوسرے بادشاہوں میں فرق

۱۱۔ اشوک کے عہد حکومت میں اور دوسرے بادشاہوں کے عہدوں میں بین فرق یہ ہے کہ اشوک کی فتوحات کالنگا کی مستثنیٰ مثال چھوڑ کر خالصاً صلح کل اور پرامن تھیں جن میں جنگ و جدال کا عنصر داخل نہ تھا بحیثیت بادشاہ کے اشوک اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا معیار زندگی بہت بلند تھا کیونکہ ایک کتبہ میں وہ کہتا ہے "مجھے کاروبار سلطنت کی انجام دہی اور عام بہبودی کی جدوجہد سے کبھی اطمینان نہیں ہوتا" وہ کہتا ہے کہ امیر و غریب سب کو ذاتی جدوجہد کرنا چاہیئے۔ فرامین کی زندہ مثال بادشاہ کی ذات ہمایوں صفات ہے۔ اس تاجدار کو اپنی قوم سے بڑی محبت تھی۔ کیونکہ کتبوں میں اکثر یہ فقرہ نظر آتا ہے کہ رعایا بمنزلہ میری اولاد کے ہے۔ اس کی ہمہ گیر محبت میدانوں کے متمدن باشندوں تک ختم نہ ہو جاتی تھی۔ بلکہ پہاڑوں کے وحشی قبایل کے لیئے اس نے اپنے افسروں کو خاص ہدایات دے رکھی تھیں۔ اس کا حکم تھا کہ شاہی فرمان تینوں موسموں کی ابتدا میں۔ بآواز بلند عام شاہراہوں پر

پڑھ کر سنائے جائیں۔ تاکہ جہلا بھی فائدہ اُٹھا سکیں۔

اشوک کی انتظامی قابلیت

۱۲۔ رفاہ عام کے لیئے شاہ اشوک نے متعدد شفاخانے تعمیر کروائے تھے۔ سڑکیں بنوائی تھیں۔ انتظامی امور میں وہ اپنے نامور جد کا ہم آہنگ تھا۔ اس کے عہد میں امن و امان ایک طرح سے قائم رہا۔ شاہ اشوک روشن ضمیر بادشاہ تھا اور تمام عمال سلطنت پر اس کی نظر رہتی تھی۔ کیونکہ انہی پر احکام شاہی کے نفاذ کا مدار تھا۔

اشوک نے متعدد وفود ممالک غیر میں بھیجے

۱۳۔ عہد اشوک کا خاص واقعہ یہ ہے کہ اس زریں عہد میں متعدد وفود ممالک غیر میں بھیجے گئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاہان موریہ کے تعلقات۔ خاندان سلوکس (شاہان شام) اور خاندان بطلیموس (مقوقان مصر) سے تھے۔ شہنشاہ اشوک نے جبلی کتبوں میں یہ ارادہ ظاہر کرنے کے بعد کہ وہ قانونی مسایل کی طرف زیادہ اعتبار نہیں کرے گا ان ممالک میں جن سے اس کے تعلقات دوستانہ تھے متعدد وفود روانہ کیئے تاکہ ان ممالک میں بدھ مشن اصول کی اشاعت و ترویج ہو۔ اس سے قبل محکوم ریاستوں اور سرحدی قبایل میں وفود بھیجے جا چکے تھے۔ لیکن اس سے اس کی پیاس کب بجھنے والی تھی۔ اب ایک وسیع تر میدان کی تلاش ہوئی۔ اور اس نے شریف جوشیلے بدھ مبلغین مصر۔ شام۔ (طرابلس) مقدونیہ اور ایاپیرس روانہ کیئے۔ ان وفود کی کامیابی کے بارے میں ۱ مشکل سے کچھ کہا جا سکتا ہے۔ گو سرندیپ کے وفد کو کامیابی ضرور ہوئی۔ اشوک نے اپنے حقیقی بھائی مہندر کو جس نے مذہبی فقیری اختیار کی تھی ایک عظیم الشان وفد کے ساتھ سرندیپ بھیجا تھا۔ اس وفد کی کوششوں سے سرندیپ کا راجہ تیا مع تمام درباریوں کے بدھ مذہب میں داخل ہو گیا۔ راجہ اور اعیان سلطنت کی تبدیلی مذہب نے پورے جزیرہ کو بدھ مذہب کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ سرندیپ کے وفد کی کامیابی کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشوک آریہ راجہ رام چندر سے زیادہ کامیاب رہا۔ کیونکہ رام چندر جی کی کامیابی محض جنگی کامیابی تھی۔

اشوک کے حدود سلطنت

۱۴۔ اشوک کے حدود سلطنت جنوبی ہند کے انتہائی سرے تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہم ان کا یقین صحت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ مغرب میں ہرات اور قندہار۔ مشرق میں آسام۔ سلطنت اشوک کے سرحدی صوبے تھے۔ کشمیر اور نیپال میں شہنشاہ اشوک کے صوبیدار متعین تھے۔ جنوب میں اس کی سرحد موجودہ ریاست میسور کی جنوبی سرحد پر جا کر ختم ہوتی تھی۔

اشوک کے عہد میں بدھ مذہب والوں کا جلسہ

۱۵۔ شہنشاہ اشوک نے اپنے آخر عہد میں بدھ مذہب والوں کا ایک بڑا جلسہ پٹالی پتر میں کیا تھا۔ تاکہ بدھ مذہب والوں کے باہمی اختلافات مٹ جائیں۔ سنہ ۲۳۲ ق۔م۔ میں اس جلیل القدر شہنشاہ نے وفات پائی۔ سیاست و تدبر میں شاہ اشوک جولیس سیزر اور شہنشاہ اکبر کے ہمدوش نظر آتا ہے۔ مذہبی و تبلیغی الوالعزمی میں وہ کنفوشش۔ پالوس اور جرجیس اعظم سے رتبہ میں کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا۔ میدان جنگ سے پرہیز کرنے اور کسی قسم کا ہتھیار استعمال کرنے کی قسم کھا لینے میں اس کی نظیر شاہانِ عالم میں نہیں مل سکتی۔ وہ ان معدودے چند بادشاہوں میں ہے جو عمر بھر انتہائی بےنفسی کے ساتھ قوم و ملک کی خدمت میں مستغرق رہے۔ بلاشبہ قدیم تاریخ ہند میں اشوک کا بزرگ ترین و شریف ترین نام ہے۔ اور دنیا کی عظیم الشان ہستیوں میں یہ ہندی تاجدار صف اول میں رہنے کے قابل ہے۔

اشوک کے بعد سلطنت موریہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی

۱۶۔ شہنشاہ اشوک کے بعد اس کے دو پوتوں نے سلطنت کو مشرقی و مغربی حصوں میں تقسیم کر لیا۔ ان میں سے ایک کا نام دسرتھ تھا اور دوسرے کا سمپرتی۔ اسی طرح پچاس برس تک سلطنت موریا زندگی کے دن پورے کرتی رہی یہاں تک آخری موریا تاجدار کو جس کا نام برہدرتھ تھا اس کے رئیس العسکر پشیا مترا نے قتل کر ڈالا پشیا مترا ہی دوسرے خاندان کی ابتدا ہوئی جو تاریخ میں خاندان سوریہ کے نام سے مشہور ہے۔ پشیا مترا کے عہد میں یونانی بادشاہ مینندر نے حملہ کیا جسے بدھ روایات میں ملیکا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ واسومتر نے جو پشیا مترا کا پوتا تھا یونانیوں کو سخت شکست دی۔ اس شکست نے یونانیوں کی

حوصلہ مندیوں کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ کردیا۔ خاندان سوریا تھوڑے ہی دنوں بعد خاندان کے بطنی نزاعات سے تباہ ہوگیا۔ شاہان کانوا اس خاندان کے جانشین ہوئے راجگان کانوا ۲۷ سنہ ق۔م۔ تک حکمراں رہے۔ پھر اندھرا خاندان نے اس خاندان کا ورق الٹ دیا۔

دولت موریہ کی سیاسی اہمیت

۱۷۔ اگرچہ چندرگپت اور اشوک کی سیاسی تعمیر ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں خاک میں مل گئی۔ لیکن شہنشاہی کا خیال سلطنت کے ساتھ مٹنے والا نہ تھا۔ دولت موریہ کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کے سایہ میں پہلی مرتبہ ہندوستان نے متحد ہو کر سیاسی زندگی کا ثبوت دیا۔ آنے والی صدیوں میں شہنشاہی کے دور بلندی تاریخ میں بار بار آتے رہے۔ تقریباً ہر صدی میں کسی نہ کسی خاندان نے کوشش ضرور کی کہ کوہ ہمالیہ سے لے کر راس کمورن تک ایک ہی پرچم کے زیر سایہ کرلے۔ گو شہنشاہی کا تخیل اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے قبل از وقت ضرور تھا۔ لیکن ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ یہ خیال سلطنت موریہ کے اولوالعزم فرمانرواؤں نے بلندی تہذیب میں پیدا کیا تھا۔ اس حیثیت سے چندرگپت۔ بندوسار۔ اشوک نہ صرف سمدرگپت اور ہارشا وردسن ہی کے اسلاف ہیں بلکہ بابر۔ اکبر اور اورنگ زیب کے بھی ہیں۔

دوسرا باب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر ہندوستان کی اجتماعی و معاشرتی حالت کیا تھی

عہد موریہ اور قرون مابعد کی سب سے بڑی خصوصیت

۱- عہد موریا اور قرن مابعد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں نمایاں انقلاب پیدا ہوا اگرچہ سکندر اعظم کی آمد تک برہمنوں کے رسوخ میں فرق نہ آیا تھا۔ لیکن شہنشاہ اشوک کے مذہبی تبلیغی جوش نے ایک غیر معروف فرقہ کو عالمگیر مذہب میں تبدیل کر دیا تھا۔ گو بدھ مذہب ہندو مذہب کی اصلاح شدہ اور ترقی یافتہ صورت تھی۔ باایں ہمہ اس کی ترویج سے جو اجتماعی انقلاب ملک میں ایک سرے سے دوسرے تک پھیل گیا وہ معمولی نہ تھا۔ ہندو مذہب میں قربانیاں بکثرت تھیں جن کی ادائیگی بغیر برہمنوں کے ناممکن تھی۔ کیونکہ یہی گروہ مذہبی باریکیوں کا جاننے والا سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہندو مذہب کی خصوصیات گوتم بدھ سے کہیں پہلے پیدا ہو چکی تھیں دراصل ہندو مذہب کا بدترین پہلو یہ تھا کہ اس میں ادنیٰ طبقہ کی مادی و روحانی فلاح کا مطلق خیال نہ رکھا گیا تھا۔ یہی حالت اب تک چلی آتی ہے۔ بدھ مذہب کے رواج نے ادنیٰ طبقوں میں تمدن کی روح پھونک دی جس کی وجہ سے بدھ مذہب ایک جمہوری اور ہردلعزیز تحریک بن گیا۔ جس میں ادنیٰ و اعلیٰ بلا تفریق ذات دوش بدوش تھے۔ اگلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پیاداسی وحشی قبائل میں گوتم بدھ کا پیغام پھیلانے کا اسی قدر مشتاق تھا جس قدر میدانوں کے متمدن باشندوں میں۔ بدھ مذہب کے عروج کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس مذہب کی تبلیغ عام رائج الوقت زبان میں کی گئی۔ چنانچہ اسی زمانہ سے پالی اور پراکرت مہذب زبانیں سمجھی جانے لگیں۔

بدھ خانقاہیں تعلیمگاہیں بن گئیں

۲- بدھ مذہب کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس مذہب میں پیروان کا گروہ

شامل تھے۔ ایک عام لوگوں کا دوسرا خانقاہ نشین راہبوں کا۔ راہبوں میں مرد اور عورتوں کی تفریق نہ تھی۔ شاہان موریہ کے عہد میں نیکدل بادشاہوں اور امیروں نے ملک میں بکثرت خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ یہ خانقاہیں رفتہ رفتہ تعلیم گاہیں بن گئیں۔ جن سے ہندوستان کو پہلی مرتبہ تعلیمی بیداری کا سبق حاصل ہوا سنگھا آشرم میں راہب امرا و غربا کو مساوی طور پر ان انوار حقیقت کی تعلیم دیتے تھے جو ساکیا شاہزادہ پر کئی صدی پیشتر منکشف ہو چکی تھی۔ شاہ اشوک کے عہد میں دور اٹک خانقاہوں کا سلسلہ قائم تھا۔ سات سو برس تک خانقاہوں کے بے نفس خادمین نے ایسی جد و جہد کی کہ ہندوستان کے مدارس اور جامع ایشیا میں مشہور ہوگئے اور تحصیل علم کے دلدادہ پرانی دنیا کے ہر گوشہ سے جوق در جوق ہندوستان کا دور و دراز سفر طے کرنے لگے۔

۳۔ بدھ مذہب نے صنف ضعیف کا پایہ بھی بہت بلند کر دیا تھا۔ (بدھ مذہب نے طبقۂ اناث کا پایہ بلند کر دیا) جس کی وجہ سے دیرالراہبات کا عام رواج ہو گیا جن میں شریف گھرانوں کی عفت مآب خواتین فقر و ریاضت کی قسم کھا کر داخل ہوتی تھیں۔ راہبات کے زمرہ میں شہنشاہ اشوک کی بیٹی بھی شامل تھی۔ جسے جزیرہ سرندیپ میں بدھ مذہب پھیلانے کے صلہ میں سنگھا مترا (سنگھا کی دوست) کا کبھی نہ مٹنے والا لقب عطا ہوا تھا اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ویدک دور میں یا اس کے بعد عورتوں کا رتبہ ہندو مذہب میں نیچا نہ تھا تاہم بدھ مذہب نے طبقۂ نسواں کو ہندو مذہب سے کہیں زیادہ آزادی بخشی اور ان کا پایہ اتنا بلند کر دیا کہ وہ فلسفیانہ اور اجتماعی کاموں میں نمایاں حصہ لینے لگیں۔

۴۔ بدھ مذہب کے عروج سے ہندو مذہب کا عالمگیر اثر فنا ہونا (بدھ مذہب کے عروج سے ہندو مذہب پر کیا اثر پڑا) شہنشاہ اشوک باوجود مذہباً بدھ ہونے کے ہمیشہ برہمنوں کی قدر و منزلت کرتا تھا اور انھیں بیش بہا عطیوں سے سرفراز کرتا رہتا تھا۔ اس نیکدل بادشاہ کو گو بدھ مذہب سے بیحد محبت تھی لیکن اس نے قدیم مذہب میں کسی طرح کی دراندازی

نہیں کی۔ موریا سلطنت کے تباہ ہوتے ہی ہندو مذہب کی تجدید ہونے لگی۔ کیونکہ موریا۔ کانوا اور اندہرا خاندان جو یکے بعد دیگرے سلطنت موریا کے جانشین ہوئے مذہباً ہندو تھے۔ کانو ابرہمن خاندان تھا۔ پشیامترا نے اسوامیدہ (گھوڑے کو قربان) کرنے کی قدیم رسم ادا کی تھا یہ راجہ ہندو مذہب کا حامی تھا۔ اسی کے عہد سے ہندو مذہب کی وہ تحریک شروع ہوئی جس نے بارہ سو برس کے طویل عرصہ میں بُدھ مذہب والوں کو پھر ہندو مذہب کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ ہندو مذہب کے ساتھ سنسکرت بھی از سر نو زندہ ہوئی۔ تین سو برس پہلے پنی اشٹادمیا تصنیف کر چکا تھا۔ اشٹاڈھیا سنسکرت کی سب سے بڑی قواعد ہے اور اسی کی بدولت سنسکرت کو علمی زبان بننے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ پتان جلی سنسکرت کا مشہور قواعد داں جس نے پنی کی شرح لکھی ہے پشیامترا کا ہمعصر تھا۔

عہد موریہ کا تمدن| موریہ عہد کے تمدن کی شہادتیں یونانی سفرا کی تصنیفوں اور نیز کینیا کے ارتھا ساشتر میں بکثرت موجود ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمدنی حالت پرانی دنیا کی متمدن قوموں سے کسی طرح گھٹ کر نہ تھی یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں متمدن اقوام جزیرہ صقلیہ سے چین کے شہر پیکین تک پھیلی ہوئی تھیں اور یونانی تہذیب کا اثر ہندوستان کے حدود تک پہونچ چکا تھا روم اور مصر حامل تہذیب کے سرچشمہ تھے ۲۲۱ء ق م۔ میں چین کے پہلے شہنشاہ نے اس ملک کو متحد کر دیا تھا ۲۰۶ء ق۔ م سے خاندان ہان کی شاندار حکومت کا آغاز ہوا یہ خاندان چار سو برس تک چین پر حکمراں رہا۔ ہندوستان اس بین الاقوامی جماعت کا رکن تھا پٹالی پتر کی مجلس بلدی میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک صیغہ غیر ملک والوں کے اعداد و شمار رکھنے کے لیئے مخصوص تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک غیر سے آمد و رفت بکثرت تھی اور تعلقات بہت زیادہ تھے اگرچہ اُس زمانہ میں باربرداری اور درازی مسافت کی دقتیں

ایسی تھیں کہ چین لا قوامی تعلقات سے کوئی بڑی تحریک دوسرے ملکوں میں پھیلائی نہیں جا سکتی تھی لیکن باوجود اِن مشکلات کے اور کوہ ہمالیہ کی دشوارگزار حدِ فاصل کے بدھ مذہب جس کی نشو و نما ہندوستان میں ہوئی تھی چین کے دور اُفتادہ ملک میں سرعت کے ساتھ عہد موریہ ہی میں پھیل گیا تھا۔

پٹالی پتر بابل ہمدان اور نینوا سے کم نہ تھا

۲۔ سلطنت موریہ کا دارالامارت پٹالی پتر۔ تجارت۔ نظم و نسق۔ کی خوبی اور شان و شوکت میں بابل ہمدان اور نینوا سے کم نہ تھا۔ دریائے گنگا اور سون کے سنگم پر یہ شہر آباد تھا شاہانِ موریہ کے درباروں کی عظمت و جلالت شہنشاہانِ مغل کے درباروں کی ہم پلہ تھی پری چہرہ خواصوں کے جھرمٹ میں بادشاہ کی سواری نکلا کرتی تھی یہ خواصیں غالباً باختر اور یونان سے آتی ہوں گی اگنی متر کے دربار کی حشمت کا ذکر کالیداس نے ایک ناٹک میں کیا ہے۔ کالیداس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس راجہ کا دربار صحیح المذاقی اور اعلیٰ تہذیب سے مزین تھا۔ اگرچہ اور درباروں کی طرح اس دربار میں بھی سازشیں ہوتی تھیں۔ لیکن ادبا اور فنونِ لطیفہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ درباریوں کی دلچسپی کے لیے گوٹے کہانیاں اور ناٹک وغیرہ نہیں لکھے جاتے تھے ان کے لکھنے سے محض درباریوں کی اخلاقی اصلاح مقصود ہوتی تھی کنلیا نے ارتھاشاستر میں جو اُصول سیاست بیان کیے ہیں وہ مٹیاولی کے اُصول سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں ارتھاشاستر کا مصنف اِن اُصول کے موجد ہونیکا دعوی نہیں کرتا وہ ایسی باتیں لکھتا ہے جو راجگانِ سلف برت چکے تھے اس دعوے کے ثبوت میں متعدد شہادتیں ارتھاشاستر میں پیش کی گئی ہیں جو بدقسمتی سے ہم تک نہیں پہونچ سکیں۔ اِس قدیم زمانہ میں حکومت کی بنیاد جاسوسوں پر تھی حکومت کو خوفناک سازشوں کے بے رحمی سے فرو کرنے میں پس و پیش نہ ہوتا تھا اشوک کے عہد کو مستثنیٰ کر کے حکومت کا کوئی خاص سیاسی منشا بجز حاکم کے خودنمائی اور غنیموں کی تسخیر

سے کے نہ ہوتا تھا۔

شمالی ہند کے مشہور شہر

۷۔ دارالامارت کے علاوہ اور بہت سے شہر شمالی ہند میں تھے جن میں ٹیکسلا اُجین۔ ممڑا پٹنی - بنارس۔ متھرا اور سانچی زیادہ مشہور تھے یہ بڑے بڑے تجارتی شہر تھے اور ان کی آبادی بھی خاص تھی سری نگر کشمیر کے علاقہ میں شاہ اشوک نے طرب گاہ کے طور پر آباد کیا تھا پٹالی پتر کے تفصیلی بیان کے بعد ان شہروں کی عظمت کا ذکر طوالت سے خالی نہ ہوگا یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شہر کم و بیش دارالامارت ہی کی وضع پر ہوں گے اور ان میں بھی غالباً مجالس بلدی قائم ہونگی۔ اس دور کی طرز عمارت پر ہم تحقیق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی یادگار سانچی کے پھاٹک کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہی سانچی کے باقی آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندی فن تعمیر حد کمال کو پہونچ چکا تھا موریہ عہد تک زیادہ تر مکانات لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔ ایم۔ فاؤشر کی تحقیق کے مطابق تیسری صدی قبل مسیح سے لکڑی کے بجائے پتھر استعمال ہونے لگا بتدریج اور بھارت کی سنگی جالیاں اسی قرن کی یادگار ہیں ساتا کرمی اور سوریہ خاندان کے حوالے اس کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ جالیاں دوسری صدی۔ق۔م۔ میں بنائی گئی ہوں گی اس میں شبہ نہیں کہ شاہان موریہ کو فن تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی شہنشاہ اشوک نے بہت سے خوبصورت محل تعمیر کروائے تھے اور اگر وہ محلات نہ بنواتا تب بھی اُس کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے وہ عمودی کتبے کافی تھے جو ہندوستان کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں فن تعمیر کے علاوہ دوسرے فنون جنھیں سنسکرت میں کلائیں کہتے ہیں کمال کو پہونچ چکے تھے منجملہ اُن کے رقص کی تعلیم شاہی محلوں میں دی جاتی تھی جیسا کہ کالیداس کی مالاوی کاگنی متر سے معلوم ہوتا ہے۔ موسیقی اور مصوری عام طور سے پسند کی جاتی تھیں؛ یونانی سفیر کا بیان ہے کہ چندر گپت کے محل کے مذہب ستون سنہری بنت کاری روپہلی چڑیوں سے مزین تھے علم موسیقی ہندوستان کا نہایت قدیم فن ہے اور عہد موریہ سے بہت پہلے ہندوستان اس فن میں کامل ہو چکا تھا۔

ہندی زندگی سیاسیات سے کم متاثر ہوتی ہے

۸۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہندوستان کی حقیقی زندگی سیاسی انقلابات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ زراعت جس طرح عام بسراوقات کا ذریعہ ابھی تک بنی ہوئی ہے۔ اُس زمانے میں بھی اسی پر عام زندگی کا مدار تھا۔ زراعت کے ساتھ ساتھ دوسرے پیشے اور دستکاریاں بھی رائج تھیں۔ شاہانہ لباسوں میں عمدہ سے عمدہ ململ استعمال ہوتا تھا۔ نہایت قدیم زمانہ سے ہندوستان بیش قیمت کپڑوں کے لیئے مشہور ہے۔ کپڑوں کے علاوہ مٹی کے برتنوں کا کام۔ سونے اور چاندی کا طرح طرح کا کام۔ اور دوسری دستکاریاں شاہان موریہ کے عہد میں فروغ پر تھیں۔ ہر پیشہ کے لحاظ سے پیشہ وروں کی جماعتیں علیحدہ علیحدہ قائم کی گئی تھیں۔ جماعت کے افراد پر جماعت کا پورا قابو ہوتا تھا۔ پیشہ وروں کی جماعتیں شاہان موریہ سے پہلے قائم ہو چکی ہونگی کیونکہ ارتھاشاستر میں ان کا ذکر جابجا پایا جاتا ہے۔ ان جماعتوں کے داخلی نزاعات کا فیصلہ پنچایت کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔

ہندی تمدن

۹۔ یہ امر مسلّم ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت کے وقت ہندوستان تمدن کے اعلیٰ مدارج طے کر چکا تھا۔ یہ تمدن عرصہ دراز کی تدریجی نشوونما اور فطری ارتقار کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی فارس میں اور باختر کے یونانی حکومت کے اثر سے شہنشاہی کے درجہ پر پہونچ چکی تھی اور اجتماعی زندگی نہایت گھرے اور شریف تمدن کا پرتو تھی۔ آیندہ دو سو برس تک یہ فطری ترقی سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے رُکی رہی۔ جس کا ذکر ہم دوسرے باب میں کریں گے۔

اقطاب انگورہ

شہید حریت احمد جمال پاشا

ترکانِ انگورہ کو آج استقلال و حریت کے جو حیات افروز لمحات نصیب ہوئے ہیں اور مقامِ العلیٰ خلافت کے حفظ و استقلال کی جو افتخار اندوز ساعت عالمِ اسلام کو میسر آئی ہے وہ ہز اکسلنسی امیر البحر مارشل جمال پاشا لفٹننٹ گورنر شام کی بہت زیادہ مرہونِ منت ہے، ممدوح نہ صرف حکومت انگورہ کے موسسین میں ایک ممتاز مرتبہ لیڈر تھے بلکہ آپکی آخری خدمات نے اناطولیہ و ترکستان سے لے کر تاشقند و افغانستان اور شمالی ہندوستان کو جس بیدار کن طریق پر متاثر کیا اُس سے اسلامی تاریخ کے صفحات ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے ترکی قوم کا یہ جلیل القدر سپاہی انگورہ گورنمنٹ سے وہی تعلق رکھتا تھا جو خود بانیٔ انگورہ گورنمنٹ شوکت پناہ مصطفیٰ کمال پاشا کو حاصل ہے، وہ ابتدائی اسکیم جو آخر ۱۹۱۸ء میں مقام "حلب" انگورہ گورنمنٹ کی تاسیس کے لیے طیار ہوئی تھی احمد جمال پاشا کے قیمتی مشورے سے مزین تھی، اور یہ امرِ واقع ہے کہ قہرمانِ ترکی مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کو حلب سے اناطولیہ جانے کے لیے احمد جمال پاشا نے جو سہولتیں بہم پہونچائیں یہ اُنھیں کا نتیجہ تھا کہ کمال ممدوح اناطولیہ میں "تحریکِ انگورہ" کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گئے۔

احمد جمال پاشا کا وطن "مدلّہ" اور سال پیدائش ۱۸۷۲ء ہے آپ ترکی، فارسی، عربی، اور روسی، زبانوں کے ماہر اور زبردست قانون داں تھے آپ فوجی تعلیم سے فارغ ہو کر ترکی سپاہ میں داخل ہوئے کچھ عرصہ بعد آپ کو ترکی گورنمنٹ نے "اسکواز" کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا، پھر آپ "ارنہ" کے حاکم مقرر ہوئے پھر "بغداد" کے لفٹننٹ گورنر مقرر ہو کر تھوڑے عرصہ بعد قسطنطنیہ کے ڈپٹی مقرر ہوئے، اس مسلمہ اعتبار سے کہ ترکی لیڈر جامع کمالات ہوتے ہیں احمد جمال پاشا ڈپٹی کے عہدہ سے پھر فوجی لائن میں

بدل دیئے گئے اور آپ پہلی ترکی اسکواڈرن کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، احمد جمال پاشا مشہور حکمران ترکی جماعت "انجمن اتحاد و ترقی" کے اُن مخصوص بلند مرتبہ ارکان میں تھے جو انجمن کی جان کہے جاتے ہیں ممدوح الصدر انجمن اتحاد و ترقی کے سیکرٹری اور پریسیڈنٹ بھی رہ چکے تھے، حضرت جمال پاشا کی یہ اُن خدمات کا نہایت ہی مختصر اجمال ہے جو جنگ یورپ سے پہلے آپ نے انجام دیں، اور جن کی شرح ایک طویل داستان ہے۔

۱۹۱۵ء ترکی قوم کے ابتلا و آزمائش، آلام و مصائب کا نہایت صبر آزما سال تھا جبکہ ترکی حکومت جنگ فرنگ کے نازک ترین دور سے گزر رہی تھی، روسی محاذ کی حوصلہ شکن مصروفیت کے باوجود ترکی مقبوضات عراق کی حفاظت و میانت اور ولایت شام و فلسطین کا تحفظ ایک عقل سوز مہم تھی جہاں اندرون ملک جاہل عربوں بدوؤں کردوں اور متفرق قبائل کو ترکی گورنمنٹ کا وفادار رکھنا اور محاذ جنگ پر فوجوں کی ترتیب و ترسیل وغیرہ مہمات مسائل تھے جن کی رُوبراہی ایک فاضل و پختہ کار جنگی و سیاسی لیڈر ہی کر سکتا تھا، چونکہ ترکی گورنمنٹ جمال پاشا ممدوح کی سیاسی و جنگی بلند پائیگی سے اچھی طرح واقف تھی اس لیئے آپ کو شام و فلسطین کی ترکی سپاہ کا کمانڈر انچیف بنایا گیا اور جمال پاشا دمشق میں آگئے، آپ نے نہر سویز عبور کرنے کے لیئے جو جد و جہد فرمائی وہ مہمات جنگ کی ایک لاجواب نظیر ہے، جمال پاشا ممدوح نے باوجود ریلوے لائن اور ریلوے ذرائع کے فقدان کے ترکی سپاہ اور ترکی محاذوں کا جو انتظام فرمایا اُس کی تفصیل جمال پاشا کی جنگی مہارت کا حیرت انگیز کارنامہ ہے، شام و فلسطین اور عراق کے متعلق خود جمال پاشا مرحوم نے "تذکرہ" کے نام سے ایک جامع "تاریخ" لکھی ہے اور جس کا اُردو ترجمہ شاید ہندوستان میں شائع ہو گیا ہے اور جس کے چند حصے مصر کے مشہور عربی رسالہ "الھلال" نے شائع کیئے

ہیں ان کے دیکھنے سے جمال پاشا کی خداداد فراست و جنگی تدبر کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے جہاں ممدوح نے باوجود گوناگوں مشکلات کے "انتظام و انصرام" اور سیاست و مآل اندیشی کے حکمت اندوز نمونے پیش کیے ہیں، یہ جمال پاشا ہی کی مقتدر اور سیاست شناس ہستی تھی جس نے باغی عربوں سے ترکی حکومت کے مفاد کو عرصہ تک محفوظ رکھا، آپ نے "عربی بغاوت" کی روک تھام میں جن مساعی اور ذرائع سے کام لیا وہ "مجلۂ الہلال مصری" یا آپ کے خود نوشت "تذکرہ" ہی کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، یہ آپ ہی کا تدبر پناہ اور حقیقت آگاہ دماغ تھا جس نے عربی ہیجان کو قبل از وقت محسوس فرما کر ترکی فوجوں کو صحیح سالم روسی محاذ پر منتقل کرنے اور سرکاری قیمتی اشیاء کو قسطنطنیہ پہونچانے کی تدابیر اختیار کیں۔

مذکورہ حالات کے بعد ترکی حکومت کا وہ پُرآشوب دور شروع ہوا جس نے کئی صدی کے بعد ترکی قومیت کو تباہ کن مصائب کے عمیق گڑھے میں ڈال دیا، ترکی فوجوں کے ہتھیار ڈالتے ہی ملک میں عام ہیجان و برہمی کے مہلک اثرات پھیل گئے۔ التوائے جنگ کی درخواست پیش ہوتے ہی ترکی کے ممتاز مرتبہ لیڈروں نے وطن عزیز کو خیرباد کہنا شروع کر دیا، حضور دانش پناہ احمد جمال پاشا عین اس دن (۱۰ اگست ۱۹۱۸ء) جبکہ معاہدۂ التوائے جنگ پر دستخط ہوئے ایک جرمن جہاز پر مع اہل و عیال قسطنطنیہ سے بندرگاہ "سباسٹپول" چلے گئے اور یہاں چندے قیام کے بعد آپ "برلن" جا پہونچے، جب قسطنطنیہ پر اتحادی غلبہ مستحکم ہو گیا تو اتحادیوں نے قسطنطنیہ کی نام نہاد ترکی گورنمنٹ کی وساطت سے "انجمن اتحاد و ترقی" کے سربرآوردہ ارکان کو گرفتار کرانا چاہا، اور اس سلسلہ میں احمد رفعت پاشا ترکی سفیر مقیم برلن نے جرمن گورنمنٹ سے جمال پاشا کی حوالگی کی درخواست کی، چونکہ جرمن گورنمنٹ ارکان اتحاد و ترقی کی طرفدار تھی اس نے فوراً جمال پاشا کو جرمنی حدود چھوڑ دینے کا ایما کیا اور اس طرح جمال پاشا کو اتحادیوں کے ہاتھ پڑنے سے بچا لیا، حضور جمال پاشا جرمنی سے "سوئٹزرلینڈ" چلے گئے جہاں

آپ نے قصبہ "کوس ترس" میں مستقل اقامت اختیار فرمائی، قصبہ کوس ترس" میں آپ نے اپنا نام "خالد بے" رکھ لیا اور ایک بخشر کی حیثیت اختیار فرما کر رہنے لگے، قصبہ کوس ترس واقع سوئٹیزرلینڈ" میں آپ کامل آٹھ ماہ مقیم رہے، اور اسی اقامت کے دوران میں آپ نے اپنی یادداشتیں مرتب کیں، یہ وہ معرکۃ الآرا سیاسی یادداشتیں ہیں، جن کا مجموعہ یورپ کی تمام زبانوں میں شائع ہو چکا ہے، غرض جب جرمنی میں امن وامان قائم ہو گیا تو آپ سوئٹیزرلینڈ سے "فوننگ" میں تشریف لے آئے اور مستقل قیام اختیار فرما لیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اناطولیہ میں سالار ملت دین پناہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی تحریک کا آغاز ہوا، جس کی طرف مشرق کی نگاہیں اٹھنے لگیں، اور تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ اناطولی ویرانوں کی یہ ضعیف تحریک ایک دن سارے مشرق کو بیدار کردے گی لہذا ناممکن تھا کہ جمال پاشا ایسا عظیم الشان مدبر اس وقت خاموش بیٹھا رہتا، آپ فوراً جرمنی سے روس تشریف لے گئے، مخالفین تو آج تک یہی کہتے ہیں کہ "انور و جمال کو" انگورہ تحریک" سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن جو لوگ ترکوں کی قوم پرست طینت اور "وحدت خیال" سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انور وطلعت، اور خلیل و جمال نے "انگورہ تحریک" کو کامیاب بنانے کے لئے کیسی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں؟

مارشل جمال پاشا جب ماسکو پہونچے تو آپ نے کوشش کی کہ کسی طرح انگورہ اور ماسکو گورنمنٹ میں اتحاد عمل پیدا ہو جائے اور مشرق کی یہ دونوں طاقتیں متحد ہو کر دشمنوں کے مقابل آجائیں، چنانچہ آپ ابھی ماسکو میں سرگرم عمل ہی تھے کہ انگورہ گورنمنٹ کے ذی مرتبہ نمائندہ ڈاکٹر بکر سامی بے ماسکو پہونچے ڈاکٹر بکر سامی اور جمال پاشا کی متفقہ کوششوں سے انگورہ و ماسکو گورنمنٹ میں ایک معاہدہ اتحاد ہو گیا، ڈاکٹر صاحب تو انگورہ واپس آ گئے لیکن جمال پاشا روس ہی میں رہے جہاں آپ نے وسطی ایشیا کو بیدار و آزاد کرانے کے لئے ایک زبردست لائحہ عمل تیار کیا، یہ وہ وقت ہے جبکہ ماسکو گورنمنٹ انگریزوں کے خلاف اپنے اثرات کی اشاعت چاہتی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ ترکستان سے نکل کر بخارا و

افغانستان تک بالشویک اثرات وسعت پذیر ہو جائیں، تاکہ کسی مناسب موقع پر وہ ہندوستان پر ایک کامیاب ضرب لگانے کے قابل ہو سکے، ادھر ترکی لیڈر بھی چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو انگریزی مفاد کو نقصان پہونچایا جائے لہذا ماسکو میں جمال پاشا کو ان خدمات کا بہترین ذریعہ تصور کیا گیا اور آپ کو ماسکو کے محکمہ خارجہ میں "معاملات شرقیہ" کا چیف ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، خیال تھا کہ جمال پاشا بالشویک گورنمنٹ کی خیر سگالی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے لیکن جمال پاشا کے پیش نظر ایک وہی اسکیم تھی اور آپ چاہتے تھے کہ وسط ایشیا میں مسلمانوں کی متعدد و متفرق جماعتوں اور ریاستوں کا ایک زبردست "جامعہ" بنا دیا جائے، جس کا مرکز "تاشقند" ہو، لہذا اس خیال سے آپ نے "تاشقند" میں اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر کر کے عملی کام شروع کر دیا، گو بظاہر کچھ عرصہ تک آپ یہاں بالشویک مقاصد کو تقویت پہونچاتے رہے لیکن یہ صرف اس لیئے کہ آپ کو بالشویک ذرائع سے اسلامی مصالح کو اتوا کرنا تھا، تاشقند میں جمال پاشا کے ساتھ ترکی جنرلوں اور ترکی لیڈروں کی ایک طاقتور جماعت تھی جس کے ذریعہ انگورہ تحریک کو فروغ دیا جاتا تھا، البتہ ابتدا میں اس تحریک پر بالشویک رنگ چڑھایا گیا تھا، جب جمال پاشا نے انگورہ تحریک کو فروغ دینا شروع کیا تو بالشویک گورنمنٹ جمال پاشا سے بدظن ہو گئی اور آپ کو دوبارہ ماسکو طلب کیا گیا، اس طلبی کے موقع پر آپ کو بالشویک سفیر "ایم سوریٹز" سے ملایا گیا جو اصل میں جمال پاشا کا نگراں تھا، اور اسی موقع پر آپ کے عملہ تبلیغ میں مشہور انقلابی علامہ برکت اللہ بھوپالی کا بھی اضافہ کیا گیا علامہ برکت اللہ بھوپالی کی شرکت سے جمال مشین میں زبردست اضافہ ہو گیا کیونکہ ممدوحین میں "تحریک اتحاد اسلامی" کے خیالات یکساں موجود تھے، اور دونوں پان اسلام ازم کے زبردست مؤید تھے، علامہ برکت اللہ بھوپالی ایک راسخ العقیدہ اور متبحر ہندی عالم ہونے کے ساتھ ہی نہایت معروف انقلابی ہیں، جب سے آپ نے ہندوستان کو خیرباد کہا ہے آپ "تبلیغ اسلام" اور "تحریک پان اسلام ازم" کے سرگرم کارکن رہے ہیں، ممالک مغربی خصوصا

چین و جاپان میں علامہ برکت اللہ بھوپالی نے اسلام و اسلامیت کی تبلیغ و اشاعت میں
میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ سیاسی نقطۂ نظر سے علامہ جمال الدین افغانی کے متبع
ہیں، وہ ۱۹۰۹ء میں جاپان ٹوکیو یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے پروفیسر اور اخبار
"اخوۃ اسلام" کے چیف ایڈیٹر و مالک تھے تو انھوں نے افغانی قوم کو اسلامی مرکزیت
میں جذب ہونے کے لیے "سراج الاخبار کابل" کے ذریعہ پرجوش دعوت دی تھی، وہ ۱۹۱۵ء میں
برلن کے محکمہ شرقی میں ہندی قیدیوں کو انقلابی خیالات کی تعلیم دیتے تھے اور پھر ایک طاقتور
جرمن مشن لے کر وہ افغانستان گئے تھے، غرض اب جمال پاشا اور علامہ برکت اللہ بھوپالی
کا اتحاد عمل بخارا اور افغانی قوم کی بیداری کا ایک مبارک ذریعہ تھا، جمال پاشا نے تاشقند
و بخارا میں ایک تبلیغی مدرسہ قائم کیا جس کے ذریعہ بالشویک پروپیگنڈا کیا جاتا تھا اور اس
تمام پروپیگنڈا کے مصارف بالشویک گورنمنٹ برداشت کرتی تھی، یہ وہ وقت ہے جبکہ جمال پاشا
کے متعلق نہایت غلط اور مبالغہ آمیز خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں؛ تھوڑے عرصہ بعد
یعنی اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں وہ افغانی حدود میں داخل ہوئے چونکہ افغانی قوم اور تاجدار
افغانستان آپ کی بلند مرتبہ شخصیت سے پہلے ہی واقف تھے اس لیے آپ کا نہایت
شاندار استقبال کیا گیا، اس میں شک نہیں کہ آپ افغانستان میں بالشویک ذرائع سے
داخل ہوئے تھے لیکن چند ماہ بعد ہی تاجدار افغانستان نے آپ کی خدمات کو افغان گورنمنٹ
کے لیے حاصل کر لیا، اور آپ کو افغانی کیبنٹ میں "وزیر جنگ" کا عہدہ سپرد کیا گیا، اس وقت
افغانی فوجیں نہ تو جدید قواعد و ضوابط سے واقف تھیں اور نہ اُن کے پاس جدید قسم کے
آلات حرب تھے لیکن جمال پاشا نے اپنی ممتاز جنگی مہارت کے ذریعہ اس کمی کو بہت جلد پورا
کر دیا، اور تمام افغانی فوجوں کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ آراستہ کر دیا، آپ نے اس عرصہ
میں سرحدی قبائل کی اصلاح میں بھی نمایاں اصلاحات فرمائیں اور بعض تجربہ کار ترکی جنرلوں
کو ان کا نگراں مقرر کر کے انہیں افغانستان کی مرکزی فوجوں سے متعلق کر دیا، جس وقت

جمال پاشا قبائل کی اصلاح میں سرگرم تھے اُن کے خلاف ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا جارہا تھا اور سرحدی علاقہ میں ہر وقت ایک نئی جنگ کا خطرہ محسوس کیا جاتا تھا حضرت محترم جمال پاشا نے ترکستان و تاشقند، اور افغانستان و شمالی ہند تک جن اسلامی مصالح کو تقویت بہم پہونچائی اُن کی تفصیل سے چونکہ اخبار بیں طبقہ اچھی طرح واقف ہے اس لیئے اب صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ آپ نسط ۱۹۲۲ء میں افغان گورنمنٹ کے لیئے جدید اسلحہ اور سامان حرب و ضرب خریدنے کے لیئے جرمنی و فرانس تشریف لے گئے، جہاں سے وہ انگورہ اور اپنے وطن عزیز تشریف لے جانے والے تھے، اُس وقت آپ کے اہل و عیال "طفلس" میں تھے، جب آپ جولائی ۱۹۲۲ء میں "طفلس" پہونچے اور ایک دن بازار میں اپنے جنگی اڈی کانگ ثریا بے، اور نصرت بے، کے ساتھ "جو فکروسکی اسٹریٹ" کے گوشے پر پہونچے تو یکایک آپ پر گولی چلائی گئی اور جمال پاشا تین گولیاں کھا کر گر پڑے اسی طرح نصرت بے پر پانچ گولیاں چلائی گئیں اور وہ بھی گر پڑے، ثریا بے، یہ دیکھ کر فرار ہونا چاہتے تھے کہ "سولولاک اسٹریٹ" پر پہونچتے ہی اُن پر حملہ کیا گیا اور اس طرح اسلام و اسلامیت اور ملت غرّا کے یہ تابان و درخشندہ تارے طفلس میں ہمیشہ کے لیئے ڈوب گئے۔ انا للہ الخ

حلیہ و خصائص! مارشل جمال پاشا متوسط قامت اور نہایت وجیہ آدمی تھے چہرا ابھرا ہوا آنکھیں بڑی بڑی، اور نہایت خوشنما گھنی داڑھی مونچھیں جرمنی طریق کی اوپر کو چڑھی ہوئیں، یورپین لباس پر اناطولی ٹوپی زیب سر فرماتے تھے، مزاج کے نہایت حلیم اور بُردبار آدمی تھے، گو غصہ بہت کم آتا تھا لیکن چہرہ سے جنگی شہامت و تدبر کے پُرجلال آثار ہویدا تھے۔

مُلّا توحیدی،

جاپان اور زلزلے

جاپان چینی لفظ نیفن کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔ نیفن کے معنی The Land of Rising sun کے ہیں۔ چونکہ جاپان چین کے مغرب میں ہے اور صبح کو اُسی طرف چینی آفتاب کو طلوع ہوتے دیکھا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ ان جزائر کو نیفن پکارنے لگے۔ اور خدا کی عجیب قدرت کہ جاپان نے دور جدید میں مغربی اقوام کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن میں جو مقابلہ کیا تو اُس کی ترقی کا آفتاب اس طرح طلوع ہوا کہ چینیوں نے جو نام رکھا تھا وہ صادق آیا۔ جاپان سے مراد وہ تمام حصہ ہے جو ایشیا کے مغربی ساحل پر شمال میں جزیرہ سگھالین سے لے کر جنوب میں جزیرہ فارموسا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تمام جزائر شمار میں کم و بیش ایک ہزار ہیں۔ اس میں سب سے بڑا ہانشیو یا ہانڈو کہلاتا ہے۔ یہ جاپان کا اصل حصہ ہے۔ اسی جزیرہ میں دار السلطنت ہے۔ اہم تعلیمگاہیں مختلف کارخانجات دفاتر سرکاری اور سفارتخانے وغیرہ بھی اسی جزیرے میں ہیں۔ جاپان کا مشہور آتش فشاں پہاڑ فوجی یامہ بھی اسی حصہ میں ہے۔ اور یہی حصہ ہمیشہ سب سے زیادہ زلزلوں کی زد میں رہا ہے۔

بیسویں صدی سے قبل جاپان کا دروازہ غیر اقوام کے لیئے بالکل بند تھا۔ خود جاپانی کسی دوسرے ملک میں نہیں جایا کرتے تھے۔ البتہ ہندوستان بطور جاترا کے اکثر آتے تھے اور چند یوم کی سیاحت کے بعد واپس ہو جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ جاپانی تہذیب پر آئینی اثر بالکل نہ پڑا تھا۔ شوگن جماعت جو اُس وقت حکمراں تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی حرص آز کو خوب سمجھ گئی تھی۔ یہ جماعت سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جو حکومت کرتی تھی جس طرح سے فرانس کے Mayors of Palace تھے یہ جماعت بھی اسی طرح بنی تھی اور اپنا نام شوگن قرار

دیا تھا۔ اس نے قدیمی شہنشاہ کو جو مکاڈو کہلاتا ہے معزول کر دیا اس جماعت نے مغربی اقوام کو سوائے ڈچ کے (وہ بھی صرف ایک بندرگاہ سے) جاپان میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی۔ اور اگر کوئی اس حکم کے خلاف ورزی کرتا تھا تو اُسے موت کی سزا ملتی تھی ۱۸۵۴ء میں ایک امریکن مسمیٰ کموڈور پیری ایک بیڑہ سے کر جس کی تاب جاپان نہ لا سکتا تھا خلیج یڈو میں آ پہونچا اور جاپان کو ایک تجارتی صلحنامہ کرنے پر مجبور کیا۔ اس صلحنامہ کی ماتحت امریکہ کے لیئے جاپان کے کئی بندرگاہ کھل گئے اور بسلسلۂ تجارت آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اس کے بعد یورپ کی بحری اقتدار رکھنے والی سلطنتوں نے بھی ہمت کی اور جاپان نے مثل چین کے بالآخر اپنے تمام بندرگاہ کھول دیئے ان اجنبی اقوام خصوصاً یورپین قوموں کے جاپان میں داخل ہونیکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۸ء میں ایک انقلاب ہوا اور شوگن جماعت معزول اور حکومت پھر قدیم شاہی خاندان مکاڈو کو مل گئی۔ غرضیکہ بیسویں صدی کے اوائل سے جاپان نے مغربی تہذیب کو قبول کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اب اُس کے شہر تقریباً تمام مغربی آسائشوں سے پُر ہیں یورپ کے طرز کی پارکیں، ہوٹل، ریسٹارن، سینما، تھیٹر، ٹرامویے، ٹیلیفون، برقی روشنی گیس پائپ، یہ تمام چیزیں اب ہر بڑے جاپانی شہر میں پائی جاتی ہیں۔

باوجودیکہ جاپان زلزلوں اور کوہ آتش فشاں پہاڑ کی تباہیوں کا ہمیشہ آماجگاہ رہا ہے مگر پھر بھی کوئی قوم اپنی حکمراں شاہی خاندان کی قدامت پر اتنا نازاں نہ ہوگی جتنا کہ جاپانی۔ مکاڈو خاندان پورے پچیس صدی سے چلا آ رہا ہے گو درمیان میں شوگن جماعت نے اس خاندان کو حکومت سے معزول کر دیا تھا مگر جاپانی قوم ہمیشہ اس خاندان کے ارکان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔

جاپان اپنی صناعی، اپنی مخصوص طرز معاشرت کے علاوہ اپنے زلزلوں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے جاپان میں جس کثرت اور تسلسل سے زلزلے آئے ہیں اور جس قدر جانی و مالی نقصانات جاپان نے اس ہیبت ناک عذاب سے اُٹھائے شاید بہت سی قوموں نے لڑائیوں

میں بھی نہ اٹھائے ہوں گے۔ جاپان کی تاریخ دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ ہر زلزلے میں سیکڑوں جانیں تلف ہوئی ہیں اور بڑی بڑی بربادیوں کا جاپان کو سامنا کرنا پڑا ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی دوپہر بھی جاپان کے لیے عجیب و غریب ماتم خیز دوپہر تھی کہ صرف دو منٹ کے اندر ٹوکیو کا خوبصورت شہر اور اس کا وسیع بندرگاہ یاکوہاما نیز شہر شاگامی، اوداشموسہ اور اطراف کے بہت سے مواضعات اپنی تمام چہل پہل کے ساتھ اس طرح زلزلے سے تباہ و برباد ہوگئے کہ اس کی یاد سے انسانی خیال لرزتا ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں زلزلے آئے ہیں خود جاپان کے تمام گزشتہ زلزلوں سے بڑھ کر یہ زلزلہ اپنی تباہ کن اور برباد خیز نوعیت میں یکتا تھا۔ ٹوکیو کا قدیمی نام یدّو تھا۔ شوگن حکومت کے انقلاب کے بعد جب مکاڈو خاندان پھر برسر حکومت ہوا تو اس نے دارالسلطنت کا نام بدل دیا اور ٹوکیو رکھا۔ جس کے لفظی معنی "مغربی دارالسلطنت" کے ہیں۔ موجودہ عہد کے تمام شہروں میں یہ عظیم الشان شہر شمار کیا جاتا تھا۔ یہ شہر اپنی وسعت میں یکتا تھا۔ شہر کے اندر کئی نہریں اور بہت سی پارک و باغات تھے۔ اس کا رقبہ سو مربع میل تھا۔ اس کی آبادی ۲۸۶۰۰۰۰ نفوس کی تھی۔ شہر کی خاص سڑک گنسنزا پر ٹریموے اور یورپ کی وضع کی دکانیں تھیں۔ تین ہزار عبادتگاہیں تھیں۔ اساکوسہ حصہ میں ایک اتنا عظیم الشان اور وسیع مندر تھا کہ اس کے احاطہ کے ساتھ کئی تھیٹر گاہیں۔ تیراندازی کے لیے کافی جگہ، چائے خانے ہوٹل وغیرہ وابستہ تھے جن سے عبادتگاہ کے اردگرد شام کو ایک عجیب تماشا لگ جاتا تھا۔ اسی طرح سے یاکوہاما جاپان کا سب سے وسیع بندرگاہ تھا۔ جو بیس میل سمندر پر واقع تھا اس بندرگاہ سے ۲۲۸۲۷۰۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا مال سالانہ جاپان میں آتا تھا۔ اور اسی طرح ۲۰۷۵۶۰۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا مال سالانہ باہر جایا کرتا تھا۔ اس بندرگاہ سے سالانہ ۳۲۲۶۳۰۰۰ ٹن کا سامان اتارا جاتا تھا۔ ان اعداد سے بندرگاہ کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یاکوہامہ میں جاپانی تمدن بہت کم تھا۔ کیونکہ یہاں زیادہ تر یورپ کے باشندے آباد تھے جو مختلف کاروبار کے سلسلے سے یہاں آکر آباد تھے۔

انھیں کے مذاق کے مطابق یہ شہر تعمیر ہوا۔ یاکوہاما کی آبادی ۴۴۶۰۲۵ تھی۔ جاپان کے یہ دونوں شہر اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ یکایک منہدم نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک خاک کا تودہ بادل کی طرح اُمنڈ آتا ہے۔ اور جاپان کا مایۂ ناز شہر اور عظیم الشان بندرگاہ اس طرح تباہ ہو جاتا ہے کہ جو حصے زلزلے کی زد سے بچ جاتے ہیں اُن میں گیس کے نلوں کے پھٹ جانے کے سبب آگ لگ جاتی ہے اور لکڑی کا تمام حصہ جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ ذرا اُس شہر کی حالت کا خیال کرو جو ابھی چند لمحہ قبل ایک تجارتی منڈی، ایک چلتے پھرتے لوگوں کی بستی، زندہ انسانوں کی آبادی تھی یکایک خاک کا ڈھیر، راکھ کا انبار اور جلے ہوئے مکانات کے ڈھانچے میں تبدیل ہو جائے، اور جہاں اب سوائے لاشوں کے اور کوئی زندہ جسم نظر نہ آئے۔ انسانی جانوں کی بربادی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک معمولی سی بنک کی عمارت میں آگ لگ جانے سے ستر جانیں فوراً تلف ہو گئیں۔ کوئی گھر نہیں بچا کہ جس میں کئی کئی جانیں نہ ضائع ہوئی ہوں۔

جاپان نے گزشتہ تہائی صدی میں بڑی ترقی کی اور قریب قریب ہر شعبہ میں اُس نے مغربی اقوام کے ہم پلہ ہونے کی کامیابی کے ساتھ کوشش کی تھی۔ جاپان پر گزشتہ کسی زلزلے سے اتنی تباہی و بربادی نہ آئی تھی جتنی کہ اس آخری زلزلہ سے۔ انسانی جانوں کی بڑی تباہی کی وجہ یہ ہوئی کہ ٹوکیو اور یاکوہاما میں لندن کی طرح گیس کے نل لگا دیئے گئے تھے۔ جو زلزلے کے دھکوں سے پھٹ گئے اور جن کی وجہ سے مکانات میں آگ لگ گئی۔ اگر جاپان کے شہر ان مغربی تعیشات سے آراستہ نہ ہوتے تو شاید گزشتہ زلزلوں کی طرح اس قدر جانیں تلف نہ ہوتیں جاپان کی مغرب پرستی کا اس وقت ایشیا کی سادہ زندگی اور حسن معاشرت سے مقابلہ کرو تو دونوں کا فرق نہایت ہی عبرت انگیز نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جاپانی قوم کو قدرت نے زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کی مصیبتوں کو برداشت کرنے کی کچھ ایسی قوت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ اس کے ذرا بھر احساس نہیں

ہوتے۔ اور تباہی کے بعد فوراً ہی تعمیر میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ زلزلہ کے بعد ہی فوراً ٹوکیو کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیئے ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کے ساتھ اتحاد عمل کے لیئے رعایا سے ایک شاہی پیام میں درخواست بھی کی گئی ہے، یہ کمیٹی جلد سے جلد اسکیم اور خاکہ تیار کرنے کے بعد تعمیر کا کام شروع کر دے گی۔ جاپانی گورنمنٹ ایسے تباہی کے موقعوں پر اپنی رعایا کے ساتھ جس قدر مراعات اور آسانیاں بہم پہونچا سکتی ہے کبھی دریغ نہیں کرتی چنانچہ گزشتہ زلزلہ کے بعد سے حکومت نے جہاز اور ریل کے سفر کو مفت کر دیا ہے۔ اور تباہ شدہ حصہ سے کوریا" فارموسا، یا چین جانے والے کو کچھ نہیں خرچ کرنا پڑتا۔ اسی طرح سے مصیبت زدہ حصوں میں تمام ذرائع باربرداری کا مفت انتظام ہے۔ ڈاکخانہ، تار، ٹیلیفون وغیرہ بھی پبلک کے استعمال کے لیئے عام کر دیئے گئے ہیں اور کسی قسم کا محصول یا معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔ تمام سرکاری ٹیکس اٹھا لیئے گئے ہیں۔ گورنمنٹ نے ۹۵ لاکھ ین جو قریب ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے ہوتا ہے امداد کیلئے منظور کیئے ہیں۔ شاہی خاندان نے بھی اپنی جیب خاص سے ایک کروڑ ین بدیں غرض عطا کیئے ہیں۔ دوسرے ممالک سے بھی برابر امداد پہونچ رہی ہے خصوصاً اس موقعہ پر برطانیہ اور امریکہ اپنی ہمدردی اور فیاضی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ امریکہ نے تو چالیس کروڑ ڈالر کی امداد منظور کی ہے۔ اور برطانیہ کی خاطر غریب ہندوستان سے بھی لارڈ ریڈنگ صاحب بالقابہ جاپان ریلیف فنڈ میں روپیہ وصول کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جاپان پر ہمدردی کا جادو چلانا مقصود ہے۔ اور یہ "سیاسی" ہمدردیاں آئندہ کی کسی تجارتی مراعات کی پیشنگوئی کر رہی ہیں ورنہ برطانیہ اور امریکہ کو تو ایک پیسہ بھی کسی ایسی "قوت" کی امداد کے لیئے خرچ کرنا گوارا نہ ہوتا جو کم سے کم ایشیائی تجارت پر اپنا اقتدار چاہتی رہی ہو۔

جاپان میں زلزلے اسی قدامت کے ساتھ سُنے جاتے ہیں جس قدامت پر جاپانی قوم نازاں ہے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ سب سے پہلا زلزلہ جاپان میں ۲۸۶ قبل مسیح میں آیا تھا اسی زلزلے کے بعد کوہ فوجی یامہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ سطح زمین پر نمودار

ہوا جھیل بیوا بھی جس کا اِس سے قبل کہیں نام و نشان بھی نہ تھا صفحۂ زمین پر پائی گئی۔ تاریخ قدیم میں یہ واقعات نہایت ہی اہمیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرا زلزلہ غالباً بہت عرصے کے بعد یعنی سنہ ۸۳۰ء میں آیا۔ اور اُس کے بعد پندرہ صدی کے عرصہ میں یعنی سنہ ۱۸۶۶ء جاپان میں کل ۹۴۱ زلزلے آئے جن میں ۵۳ سنہ ۱۵۰۰ء کے قبل آئے۔ ان زلزلوں کا خاص شکار ہمیشہ شہر کیوٹو رہا ہے جو ہر مرتبہ بالکل مسمار ہو گیا ہے۔ برخلاف اس کے یدو ٹوکیو اس عرصہ میں صرف ایک دفعہ زلزلہ محسوس کیا گیا۔ اور ناگاساکی میں دو مرتبہ۔ ناگاساکی کے یہ دونوں زلزلے صرف تین سال کے عرصہ میں یعنی ایک سنہ ۱۶۲۳ء میں اور دوسرا سنہ ۱۶۲۵ء میں آیا۔ اور ہر مرتبہ شہر بالکل برباد ہو گیا اور ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا۔

بارہویں صدی میں صرف ایک مرتبہ سنہ ۱۱۸۵ء میں زلزلہ آیا۔ کیوٹو میں کثیر نقصانات ہوئے اور لاکھوں انسان فنا ہو گئے اور مسطح حصے غاروں میں تبدیل ہو گئے۔

تیرہویں صدی میں کل ستّرہ ۱۷ زلزلے محسوس کیے گئے۔ جن میں سے سنہ ۱۲۹۳ء میں جو زلزلہ آیا اُس میں اکیس ۲۱ ہزار آدمی ضائع ہوئے۔ چھ ۶ سال بعد سنہ ۱۲۹۹ء میں دوسرا زلزلہ پھر آیا اور اُس میں بھی دس ۱۰ ہزار انسانوں کی جانیں گئیں۔ اسی طرح اسی صدی میں ایک معمولی سے زلزلہ میں ایک مندر کے گر جانے سے پچاس پوجاری دب کر مر گئے۔

چودہویں صدی میں آٹھ زلزلے آئے۔ جو قریب قریب اپنی بربادکن نوعیت میں ایک دوسرے سے سبقت لے گئے۔

سمندر کا پانی اِن زلزلوں کی وجہ سے چڑھ آتا تھا ساحل پر جو شہر آباد تھے اُن میں ایک عجیب طوفان خیز حالت ہو جاتی تھی۔

پندرہویں صدی میں پندرہ زلزلے آئے۔ اور مثل سابق کے کثیر نقصانات کے باعث ہوئے۔

سولہویں سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں کل ۳۶ زلزلے آئے۔ اور یہ سبب

نہایت ہی تباہ کن تھے۔ ۳۰ر اگست ۱۵۹۶ء کا زلزلہ عجیب و غریب تھا زلزلہ کے ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ ابھی لوگ سنبھلے بھی نہ تھے کہ چار روز بعد پھر یعنی ۴ر ستمبر کو دوبارہ زلزلہ آیا۔ جاپانیوں کا خیال ہے کہ یہ زلزلے ہیدے یوشی کی جو اس وقت حکمراں تھا۔ بداعمالیوں کے عذاب سے تھے۔ ہیدے یوشی ایک ٹیلہ پر جا کر پناہ گزیں ہوا اور دنیاوی زندگی چھوڑ کر راہبانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

جب ہم اٹھارہویں صدی کے زلزلوں کو شمار کرتے ہیں تو چودہ زلزلے صرف ۱۸۰۰ء تک آ چکے تھے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ قریب قریب ہر پانچ سال کے بعد ایک زلزلہ آیا۔ ان میں ۱۷۰۷ء کا زلزلہ سب سے زیادہ مہیب تھا۔ جبکہ زلزلہ کے بعد ہی فوجی یامہ نے آگ اور دھوئیں کی بارش شروع کر دی، جو ۱۶ر دسمبر ۱۷۰۷ء سے ۲۲ر جنوری ۱۷۰۸ء تک برابر جاری رہی۔ یہ ایک عجیب و خوفناک عذاب الٰہی تھا۔ جس کی تپش میلوں تک جاتی تھی۔ گرم راکھ جلتے ہوئے کوئلوں اور لاشے کا طوفان کئی میل رقبہ کو محیط کیے ہوئے تھا۔ اس کے بعد ۲۲ر دسمبر ۱۸۵۴ء کو پھر ایک زلزلہ آیا جس کی وجہ سے کیوٹو کے کئی بڑے بڑے کارخانے اور بہت سی عمارات کا نقصان ہوا اور ہزارہا آدمی مر گئے۔

اس کے بعد پھر ۱۸۵۵ء میں دوسرا زلزلہ آیا۔ جس کا سب سے زیادہ اثر اس مرتبہ ٹوکیو پر پڑا۔ گو ٹوکیو ایک سال قبل کا تباہ شدہ تھا تاہم سال بھر کے اندر دوبارہ تباہ ہونے کیلئے بہت کچھ تعمیر ہو چکا تھا۔ چنانچہ چودہ ہزار مکانات، چھ سو فائر پروف گودام اور ایک لاکھ چار ہزار نفوس پھر زلزلہ کی زد میں آ گئے۔ اس کے بعد پندرہ سال تک کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ مئی ۱۸۷۰ء میں پھر آیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ء تک تین زلزلے اور آئے جس میں سے ۱۲ر فروری ۱۸۸۹ء کا سب سے زیادہ سخت تھا۔ جس نے یاکوہاما کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں ایک معمولی سا زلزلہ محسوس ہوا۔ جس سے شہر کوبے اور ساحل کے دوسرے شہروں میں نقصانات ہوئے۔ ۲۰ر جون ۱۸۹۴ء کا آخری زلزلہ

تھا۔ اس نے بھی یاکوہاما اور ٹوکیو کو سب سے زیادہ برباد کیا۔ ان دونوں شہروں نے اس زلزلے کے بعد سے نئی مغربی صورت اختیار کرنی شروع کی۔

جاپان کی سر زمین پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہے کہ مسلسل زلزلوں کی وجہ سے جاپان نے بڑے بڑے ملکی نقصانات اُٹھائے ہیں۔ مسطح زمین پہاڑ بن گئی۔ کہیں جھیلیں پیدا ہوگئیں۔ غرضیکہ اس قسم کی تبدیلیوں کا بہت کچھ سراغ ملتا ہے۔ تاہم جاپان نے اِن زلزلوں سے فائدے بھی اُٹھائے ہیں۔ ۱۵۶۰ء میں جب زلزلہ آیا تو اُس کے بعد موتشما (Matsushima) کا خوبصورت جزیرہ سطح آب پر نمودار ہوا۔ جو آج کل یورپین باشندوں کے لئے ایک نہایت ہی دلچسپ فرحت افزا تفریح گاہ بنا ہوا ہے۔ اسی طرح سے جزیرہ ہانگ کو بھی ایک زلزلے کے بعد جاپان کو قدرت نے عطا کیا اور سمندر سے اوپر نکال دیا۔ تواریخوں میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ کسی ٹیلہ پر ایک کسان کی جھونپڑی تھی۔ شب میں زلزلہ آیا۔ ٹیلہ مسطح زمین بن گیا۔ صبح کو کسان اُٹھتا ہے تو اپنی جھونپڑی کو بجائے ٹیلہ کے ایک میدان میں پاتا ہے متعجب ہوتا ہے۔ مگر جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ شب میں زلزلہ آیا تھا تو اُسے یقین ہوتا ہے کہ اُس کی جھونپڑی اپنی اصلی جگہ پر ہے۔

جاپان کا یہ آخری زلزلہ جو یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی دوپہر کو ۶۹ برس کے بعد نمودار ہوا اور جس نے یکایک وہ تمام کوششیں ملیامیٹ کر دیں جو جاپان نے اپنے شہروں کو مغربی رنگ میں لانے کے لیے کی تھیں، تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس غیبی بربادی نے دو منٹ کے اندر اُن تمام عشرت گاہوں، عیش و نشاط کے محفل خانوں، تفریحی مقامات، تھیٹروں، بڑے بڑے کارخانوں اور گوداموں کو اس طرح خاک سیاہ کر دیا کہ جہاں ہزارہا انسانوں کی چہل پہل رہتی تھی آج سوائے بیجان لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا! یہ خدا کی کرشمہ سازیاں ہیں، اور اُس کے جبروت و ملکوتیت کی بدیہی مثال۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء محمد جعفری

۔۔۔۔۔

رفتار تعلیم

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چھتیسواں [۳۶] اجلاس آیندہ ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء میں بمقام علی گڑھ ہوگا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اس کے صدر ہوں گے۔ ہندوستان کے اطراف واکناف سے علم دوست حضرات مدعو کئے گئے ہیں مختلف مضامین پر مشاہیر ہند کے لکچر بھی ہونگے اسی سلسلہ میں کچھ نمائش کا انتظام بھی کیا گیا ہی جس میں پرانے کتبات، قلمی نسخے اور شاہی فرامین دکھائے جائیں گے۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کیا جائے گا۔ کانفرنس کے گزشتہ کارنامے بیان کئے جائیں گے۔ آیندہ ترقی بھی پیش نظر ہوگی۔ تعلیم نسواں اور تعلیم ابتدائی کے وسائل اور ذرائع بھی زیر بحث ہوں گے۔ مختلف تجاویز و ترمیمات بھی پیش ہونے سے نہ رہیں گی، غرض اس چند روز کے عرصہ میں بہت کچھ ہونے کی امیدیں بندھی ہیں۔ "مسلم قوم" منتظر ہی کہ اس کے مرض کی دوا یہیں سے ملے گی۔ ہر شخص آنکھیں اُٹھائے ہوئے ہی کہ شاید آیندہ کے لیے کوئی سامان پیدا ہو، خود حضرات شرکا بھی سمجھتے ہوں گے کہ آئے ہیں تو کچھ کر کے ہی جائیں گے۔ فی الحال تو ہم بھی انھیں کے ساتھ اپنی امید وابستہ کرتے ہیں اور نتیجے کے منتظر ہیں۔ دسمبر کے پرچہ میں ہم انشاء اللہ کانفرنس کی کارروائیوں اور ان کے آیندہ نتائج پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر سکیں گے۔

کہا جاتا ہی کہ نپولین اور واشنگٹن کو فوج میں ہزارہا سپاہیوں کے نام یاد تھے۔ روزولٹ اور لنکن (ہر دو امریکہ کے پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں) کو ہر بات جو انھوں نے کبھی پڑھی یا سنی، زبانی یاد تھی۔ پاسکل مشہور سائنس داں کو پوری انجیل بر زبان تھی۔ شیکسپیر کو ۱۵ ہزار الفاظ اور ملٹن کو ۱۰ ہزار الفاظ یاد تھے، غرض ہر بڑے شخص کے ساتھ قوت حافظہ ایک مخصوص عنصر رہا ہی اور جیسا کہ بیکن نے کہا ہی "علم کیا ہی، فقط اشیا کی یاد داشت ہی"

لیکن اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ حافظہ صرف بڑے اشخاص کا حصہ ہے، جو عام آدمی کو میسر نہیں آتا۔ ہزارہا اشخاص عام طور پر ایسے ملیں گے جو اپنی غیر معمولی یادداشت کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ غرض اکتسابی طور پر بھی کوئی شخص چاہے تو اپنی قوت حافظہ کو بڑھا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ویلکنسن نے آٹھ چھوٹے چھوٹے قاعدے بتائے ہیں جن کی مدد سے قوت حافظہ بڑھائی جا سکتی ہے۔

قاعدے یہ ہیں۔

۱۔ اپنے خیال میں یکسوئی پیدا کرنے کی عادت ڈالو۔

۲۔ کسی چیز کا خیال قائم کرنے کے لئے جتنے حواس کام میں لا سکتے ہو، لاؤ۔

۳۔ جو قوت دماغی کمزور ہو، اُس کو رفتہ رفتہ باقاعدہ مشق سے بڑھاؤ۔

۴۔ کسی چیز کے متعلق جو پہلا خیال قائم ہو، اُسے مستحکم کرلو۔

۵۔ اپنے قائم کردہ خیالات کو بار بار دُہراتے رہو (ایکٹروں کو جو کھیل وہ کئی بار کھیل چکے ہوں انھیں کچھ کچھ عرصہ کے بعد دہرانا چاہیئے۔

۶۔ اپنی یادداشت پر اعتماد رکھو۔ نوشتہ چیزوں اور دوسروں کی یادداشت پر بھروسہ نہ کرو۔

۷۔ اشیاء کے خیال قائم کرنے میں جو جو صورتیں اور جن جن طریقوں سے ہو سکے، قائم کرو۔ کسی چیز کے یاد رکھنے میں: کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ کہاں، کب، کیسے، اور کیوں آئی؟ اور کہاں جارہی ہے؟ اس قسم کے جتنے سوالات ہوں پیش نظر رکھو۔

۸۔ اپنی اس مشق کو عملی اور مفید بناؤ۔

اس کے متعلق خود راقم الحروف کا ایک تجربہ ہے۔ ایک شخص نے انھی اصولوں کی بنا پر دعویٰ کیا کہ "میں مختلف چیزوں کے نام ایک ساتھ لو اور میں اسی ترتیب کے ساتھ انھیں یکے بعد دیگرے بتا دوں گا۔" چنانچہ بیس نام جنھیں باہم کوئی ربط نہ تھا اور اکثر ان میں سے نامانوس اور مشکل تھے ان میں سے ایک لفظ "عاقر قرحا" بھی تھا لیے گئے، اس پر مستزاد یہ کہ

شخص مذکور اس ملک کا باشندہ نہ تھا بلکہ یورپین تھا لیکن دو منٹ تک آنکھیں بند رکھنے کے بعد اس نے اسی ترتیب سے تمام نام یکے بعد دیگرے سُنا دیئے۔ بعد میں اس نے اسی راز کو افشا کیا اور کہا کہ میں ہر چیز کی ایک تصویر اپنے ذہن میں قائم کرتا تھا اور دوسری چیز سے اُسے اسی خیالی تصور کی بنا پر جوڑتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے ذہن میں ہیں اشیاء کا ایک کامل تصور سلسلہ بن گیا۔ اور اس دو منٹ میں آنکھ بند کر کے میں نے اس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر ان قائم کردہ ذہنی تصویروں کی بنا پر اس سلسلہ کی مدد سے تمام اشیاء کے نام یکے بعد دیگرے بیان کر گیا"

اس طویل گفتگو سے صرف یہ بتانا منظور تھا کہ "تعلیم" نہ صرف محسوس طریقہ اور مرئی اشیاء کے ذریعہ ہوسکتی ہے بلکہ غیر محسوس طریقہ سے بھی ممکن ہے اور "رفتار تعلیم" میں بہت کچھ ترقی کی جاسکتی ہے۔

یوں تو ہندوستان میں کم و بیش ساڑھے تین سو زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں چند ایسی ہیں جن پر علمی زبان کا صحیح معنوں میں اطلاق ہوسکتا ہے۔ انہی میں سے ایک مرہٹی زبان بھی ہے جسے ہندوستان کی تمام دیسی زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ علاوہ اس کے زبان مذکور نظم و نثر کے لحاظ سے بھی دوسری زبانوں میں خاص رتبہ رکھتی ہے۔ اس زبان کے متعلق جتنی انجمنیں اور مجالس کام میں برابر مصروف ہیں ان میں سے ایک مجلس تراجم دکن بھی ہے۔ اس کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے کہ جس زمانہ میں دکن میں پیشوا کی حکومت تھی، اس وقت پنڈتوں اور علمی اشخاص کو حکومت کی طرف سے تقریباً ایک لاکھ روپئے بطور وظائف (جنھیں "دکشنا" کہتے تھے) ملا کرتے تھے۔ جب انگریزوں نے مرہٹی علاقہ برطانوی ہند کے ساتھ ملحق کر لیا تو ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن (جو غالباً ہندوستان کی مشہور "الفنسٹن ہسٹری" کے مصنف ہیں) نے وہ رقم مشرقی علوم کی ترقی کے لیے وقف کر دی چنانچہ دکشنا پرائز کمیٹی کے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی جو مصنفین و مترجمین کو اس رقم سے معاوضہ دے کر

کام کرا تی تھی کچھ عرصہ کے بعد ہماری "انجمن ترقی اُردو" کی طرح یہ کمیٹی بھی بیکار ہو گئی لیکن مرہٹی لٹریچر کی خوش نصیبی سے ۱۸۹۴ئ میں مجلس تراجم دکن نے اس کی جگہ لے لی۔ آیندہ خیال یہ ہے کہ اس مجلس کے ساتھ مزید علمی حضرات کا اضافہ کرکے اس کا نام اکاڈیمی آف مرہٹی لٹریچر رکھ دیا جائے تاکہ مرہٹی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام مستقل طور پر ہو سکے۔

امید ہے کہ قدر شناسان ریختہ اور حامیان اُردو اس کے پڑھنے کے بعد اپنی زبان کی "رفتار ترقی" پر بھی غور فرمائیں گے۔

کچھ عرصہ قبل ترک منشیات کی جو تحریک امریکہ نے اٹھائی تھی، اس کے خلاف سب سے بڑا عذر جو پیش کیا گیا، وہ کوئی اخلاقی یا مذہبی نہ تھا بلکہ سراسر دنیوی پہلو لیے ہوئے تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی آمدنی سے جو معقول رقم آتی ہے وہ تعلیم پر صرف کی جاتی ہے اور اس بنا پر ان کو اندیشہ تھا کہ اس لعنت کے دور ہو جانے سے ایک بڑی برکت ہاتھ سے چلی جائے گی۔

اسی طرح تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں جب ترک منشیات کی کوشش کی جارہی تھیں، ہندوستان کے بعض "حامیان تعلیم" نے بھی وہی سبق دُہرایا کہ "محکمہ آبکاری کے بند ہو جانے سے ہندوستان کی تعلیم پر بُرا اثر پڑے گا لیکن شاید وہ یہ دیکھ کر کہ حکومت امریکہ نے قبل از تحریک اور اس کے بعد بھی تعلیم پر کس نسبت سے صرف کیے، کیا جواب دیں گے؟ اس کے لیے اعداد حسب ذیل ملاحظہ ہوں:-

اس دو برس میں	سال	مصارف
اس دو برس میں شراب کی بکری کم ہوئی	۱۹۱۶ء	۶,۴۰,۷۱,۷۰,۵۴ ڈالر
	۱۹۱۸ء	۷۶,۳۶,۷۸,۰۵۹ ڈالر
اس سال کم تھی	۱۹۲۰ء	۱,۴۳,۶۱,۵۱,۲۰۹ ڈالر

یہ تو ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا حال ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا اندازہ اعداد

ذیل سے کیجئے۔

	سال	اخراجات	عطیات
اس دو برس میں شراب کی بکری کم ہوئی تھی	سنہ ۱۹۱۶ء	۱۱۳۸،۵۰۸۴۸	۱۹۷۷۶۳۶۴ ڈالر
	سنہ ۱۹۱۸ء	۱۳۷۰۰۵۴۱۵	۱۶۷۴۶۱۴۰ ڈالر
اس سال کم نہ تھی	سنہ ۱۹۲۰ء	۱۸۹۲۳۵۲۴۲	۵۰۹۰۶۷۵۲ ڈالر

سرجے، سی بوس کی شخصیت ہندوستان کے دور حاضر میں، اپنی مثال نہیں رکھتی، نہ صرف یہی بلکہ آپ کا شمار دنیا کے مشہور ترین ماہرین سائنس میں ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب آپ یورپ تشریف لے گئے تو رائل سوسائٹی نے آپ کو اپنا فیلو بنانا فخر سمجھا۔ پیرس میں مشہور سائنس دانوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ وائنا اور برلن میں آپ کے علمی کاموں کو نہایت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ بوس انسٹیٹیوٹ ہے جو چھ سال سے پیشتر آپ نے کلکتہ میں قائم کیا۔ اس میں کوئی ایک درجن اشخاص تحقیق و تفتیش کا کام نہایت محنت و سرگرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ سر مائیکل سیڈلر نے اس انسٹیٹیوٹ کے متعلق ایک بہت اچھا فقرہ کہا ہے "یہ وہ چراغ ہے جس سے ہزاروں اشخاص نشان راہ پائیں گے"۔

ان دونوں کے تعارف کے بعد ہم سرجے۔ سی بوس کی ایک تازہ ترین تحقیق ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جو آپ نے گرشتہ ہفتہ یونیورسٹی کالج، میں پیش کی ہے۔ آپ نے بسلسلۂ تحقیق نباتیات ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے پودا اپنی خوراک از خود لے سکتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جدید آلہ کی اختراع سے آئندہ طب پر جو اثر پڑے گا اس پر علمی رائل سوسائٹی کے کسی خاص اجلاس میں غور کیا جائے گا۔

مطبوعاتِ جدیدہ

افادات مہدی | یہ کتاب دورِ جدید کے مشہور انشا پرداز ایم مہدی حسن (جنھوں نے ابھی حال میں وفات پائی ہی) کے مضامین کا ایک مجموعہ ہی جو ان کی بیگم صاحبہ نے مقدمہ، سوانح مصنف اور چند ضمیموں کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا ہی۔ یہ مجموعہ چونکہ خود کوئی مستقل کتاب نہیں ہی۔ اس لیئے مضامین کے انتخاب اور ان کی ترتیب تالیف میں کماحقہ لحاظ نہیں پایا جاتا ہی۔ لیکن "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک"۔ "ادب اردو کے عناصرِ خمسہ"۔ "فلسفہ حسن و عشق" اور "اُردو لٹریچر کا نفسِ واپسیں" نیز دیگر مضامین جو اپنی وقتی اور ہنگامی اہمیت کے علاوہ آج بھی ذوق سلیم کے لیئے خاص لطف اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ مضامین ایسے ملیں گے جن کی زبان علمی حیثیت سے نہایت پاکیزہ اور سلیس ہی۔ مصنفین کے گزشتہ دور اور جدید انگریزی داں طبقہ کے متعلق لکھتے لکھتے تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ ایک کھلا ہوا راز ہی کہ جو بساط ابھی دیکھتے دیکھتے اُٹھ گئی یعنی لٹریچر کے جو حقیقی مالک تھے وہ قریب قریب ایسے تھے جنھیں مشرقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اور جن کو مغربیت کچھ یونہی چھو گئی تھی لیکن ان کی قوت اجتہادی کا مظہر وہ معرکۃ الآرا سرمایۂ ادب ہی جو ورثہ میں وہ ہمارے لیئے چھوڑ گئے ہیں بہرحال نوجوان طبقہ کی بیگانہ وشی بہت ہی لائق افسوس ہی"

اور جو مضامین خالص ادبی ہیں وہ اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں "فلسفہ حسن و عشق" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"آہ عورت! تو فسانہ زندگی ہی۔ تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے شیش محل بنا سکتی ہی، بڑے سے بڑے ایوانِ عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں!"

گنجائش نہیں اس لیئے علمی ور ادبی رنگ کے یہ اقتباسات بطور مشتے نمونہ از خروارے مختصراً پیش کیئے ہیں اور سچ تو یہ ہی کہ مصنف ایک دلکش اسٹائیل کے موجد تھے جو اپنے ساتھ لائے اور لیتے گئے۔ نئی اصطلاحات مثلاً "قاموس الاسلام" (Encyclopaedia) اور "تنقید عالیہ" (High Criticism) اختراعی ترکیبیں جیسے "پنجتن اصغر" (اردو کے عناصر خمسہ کیلیے) "خاتم المصنفین" (مولانا شبلی کے لیئے) نیز انگریزی ترکیبیں مثلاً "شائقین ترقی کو اپنی سب سے پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیے" یا "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" یہ چیزیں مصنف کی خصوصیات میں سے تھیں جنھیں وہ اپنے ساتھ لائے اور لیتے گئے۔ بہر حال یہ مجموعہ اب بھی اخلاف کے لیئے شمع راہ کا کام دے سکتا ہے۔ بیگم صاحبہ نے اسے جلد شائع کرکے اردو زبان کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا، شروع میں مصنف مرحوم کا ایک فوٹو بھی ہی۔ ملنے کا پتہ،

مہدی بیگم، محلہ بسنت پور، گورکھپور

ماہ نو | یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی "شِشُو" کا اردو ترجمہ ہی جسے حامد اللہ افسر صاحب، بی۔اے نے کیا ہی۔ اصل کتاب مختصر نظموں کا ایک مجموعہ ہی اور یہ بلحاظ مضمون بچوں کے جذبات و حسیات اور ان کے خیالات کا ایک مرقع ہی۔ یوں تو ٹیگور کی نظر میں ؏

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن خدا کا جلال اور اس کی معرفت اسے جتنا ایک بچے میں نظر آتی ہی شاید اور کسی چیز میں مشکل سے معلوم ہوتی ہو۔ یہی سبب ہی کہ اس کے اکثر قصے اور افسانے بچوں کے متعلق اور انھیں کے مذاق کے مطابق ہوتے ہیں۔ اصل زبان یعنی بنگالی بھی جہاں تک معلوم ہوا ہی، بہت سلیس اور عام فہم ہوتی ہی۔ ایسی کتاب کا ترجمہ بلا شبہ اردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ہی۔ خود مترجم نے بھی سلاست زبان اور عام فہمی کی کوشش کی ہی

گو بعض بعض جگہ یہ رشتۂ خیال ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف "اگر" "پیٹر" "تالی" (بمعنی کنجی)، "مسکراہٹ" "جٹائی" "چترائی" اور "کونے" جیسے سادہ الفاظ پائے جاتے ہیں تو دوسری جانب "مضطرب" "مستعار" "موسیقیت" "پسماز" "طلائی مشجر" "اسرار معنی خیز" اور "بزرگ خورد سال" جیسے الفاظ اور ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مترجم صاحب آیندہ تالیفات میں اس کا لحاظ رکھیں گے کتاب کی لکھائی چھپائی معمولی قسم کی ہے۔ قیمت دس آنہ۔ ملنے کا پتہ، منیجر انڈین بک ڈپو۔ اندر کوٹ شہر میرٹھ۔

دخترِ سمرنا | یہ کتاب خالدہ ادیب وزیر تعلیم انگورہ کے ناول "قمیص من نار" کا اردو ترجمہ ہے جسے مولوی غلام ربانی صاحب لودھی (علیگ) نے کیا ہے اور جسے "صوفی پبلشنگ کمپنی" نے شائع کیا ہے۔ سلسلۂ عبارت میں کہیں کہیں اس قسم کے فقرے اور ترکیبیں آجاتی ہیں مثلاً "میں گھر کی طرف خط لکھ رہا ہوں"۔ "میری والدہ نے مکان کو یورپین طرز پر سجایا ہوا تھا" "البتہ تمہارے انتظار میں ہوں کہ تم آؤ اور اکٹھے ہجرت کریں" جس سے عام زبان میں ایک اجنبیت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہر حال نفس واقعہ ناظرین اردو کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں اور کتاب اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس کو پڑھ کر ناظرین ترکی معاشرت و سیاست سے یک گونہ آشنا ہو جائیں گے۔

لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی۔ صفحے ۱۷۶ قیمت عہ ملنے کا پتہ

صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، پنڈی بہاء الدین، پنجاب

سپاہیانہ زندگی | اکبر شاہ خاں صاحب، نجیب آبادی کی یہ تصنیف ہے مصنف نے سپاہیانہ کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ انسانی زندگی کے تقریباً ہر پہلو یعنی سادگی لباس و طعام، ایثار نفسی اور ایفاء وعدہ کو اس میں شامل کر لیا ہے اور خود ایک "مورخ" ہونے کی حیثیت سے تاریخ عالم سے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل انبیاء کرام

اور دیگر نامور اشخاص اور بعد میں خود آنحضرت صلعم، خلفاء راشدین اور سلاطین کے سوانح سے شجاعت و بہادری کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ایک باب میں قرآن سے بھی استدلال کیا ہی۔ آخر کے چند صفحات میں ہندوستانی سوسائٹی کے ہر طبقہ میں معائب گنائے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یا تو مصنف کا مقصد مشہور اشخاص کے حالات زندگی اور واقعات تاریخی پیش کرنا تھے یا ہندوستانی سوسائٹی کے عیوب بیان کرنا۔ بہرحال عنوان کتاب کا لحاظ نہ کیا جائے اور تاریخی واقعات کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کتاب فائدہ سے خالی نہیں۔ طباعت و کتابت معمولی صفحے ۱۳۶، قیمت عمر صوفی پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاء الدین پنجاب نے شائع کیا۔

شرح دردِ اشتیاق

(از جناب عابد حسین صاحب بی۔ اے۔ از برلن)

میں رخِ امکاں کا رنگِ زرد ہوں　　آفرینش کا دلِ پُر درد ہوں
زیست کے آئینۂ دل کا غبار　　مرگ کے نقشِ قدم کی گرد ہوں
تھا عدم کی آنکھ میں اک قطرۂ خوں　　سینۂ ہستی میں آہِ سرد ہوں
مجھ کو لائے ہیں مری مرضی بغیر　　یعنی میں آمد نہیں آورد ہوں

چوں مرا در دارِ دنیا کردہ اند
پس پشیمانند بیجا کردہ اند

اے خوشا روزے کہ میں معدوم تھا　　بے نیازِ ہستیٔ موہوم تھا
نقش میرا سطحِ امکاں پر نہ تھا　　لوحِ قدرت پر مگر مرقوم تھا
ہیں مشیت کے جو معنی دہر میں　　میری ہستی کا وہی مفہوم تھا
رشکِ صد ایجاد تھا میرا عدم　　سب سے پنہاں تھا اُسے معلوم تھا

از شرابِ شوق جامے داشتم
در دلِ ساقی مقامے داشتم

آ کے اس بازیچۂ اسباب میں　　پڑ گیا ہوں سخت پیچ و تاب میں
بحر کی وسعت نظر سے چھپ گئی　　موج کے ہمراہ ہوں گرداب میں
آنکھ کا پردہ ہی خود حدِ نظر　　مبتدی ہوں معرفت کے باب میں
رکھ لیا محرابِ طاعت اس کا نام　　سجدہ زن ہوں طاعت محراب میں

سوئے موجودات مائل گشتہ ام
از مآلِ کار غافل گشتہ ام

میرا مونس تھا ابد انجام عشق — اصل سے ہٹ کر ہوا بدنام عشق
تھا نوا سنجِ سکونِ دائمی — دہر میں ہے مورثِ آلام عشق
شورشِ تخئیل کو کہتے ہیں حسن — اضطرابِ قلب کا ہے نام عشق!
چشمِ بینا۔ اور یہ نادار حسن! — قلبِ صافی۔ اور یہ ناکام عشق

دردمندی را کہ سازد چارہ ساز
وائے بر گمراہیِ عشقِ مجاز

باعثِ تسکیں مگر ہے یہ خیال — عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
اتحادِ نور و ظلمت تا بہ کے — چند لحظہ۔ چند ساعت چند سال
پھر وہی آہنگِ سیرِ لامکاں — پھر وہی سودائے حسنِ لازوال
قیدِ صورت سے ملے گی پھر نجات — شاہدِ معنی سے پھر ہوگا وصال

مرغِ جاں را آشیانے دیگرست
ایں مکاں را ہم مکانے دیگرست”

عابد

قید ناگزیر

(از نتائج فکر جناب لوی فضل الحق صاحب آزاد عظیم آبادی)

شب کے اخیر حصہ غفلت میں یک بیک — جب ساری کائنات ہے آغوشِ خواب میں
کھلتی کبھی ہے اور جھپکتی کبھی پلک — اک التہاب ہے دلِ پُر اضطراب میں

جس طرح آبدانِ بر آتش میں جوشِ آب — خمیازہائے نشۂ عناب لیے ہوئے
آنکھوں میں مستحیل کچھ آنسو ہیں یا گلاب — خونِ جگر سے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

کیوں! دل میں یہ کھٹک ہے کسی گل عذار کی — دل آب آب جس کے ہوا ہے فراق سے؟
یا آگئی ہے یاد کسی جاں نثار کی — یا آگئے ہیں آنکھوں میں اشک اتفاق سے؟

کچھ بھی نہیں وہ ہائے کہاں ہم کہاں وہ دل — کیسی کسی کی یاد یہ سب اک خیال ہے
ماضی کی حسرتیں غم آیندہ جاں گسل — اس قید ناگزیر سے چھٹنا محال ہے

آزاد عظیم آبادی

غزل

از تازہ افادات مولانا محمد علی مدظلہٗ

گلہ اے دل، ابھی سے کرتا ہے؟
عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے؟

جان دیتا ہے عیشِ فانی پر
بس اسی زندگی پہ مرتا ہے؟

راحتِ جاوداں کو بھول گیا
کوئی دنیا میں یہ بھی کرتا ہے؟

عشق بن کر جیے تو جانا کہ جیے
زندہ وہ ہے جو اُس پہ مرتا ہے

نام پر اُس کے سب جوڑے بیٹھا
وہی اِک ہے جو نام کرتا ہے

وقتِ مومن ہے آزمائشِ عشق
اس میں پورا وہی اُترتا ہے

جس کو دنیا نے نامراد کہا
وہی ناکام کام کرتا ہے

ہے مسلماں کی بس یہی پہچان
کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے

قول مومن ہے اُس کے فعل کی شرح
وہ جو کہتا ہے کر گزرتا ہے

مطمئن رہ، دلا، وہ جانِ جہاں
وعدہ کرکے کہیں مکرتا ہے

میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ
یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے!

آج کر لو جو کر سکو، کل تک
کون جیتا ہے، کون مرتا ہے؟

قلزمِ عشق میں گرا سو گرا
اس کا ڈوبا کہیں اُبھرتا ہے؟

اس قدر احتیاط، اے صیاد!
کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے؟

وہی دن ہے ہماری عید کا دن
جو تری یاد میں گزرتا ہے

مے اسلام کا بھلا، جوہر!
نشہ چڑھ کر کہیں اترتا ہے؟

اگست ۱۹۲۲ء

غزل

(از مولانا حسرتؔ موہانی)

نظر اُس رُخ پہ ہے ادب کے خلاف
دل ہے اس فیصلہ میں سب کے خلاف

کچھ بھی ہم اُن سے کہہ سکے نہ کہیں
ناخوشیہائے بے سبب کے خلاف

شکرِ غم تابعِ خمار نہیں
مستیٔ بادۂ عنب کے خلاف

آج پر کیا وہ روز کرتے ہیں
بیرخیٔ وعدہائے شب کے خلاف

حُسنِ جاناں کے عہد میں حسرتؔ
شوق ٹھہرا ہی مادجب کے خلاف

تواریخ صلح لوزان کانفرنس

(نتائج فکر جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری اڈیٹر اخبار "سعید")

۱

(در صنعت زبر و بنیات غیر منقوط)

صلح کردہ بکمالِ کامل — عادل۔ محمود عصر و ہمدرد
حامد را کرد ملہم الہام — صلح حاصل مراد دل کرد

۱۳۴۱

۲

(در صنعت زبر بقاعدۂ معمولی غیر منقوط)

مالکِ ملک دو عالم کرد مسلم را عطا — صلح کامل، دارو درد دل و آرام دل
مصرع سالِ حصولِ صلح آمد در دلم — سرو۔ وسالار صالح کرد حاصل کام دل

۱۳۴۱

۳

(در صنعت زبر و بنیات بغیر صنعت غیر منقوط)

اے کمال اکملِ عصری لاریب — عادل و شیر دل و دریا دل
ناخنِ زیرکی و ہمت تو — حل کند عقدۂ کار مشکل
صلح در مجلسِ لوزان کردی — بحقیقت شدہ فتحے کامل
حامد اندر زبر و بنیہ گفت — کردہ فتح مبینے حاصل

۱۳۴۱

تاریخ رہائی مولانا محمد علی

(در صنعت زبر و بنیات)

آں محمد علی رہبرِ ہند — عزتِ قوم را علم بردار
کہ بر اسلام مسلماں کردہ — وقفِ مال و متاع و جاہ و وقار
ہم سرِ خویشتن بکف دارد — کہ کند بہرِ دینِ خویش نثار
چوں ز قیدِ فرنگ شد آزاد — گشت مسرور قلبِ حامدِ زار
گفت تاریخ بنیات و زُبُر — باشد آزاد سرورِ سالار

۱۹۲۳

شذرات

'مغربی تہذیب' کہیئے یا 'تمدن جدید' اس کے معائب و نقائص پر گزشتہ ربع صدی کے اندر مشرق میں بہت کچھ کہا اور لکھا جاچکا ہے اور اب تک بان و قلم اس تہذیب کی ہرزہ گوئی سے تھکے بھی نہیں۔ جنھوں نے مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا، ان کی نظر میں مغرب 'بیگانہ از دین مذہب' اور 'مادیت کا مجسمہ' نظر آیا۔ جنھوں نے اخلاقی عینک لگا کر اس تہذیب پر نظر ڈالی انھیں اس کا ہر ہر جزو 'مخرب اخلاق' دکھائی دیا۔ جنھوں نے اس کی معاشی زندگی کا مطالعہ کیا انھیں سرمایہ و مزدو یا ہم گردست و گریباں نظر آئے اور بعض نے اس کے سیاسی نظام کو دیکھا انھیں یہ تہذیب 'رو بہ زوال' اور 'اندر سے کھوکھلی' معلوم ہوئی۔ غرض جس نے جس پہلو سے دیکھا، اُسے یہ تہذیب اور نظام سرتاپا عیب ہی عیب نظر آیا اور مشرق یہ سُن سُن کر خوش ہو رہا تھا اور بعض بہی خواہانِ مشرق تو اس حد تک پہونچ گئے کہ زوال مغرب خود عروج مشرق ہے۔ لیکن شاید مشرق اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اطبائے مغرب ان امراض تہذیب کی تشخیص و علاج سے بھی غافل نہیں۔ ابھی حال میں جرمنی کے ایک فاضل مصنف نے "پان یوروپا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ حسرت کے ساتھ کہتا ہے:-

> "جہاں بقیہ دنیا دن بدن ترقی کر رہی ہے، یورپ رو بہ تنزل ہے، صرف اسی قدر کہہ دینا ایک تفصیل سے کم نہیں"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

> "گزشتہ عالمگیر جنگ نے یورپ کے ہر شخص کی سیاسی حالت بدل دی لیکن وہاں کے سیاسی نظام میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ آج بھی یورپ میں طوائف الملوکی، جبر و تعدی، بغض و عداوت، معاشی حیثیت سے اختلافات مراتب اور سیاسی

چالوں کا اسی طرح دار و مدار ہے جس طرح قبل از جنگ تھا۔ یورپ کی موجودہ پالیسی آیندہ کی بہ نسبت گزشتہ پالیسی سے زیادہ مشابہ ہے۔ یورپ تاریخ مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف کیے ہوئے ہے۔ ہمارے علمی بازار میں بھی تزک سوانح کی زیادہ زور ہے۔ عام مباحثے بھی زیادہ تر گزشتہ جنگ کے اسباب و علل پر ہوتے ہیں نہ کہ آیندہ جنگ کے انسداد پر۔

"یورپ کا ہمیشہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا ہی اس کے انحطاط اور اختلافات کا اصل باعث ہے۔ یہ اس کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ اسے بدلیں۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ قدیم یورپ کے باقی ماندہ نشانات پر جدید عمارت کھڑی کر دیں۔"

فاضل مصنف کے ان ارشادات میں کیا ہندوستان کے لیے کوئی سبق نہیں؟ ہے اور بہت کچھ ہے بشرطیکہ گوش دل سے سُنیں اور عمل کریں۔

———×———

لائق حکیم نے امراض اور ان کی تشخیص ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کا علاج بھی سوچا ہے۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ تمام یورپ اپنے اندرونی سیاسی و معاشی اختلافات کو مٹا کر ایک ہو جائے اور ایک دوسرے کی امداد و اعانت کے لیے تیار رہے۔ جو راہِ عمل وہ ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ "پان یوروپا" یعنی "اتحاد یورپ" کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"لوگ یہ سمجھیں گے کہ "پان یوروپا" ایک خیال ہے۔ یہ اعتراض ٹھیک نہیں۔ کوئی قانون قدرت اس کے لیے مانع نہیں .... ہر بڑے تاریخی کارنامے کی ابتدا "خیال" ہی سے ہوئی اور خاتمہ حقیقت پر ہوا ..... "پان یوروپا" (اتحاد یورپ) کا مستقبل زیادہ تر ان ابتدائی ہزار اشخاص پر منحصر ہے جو اپنے اعتقاد اور عزم سے لاکھوں کو اس کا قابل بنا دیں اور کل دگزشتہ) کے "خیال" کو کل (آیندہ) حقیقت کر دکھائیں۔ میں یورپ کے نوجوانوں سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس فرض کو

انجام دیں"

یہ سب سننے کے بعد ہم تو ان اطبا سے عرض کریں گے کہ آپ دیر میں پہنچے۔ زخم کہنہ ہو کر ناسور کی حد کو پہونچ گیا اور اس پر صحت کی امید۔

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

ایم امیل کوئی ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے ایک جدید طریقۂ علاج ایجاد کیا ہے اور ہزار ہا مریض ہر روز ان کے شفا خانے پر آتے ہیں اور بے دوا شفا پا کر چلے جاتے ہیں۔ وہ یہ کرتا ہے کہ مریضوں کو تیس تیس، چالیس چالیس کے گروہ بٹھا کر ان سے کہتا ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر خوب زور سے دبائیں یہاں تک کہ ہاتھ کانپنے لگتا ہے، پھر اس کے بعد ان سے یہ کہتا ہے کہ وہ خیال کریں کہ وہ اپنا ہاتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے اور پھر ان سے کہتا ہے کہ اب چھڑا لو لیکن وہ ناکام رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی انھیں یہ سمجھاتا ہے کہ جہاں تم نے یہ سمجھا کہ "میں یہ نہیں کر سکتا" تو اس وقت تمھارے لئے ہاتھوں کا چھڑانا ناممکن ہے۔ اس کے بعد مریض آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور وہ ان سے کہتا ہے کہ اپنے اپنے دلوں میں اطمینان رکھو۔ تمھارے تمام اعضا درست ہو گئے اور تم اب بالکل اچھے ہو گئے اور چلتے وقت ان سے یہ تاکید کر دیتا ہے کہ وہ صبح و شام بیس مرتبہ یہ کہیں کہ "میں ہر روز ہر نقطۂ نظر سے اچھا ہوتا جاتا ہوں"۔

بعض وقت جب درد کی شکایت ہوتی ہے تو انھیں یہ نسخہ بتایا جاتا ہے کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے یہ کہیں کہ "درد کم ہو رہا ہے، درد کم ہو رہا ہے" اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس علاج کی طرف زیادہ تر اناث کا طبقہ رجوع کرتا ہے اور جو لوگ اس شفا خانے میں آتے ہیں، وہ ڈاکٹر اور اس کے طریقہ علاج کی شہرت و اہمیت سے مرعوب ہو چکتے ہیں۔

یاد ہوگا قدیم ہندوستان میں اور آج بھی بیشتر قصبات و دیہات میں ہزارہا مریض ایک منتر یا معمولی دعا و تعویذ سے شفایاب ہو جاتے ہیں۔ بہت سے امراض ایسے ہیں جن کے علاج سے اکثر اطبا اور ڈاکٹر عاجز آجاتے ہیں لیکن کسی مقامی یا قریبی دیہات کے ایک معمولی شخص کی "چھو منتر" اور "جھاڑ پھونک" سے وہ مریض فوراً اچھے ہو جاتے ہیں۔ مغرب اور مغربی تہذیب کے مشرقی شیدائی اسے "توہم" اور "جہالت" سے تعبیر کریں گے اور حقارت کے ساتھ معالج اور معالجہ دونوں کو "قرن وسطیٰ" سے منسوب کریں گے۔ لیکن کوئی اور اس کے طریقۂ علاج کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ یہ ناآشنایانِ حقیقت اب تک ان معالجین اور ان کے طریقۂ علاج کے پیچھے پڑے تھے لیکن وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ یہ مرضا کے "اعتقاد" اور "یقین" کا نتیجہ تھا جس نے ان کو شفا بخشی۔ یا بعض ماہرین نفسیات کی اصطلاح میں یہ (Sub-Conscious Mind) کا اثر تھا۔

مشہور مصنفوں کی مشہور کتابیں
اور اردو زبان کی تازہ ترین مطبوعات
آسانی اور کفایت سے صرف مکتبہ جامعہ سے مل سکتی ہیں

المدینۃ والاسلام
(مترجمہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم)

یہ وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے جو بار بار شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔ اب تازہ اڈیشن پھر شائع ہوا ہے جو صرف مکتبہ جامعہ سے مل سکتا ہے۔ قیمت ۸

خواجہ عبدالحی صاحب کی تصانیف

خواجہ صاحب کی تصانیف میں تفسیر القرآن نے خاص مقبولیت حاصل کی ہے جس کے متعدد حصے شائع ہو چکے ہیں۔ کاغذ عمدہ، اور طباعت و کتابت نفیس ہے۔

لطائف الکبریٰ جو تمام تر سورۂ بقر کی تفسیر ہے غیر مجلد للعہ مجلد صہ

الصراط المستقیم سورۂ توبہ و انفال کی تفسیر ہے غیر مجلد عہ

بصائر حضرت موسیٰ و فرعون کے واقعات پر قصص قرآنی سے نہایت دلآویز تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۶

دیوانِ غالب

جس کو نظم اردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اسی طرح جو دو حسن
ہم نے غالب کو تمام ہے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہے اس کے متعلق بلا خوف
تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اردو زبان میں آج تک کوئی کتاب
طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سرخ جلد پر سنہرا کام ہے اندر مرزا صاحب کی
رنگین تصویر ہے اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے
بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دئیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود
مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جو شروع میں درج ہے اس اڈیشن کی
مقبولیت کی یہ حالت ہے ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہنچ سکے
بہرحال درخواست خریداری بھیج دیجئے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور
اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن میں یاد رہے نہ قیمت صرف تین روپیہ

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

[illegible]

فہرست مضامین

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | ماہ جمادی الاول ۱۳۴۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۳ء | نمبر ۶

تاریخ تصوف کا ایک ورق

کشف المحجوب

شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ

(بسلسلہ اشاعت گزشتہ)

مخدوم موصوف علیہ الرحمۃ کے مرتبہ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہے۔ خواجۂ خواجگان حضرت [معی]ن الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جیسے مسلّم اکابر نے آپ کے [مز]ار پر چلّے کھینچے ہیں، اور فیوض و برکات حاصل کیے ہیں چنانچہ دونوں حضرات کے مکانات چلہ کشی [اب تک مو]جود و محفوظ ہیں۔ ملا جامی ان الفاظ میں تصنیف و مصنف کی جلالت قدر کا اعتراف کرتے ہیں:-

"عالم و عارف بودہ ۔ ۔۔ و بہ صحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است، صاحب کتاب

کشف المحجوب است، کہ از کتب معتبرہ مشہورہ دریں فن است و لطائف و حقائق بسیار درآں کتاب جمع کردہ است[۵۱]

شہزادہ داراشکوہ کے نزدیک فارسی زبان میں تصوف پر کوئی کتاب کشف المحجوب کے ٹکر کی نہیں:-

"خانوادۂ ایشان خانوادۂ زہد و تقویٰ بودہ، و حضرت پیر علی ہجویری را تصنیف بسیار است۔ اما کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچکس را برآں سخن نیست و مرشدے است کامل۔ در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبان فارسی تصنیف نہ شدہ۔ و خوارق و کرامات زیادہ از حد و نہایت و بارہا بر قدم تجرید و توکل سفر کردہ اند" [۵۲]

سب سے بڑھ کر قابل استناد و قابل افتخار قول حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کا ہے آپ کا ارشاد تھا، کہ "جس کا کوئی مرشد نہ ہو، اس کو کشف المحجوب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا۔" ایک غیر مطبوع ملفوظ "دُررِ نظامی" میں ہے:-

"می فرمودند کشف المحجوب از تصنیف شیخ علی ہجویری قدس اللہ اگر کسے را پیرے نہ باشد چوں ایں کتاب را مطالعہ کند او را پیدا (؟) شود .. .. من ایں کتاب را بہ تمام مطالعہ کردہ ام [۵۳]

مخدوم موصوف کی اس کرامت کا ذکر متعدد تذکروں میں ہے، کہ لاہور میں آپ نے جو مسجد تعمیر کرائی تھی، اُس کی محراب میں بمقابلہ دوسرے مساجد کے، سمت جنوب میں ذرا کجی تھی۔ علماء وقت نے اعتراض کیا، کہ سمت قبلہ نہیں رہی۔ آپ نے ایک روز سب کو جمع کر کے خود نماز پڑھائی، اُس کے بعد حاضرین سے کہا کہ "خود دیکھ لو، کعبہ کدھر ہے۔" حجابات اُٹھ گئے۔ سب نے دیکھا کہ کعبہ مسجد کے ٹھیک مقابل ہے۔

---

[۵۱] نفحات الانس جامی ص۳۰۸ (مطبوعہ کلکتہ) [۵۲] سفینۃ الاولیاء، داراشکوہ ص۱۶۴
[۵۳] دُررِ نظامی، مرتبہ شیخ علی محمود جاندار۔ نسخہ قلمی

(۲) تصنیف

کشف المحجوب تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں ہے، اور فارسی زبان میں تو اس سے قدیم تر کوئی کتاب تصوف پر دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنی متعدد ابتدائی کتابوں اور اپنی سکونت لاہور کا ذکر کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف آخر عمر میں فرمائی ہے، یعنی پانچویں صدی ہجری کے وسط میں۔ اسی کتاب کے تقریباً ہمعصر شیخ ابوالقاسم قشیری کا عربی رسالہ قشیریہ ہے۔ موضوع اس کا بھی تصوف ہی ہے لیکن دونوں کی طرز تصنیف میں فرق یہ ہے۔ کہ امام موصوف نے زیادہ تر متقدمین کے اقوال و حکایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے، بہ خلاف اس کے مخدوم ہجویری ایک محققانہ و مجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات و مجاہدات وغیرہ کو بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں، اور مباحث سلوک پر رد و قدح کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ ان کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعہ حکایات و روایات کی نہیں، بلکہ ایک مستند تصنیف کی ہے۔ صورت تصنیف یہ ہے کہ کوئی صاحب ابوسعید نامی فرضی یا واقعی سائل ہیں۔ انھوں نے حضرت مخدوم کی خدمت میں عرض کی ہے کہ

"بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت تصوف و کیفیت مقامات ایشان و بیان مذاہب و مقالات آن و اظہار کن مرا رموز و اشارات ایشان و چگونگی محبت خدای عزوجل و کیفیت اظہار آن بر دلہا و سبب حجاب عقول از کنہ ماہیت آں و نفرت نفس از حقیقت آں و آرام روح با صفوت آں و آنچہ بدیں تعلق دارد از معاملت آں" (ص ۶)

ساری کتاب اسی سوال کا جواب، اور انھیں مراتب کی تفصیل ہے۔

مضامین تصانیف کے سرقہ میں، معلوم ہوتا ہے، اس وقت کے لوگ بہت جری و بیباک تھے۔ مصنف رح کو دو بار ان لوگوں کے ہاتھوں تلخ تجربات ہو چکے تھے۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے مسودہ دیوان مصنف سے مستعار لیا، اور واپس کرنے کے بجائے اپنے نام و تخلص کے ساتھ اس کی اشاعت شروع کر دی۔ دوسری بار یہ اتفاق ہوا کہ ان کی ایک تصنیف فن سلوک

میں منہاج الدین کے نام سے تھی۔ اُسے کوئی شخص اُڑا لے گیا، اُن کا نام کاٹ کر عنوان پر اپنا نام لکھ دیا اور اُس کی تصنیف کو اپنی جانب منسوب کرنا شروع کر دیا۔ کشف المحجوب کی تصنیف ان تصنیفات کے بعد کی ہے۔ اُس کے آغاز میں اسم مصنف کی تصریح ضروری تھی۔ ان حالات کا ذکر ابتدای سخن میں خود ہی فرمایا ہے:۔

"بحر اندر ابتدائے کتاب نام خود ثبت کردم مراد اندر آں دو چیز بود، یکے نصیب خاص و دیگر نصیب عام۔ و آنچہ نصیب عام بود آن ست کہ چوں جہلاء ایں علم کتابے بینند نو کہ مصنف آں بہ چند جاے ثبت نہ باشد نسبت آں کتاب بہ خود کنند، و مقصود مصنف از آں بر نیاید کہ مراد از جمع و تالیف و تصنیف کردن بجز آں نہ باشد کہ نام مصنف بداں کتاب زندہ باشد، و خوانندگاں و متعلماں وے را دعائے نیکو کنند، کہ مرا ازیں حادثہ افتاد بدو بار۔ یکے آنکہ دیوان شعرم کسے بخواست و باز گرفت و اصل نسخہ جز آں نبود۔ آں جملہ را بہ گردانید و نام من از سر آں بیفگند و رنج من ضائع گردانید تاب اللہ علیہ۔ و دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف عمرہ اللہ نام آں منہاج الدین۔ یکے از مدعیاں رکیک کہ گراں گفتار نام او نکنند، نام من در سر آں پاک کرد، و نیز دیک عوام چناں نمود کہ آں وے کردہ است، ہر چند خواص برآں قول وے خندیدندے تا خداوند تعالیٰ بے برکتی آں بدو رسانید، نامش از دیوان طلاب درگاہ خود پاک گردانید" (ص۲)

اِس سرقے سے اتنا خائف تھے کہ اسی ایک تصریح پر اکتفا نہیں کی ہے، بلکہ درمیان کتاب میں بار بار اپنے پورے نام کی تصریح فرماتے گئے ہیں۔

لاہور کا جو مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، اُس کا ہر صفحہ اغلاط طبع و کتابت سے لبریز ہے۔ بعض مقامات پر عبارت بے معنی ہو گئی ہے۔ بعض مقامات پر حضرت مصنف کے بالکل خلاف منشا معنی نکلتے ہیں، اور اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے، کہ اکثر مقامات پر اسما راشخاص مواضع بالکل مسخ ہو گئے ہیں۔

دوسرا تکلیف دہ امر پیش نظر نسخہ میں یہ ہے کہ کسی قسم کی فہرست مضامین وغیرہ درج نہیں۔ کتاب

متعدد ابواب فصول میں منقسم ہی۔ ہر باب فصل کے الگ الگ پیراگراف (بند) ہیں لیکن کاتب صاحب نے یا ای بسم اللہ سے لے کر تا ے تمت تک ۲۲۸ صفحہ کی کتاب کا یکساں قلم رکھا ہی۔ نہ کہیں کوئی پیراگراف (بند) توڑا ہی، نہ ایک باب فصل کے اختتام اور دوسرے کے آغاز کو کوئی نمایاں امتیاز دیا ہی۔ راقم مضمون نے بطورِ خود ایک فہرست مضامین اور بعض دوسری فہرستیں مرتب کی ہیں۔ جن سے ناظرین کو مطالعہ کتاب میں شاید کچھ سہولتیں حاصل ہو سکیں۔

شروع کے چھ صفحہ (ص۱-۶) بہ طور مقدمہ یا تمہید کے ہیں۔ جس میں سبب تالیف، موضوع سخن، وغیرہ کی تصریح ہی۔ اس کے بعد ترتیب مضامین حسب ذیل ہی:-

(۱) باب الاول فی اثبات العلم (ص۷-۱۴) اس میں علم کی ماہیت، اُس کے فضائل اور اُس کے اقسام کا بیان ہی۔ مشہور صوفی حاتم اصم کا قول نقل کیا ہی کہ تمام علوم میں سے

حاتم الاصم گفت رضی اللہ عنہ کہ چار علم اختیار کردم، و از ہمہ علمہاے عالم برستم۔ .. .. یکے آنکہ بدانستم کہ مرا رزقی ست مقسوم کہ زیادت و کم نہ شود، از طلب زیادت برآسودم و دیگر آنکہ بدانستم کہ خدای را بر من حقے ست کہ جز من کسے دیگر نہ تواند گزارد، بہ ادای آں مشغول گشتم۔ سہ دیگر آنکہ دانستم کہ مرا طالبے ست یعنی مرگ کہ از و نتوانم گریخت آں را بسازیدم؟ چہارم آنکہ دانستم مرا خداوندے ست مطلع بر من از وے شرم داشتم و از ناکردنی دست باز داشتم (ص۱۰)

چار چیزوں کا علم میں نے اختیار کر لیا ہی، اور باقی کی حاجت نہیں رہی۔ .. .. اول یہ کہ رزق کی ایک مقدار مقسوم ہی، جس میں کمی و بیشی نہیں ہو سکتی اس لیئے اس میں اضافہ کی فکر سے نجات پا گیا ہوں دوسرے یہ کہ خدا کی جانب سے میرے اوپر جو حقوق عاید ہیں اُن کی بجاآوری میرے ہی ذمہ فرض ہی، اس لیئے اُن کی ادائی میں مصروف رہتا ہوں تیسرے یہ کہ میرے تعاقب میں موت لگی ہوئی ہی جس سے کسی طرح گریز ممکن نہیں، اس لیئے اُس سے ملنے کی طیاری کرتا رہتا ہوں۔ چوتھے یہ علم ہی، کہ خدا میرے حال کو دیکھتا رہتا ہی اس سے شرم کرتا ہوں۔ اور ممنوعات سے بچتا رہتا ہوں۔

علم صحیح کے لیئے علم ظاہر (شریعت) و علم باطن (حقیقت) کی جامعیت ضروری ہی صرف

ایک کا وجود طالب کے لیئے مضر ہوگا۔

ظاہر ورزش معاملت و باطنش تصحیح نیت۔ و قیام ہر ایک زیں بے دیگرے محال باشد ظاہر بے حقیقت باطن نفاق بود و باطن بے ظاہر زندقہ۔ و ظاہر شریعت بے باطن نقص بود و باطن بے ظاہر ہوس۔ پس علم حقیقت را سہ رکن است یکے علم بذات خداوند تعالے و وحدانیت وے و نفی تشبیہ از وے، و دیگر علوم بہ صفات خداوند تعالیٰ و احکام آں، و سہ دیگر علم بہ افعال و حکمت وے و علم شریعت را نیز سہ رکن است یکے کتاب۔ دیگر سنت و سہ دیگر اجماع امت (ص۱)

... . ظاہر بغیر امتزاج باطن کے نفاق ہے اور باطن بغیر امتزاج ظاہر کے زندقہ۔ شریعت بلا حقیقت نقص ہے اور حقیقت بلا شریعت ہوس علم حقیقت کے تین ارکان ہیں۔ علم ذات و توحید و نفی تشبیہ خداوندی۔ علم صفات خداوندی و علم افعال و حکمت افعال خداوندی۔ اسی طرح علم شریعت کے بھی یہ تین رکن ہیں۔ قرآن۔ سنت رسول و اجماع امت

علم ذات خداوندی کی تعلیم اس قسم کی آیات قرآنی میں بہ کثرت ملتی ہے:۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰكُمْ ۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۔ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ

نیز اس قسم کی احادیث نبویؐ میں کہ مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى رَبُّهٗ وَاَنِّيْ نَبِيُّهٗ حَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَحْمَهٗ وَدَمَهٗ عَلَى النَّارِ ۔

علم صفات خداوندی کی جانب رہبری اس قسم کی آیات قرآنی کرتی ہیں۔ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۔ هُوَ الْحَيُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ وقس علی ہذا۔

علم افعال خداوندی کی بابتہ اس قسم کی آیات قرآنی میں اشارہ ہے۔ واللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ و قس علیٰ ہذا۔

علم شریعت کے رکن اول کتاب اللہ سے اعتصام کی دلیل یہ ارشاد حق تعالیٰ ہے فِیْہِ آیَاتٌ مُحْکَمَاتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتَاب۔ رکن دوم سنت نبوی کی شاہد عدل یہ فرمان ربانی ہے۔ وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ رکن سوم اجماع امت کی دستاویز استناد یہ ارشاد حضرت رسالتؐ ہے۔ لَا یَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ۔

علم بہ شمول علم شریعت کی اہمیت پر جتنا زور دیا ہے اُس کا مزید اندازہ اقتباس ذیل سے بھی ہوگا:۔

محمد بن فضل البلخی گوید رحمۃ اللہ علیہ۔ اَلْعُلُوْمُ ثَلٰثَۃٌ عِلْمٌ مِنَ اللّٰہِ۔ وَعِلْمٌ مَعَ اللّٰہِ وَعِلْمٌ بِاللّٰہِ علم باللہ علم معرفت بود کہ ہمہ انبیاء و اولیاء او را بدو دانستہ اند و تا تعریف و تعرف وے نبود ایشان وے را ندانستند۔ ... و علم من اللہ علم شریعت بود کہ آں از وے بما فرمان و تکلیف است و علم مع اللہ علم مقامات و طریق حق و بیان درجات اولیاست۔ پس معرفت بے پذیرفت شریعت درست نیاید و ورزش شریعت بے اظہار مقامات راست نیاید ہر کرا علم معرفت نیست دلش بجہل مردہ است و ہر کرا علم شریعت نیست دلش بہ نادانی بیمار است (ص ۱۲)

محمد بن فضل بلخیؒ کہتے ہیں کہ علم کی تین قسمیں ہیں۔ عِلْم من اللہ۔ علم مع اللہ اور عِلْم باللہ۔ علم باللہ علم معرفت ہے کہ انبیاء و اولیاء نے اسی ذریعہ سے معرفت باری حاصل کی ہے اور بغیر اس کے انھیں معرفت باری حاصل نہ ہوسکی (یہ علم الکتاب سے نہیں آتا) علم من اللہ علم شریعت ہے یعنی احکام الٰہی و فرائض عبدیت کا علم۔ علم مع اللہ علم مقامات طریقت و درجات اولیاء کا نام ہے۔ معرفت بغیر علم شریعت کے قبول کیے درست نہیں ہوسکتی اور شریعت پر عمل بغیر مقامات کے ممکن نہیں۔ جس کو علم معرفت نہیں اُس کے قلب پر جہل کی موت طاری ہے اور جسے علم شریعت نہیں اُس کا قلب مرض نادانی میں گرفتار ہے۔

اسی تعلیم کی تائید میں بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ "میں نے تیس سال تک مجاہدات کیے لیکن کسی مجاہدہ کو علم و تحصیلِ علم سے صعب تر نہیں پایا" (عَمِلتُ فِی المُجَاہَدَۃِ ثَلٰثِینَ سَنَۃً فَمَا وَجَدتُ شَیئًا اَشَدَّ عَلَیَّ مِنَ العِلمِ وَمُتَابَعَتِہٖ)

اور خود مرشد ہجویریؒ کا بیان ہے کہ طبعِ انسانی کے لیے آگ پر چلنا راہِ علم پر چلنے سے آسان تر ہے، اور ایک جاہل کے لیے پل صراط پر ہزار بار گزرنا اس سے آسان ہے کہ علم کا ایک مسئلہ حل کرے" (ص ۱۴)

(۲) بابُ الثانی فی الفقر (ص ۱۴ تا ۲۲) اس باب میں فضائلِ فقر و مسکنت کا بیان ہے فضائلِ فقر میں متعدد آیاتِ قرآنی وارد ہیں، مثلاً لِلفُقَرَاءِ الَّذِینَ اُحصِرُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ لَا یَستَطِیعُونَ ضَربًا فِی الاَرضِ یَحسَبُہُمُ الجَاہِلُ اَغنِیَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (بقرہ ع) یا یہ مثلاً تَتَجَافٰی جُنُوبُہُم عَنِ المَضَاجِعِ یَدعُونَ رَبَّہُم خَوفًا وَّطَمَعًا۔ (سورہ سجدہ)

احادیثِ نبوی میں بھی بہ کثرت فضائلِ فقر بیان ہوئے ہیں۔ سرورِ کائناتؐ خود اپنے متعلق دعا میں یہ آرزو کرتے ہیں کہ "اے پروردگار مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکین بنا کر وفات دے اور حشر میں زمرۂ مساکین میں اٹھا" اور ایک حدیث میں آتا ہے، کہ قیامت کے روز ارشادِ باری تعالیٰ ہوگا کہ میرے دوستوں کو حاضر کرو۔ فرشتہ عرض کریں گے، کہ "تیرے دوست کون ہیں"؟ جواب ملے گا کہ "فقرا و مساکین" (اُدْنُوا مِنِّی اَحِبَّائِی فَیَقُولُ المَلٰئِکَۃُ مَنْ اَحِبَّائُکَ؟ فَیَقُولُ اللّٰہُ فُقَرَاءُ وَالمَسَاکِینُ) عہدِ رسالت میں فقرا و مہاجرین تھے جو مسجدِ نبویؐ میں تمام اسبابِ دنیوی سے قطع نظر کر کے محض عبادتِ الٰہی کے لیے بیٹھ جاتے تھے، اور اپنی روزی کے لیے محض مسبب الاسباب پر تکیہ و توکل رکھتے تھے اُن کی خبر گیری اور اُن کی رفاقت کے لیے خود رسول اللہ صلعم کو بارگاہِ ربُّ العزت سے تاکید ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا تَطرُدِ الَّذِینَ یَدعُونَ رَبَّہُم بِالغَدٰوۃِ وَالعَشِیِّ یُرِیدُونَ وَجہَہٗ۔ اور ایک دوسرے مقام پر فرمان ملتا ہے۔ وَلَا تَعدُ عَینٰکَ

عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا - اِن تاکیدی احکام نے اُن فقراء و مہاجرین کو اس رتبہ پر پہونچا دیا تھا کہ سرورِ کونین جہاں کہیں اُنھیں دیکھ لیتے، تو ارشاد فرماتے "میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، کہ خدا نے تمھارے حق میں مجھ پر عتاب کیا" (ص ۱۴-۱۵)

صفحاتِ مابعد میں فقر کی حقیقت و آداب پر بحث کی ہے، اور غنا کے مقابلہ میں اس کی فضیلت بہ دلیل ثابت کی ہے۔

۳- **الباب الثالث فی التصوف** (ص ۲۲-۳۱) تیسرا باب ماہیت تصوف پر ہے۔

حضرت مصنف، حسب عادت، اس باب کا بھی آغاز قول خدا اور قول رسول سے کرتے ہیں۔ چنانچہ کلام الٰہی میں اُنھیں یہ آیت ملتی ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا - اور احادیث میں سے اس کو پیش کرتے ہیں۔ مَنْ سَمِعَ صَوْتَ اَهْلِ التَّصَوُّفِ فَلَا يُؤْمِنُ عَلٰى دُعَائِهِمْ كُتِبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْغَافِلِيْنَ

اس کے آگے مصنف کتاب اللمع کی طرح، اُنھوں نے بھی تفصیلی بحث لفظ "صوفی" اور اُس کے اشتقاق پر کی ہے۔ لفظ 'صوفی' کی تحقیق میں مختلف مذاہب ہیں۔ ایک گروہ

مردمان اندر تحقیق این اسم بسیار سخن گفته اند و کتب ساخته۔ وگروہے از آں گفته اند که که صوفی را برای آں صوفی خوانده اند که جامهٔ صوف دارد۔ وگروہے گفته اند که صوفی را از برائے آں صوفی خوانند که از صفِ اول باشد وگروہے گفته اند که بداں صوفی گویند که تولی به اصحاب صفه رضی اللہ عنہم کرده اند۔ و گروہے گفته اند که این اسم از صفا مشتق است وہر کسے را اندریں معنی اندر تحقیق این طریقت

کے نزدیک، چونکہ یہ لوگ جامہ صوف میں ملبوس رہتے تھے، اس لیے صوفی کہلائے۔ بعض کا خیال ہے، کہ لفظ صوفی کا ماخذ صفِ اول ہے یہ حضرات چونکہ صف اول میں رہتے تھے۔ اس لیے صوفی کے لقب سے موسوم ہوئے۔ ایک گروہ کا مسلک ہے کہ صوفی، اصحاب صفہ سے مشتق ہے۔ اور ایک جماعت، اس لفظ کا اشتقاق لفظ 'صفا' سے بتاتی ہے۔ اور ہر گروہ اپنی تائید میں دلائل و شواہد لاتا ہے، لیکن لغت سے کسی قول کی بھی

لطایف بسیار است۔ اما بمقتضائے لغت ازیں معانی بعید می باشد (ص۲۲)	تائید نہیں ہوتی۔

شیخؒ کے نزدیک "صوفی" وہ ہے جس کا قلب "صفا" سے لبریز ہے۔ اور "کدر" (گندگی) سے خالی۔ اور اس مرتبہ تک کاملان ولایت ہی پہونچ سکتے ہیں:۔

""صفا ضد کدر بود، و کدر صفت بشر بود، و حقیقت صوفی بود، آنکہ او را از کدر گزر بود" (ص۲۳) "صوفی نامے ست کہ مر کاملان ولایت را و محققان اولیا را بدیں نام خوانند و خواندہ اند" (ص۲۵)

چنانچہ متقدمین مشایخ طریقت میں سے ایک بزرگ کا قول ہے کہ

مَنْ صَفَاهُ الْحُبُّ فَهُوَ صَافٍ وَمَنْ صَفَاهُ الْحَبِيبُ فَهُوَ صُوفِيٌّ (ص۲۵)	جس کو محبت صاف کردے اسی پر "صاف" کا اطلاق ہوگا، اور جسے محبوب اپنے لیے صاف کرلے اسے صوفی سے موسوم کریں گے۔

اہل تصوف کے تین درجے ہیں۔ صوفی، متصوف، اور مستصوف۔ تینوں کی تعریف شیخ ہی کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے:۔

"صوفی آں بود کہ از خود فانی بود و بحق باقی و از قبضۂ طبایع رستہ و بحقیقت پیوستہ و متصوف آنکہ بہ مجاہدہ ایں درجہ را ہمی طلبد و اندر طلب خود را بر معاملت ایشاں درست ہمی کند۔ و مستصوف آنکہ از برائے مال و منال و جاہ و حظ دنیا خود را مانند ایشاں کردہ و ازیں ہر دو چیز ہیچ خبر ندارد، تا حدے کہ گفتہ اند اَلْمُسْتَصْوِفُ عِنْدَ الصُّوْفِیَّۃِ کَالذُّبَابِ وعند غیرہم کالذیاب۔ مستصوف بہ نزدیک صوفی از حقیری چوں مگس بود آنچہ کند نزدیک وے ہوس بود و نزدیک دیگراں چوں گرگ بے افسار بود کہ ہمہ ہمتش لختے مردار بود" (ص۲۵)

صوفی صاحب وصول ہوتا ہے کہ اُسے وصل مقصود حاصل ہو چکا ہے۔ متصوف صاحب اصول

ہوتا ہے کہ اصل پر قائم رہ کر احوالِ طریقت میں مشغول رہتا ہے، مستصوف صاحبِ فضول ہوتا ہے، جس کی قسمت میں حقیقت سے محجوبی اور معانی سے محرومی ہے (ص ۲۵-۲۶)

بعض صوفیۂ متقدمین نے 'صوفی' و 'تصوف' کی جو تعریفات بیان کی ہیں، شیخ نے انھیں بھی سنداً پیش کیا ہے (ص ۲۶-۲۹) مثلاً

(١) الصوفی اذا نطق بانَ نطقُهُ عن الحقائق وان سکت نطقت عنه الجوارح بقطع العلائق (ذوالنون مصری)	حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے کہ جب گفتار میں آتا ہے تو اس کی زبان اس سے حقیقت حال کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اور جب خاموش رہتا ہے تو اس کے اعضا شہادت دیتے ہیں کہ وہ علائق کو قطع کر چکا ہے۔
(٢) التصوف نعت اُقیم العبد فیه قیل انعت للعبد ام للحق فقال نعت الحق حقیقةً ونعت العبد رسماً (جنید بغدادیؒ)	حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشاد ہے کہ تصوف نام اس صفت کا ہے جس میں بندے کی اقامت ہو۔ لوگوں نے پوچھا: یہ صفت بندے کی ہے یا حق کی؟ جواب دیا کہ حقیقۃً وہ صفت حق کی ہے، بظاہر بندہ کی ہے۔
(٣) التصوف ترک کل حظ للنفس (ابوالحسن نوری)	حضرت ابوالحسن نوری کا قول ہے کہ تصوف تمام حظوظ نفس کے ترک کا نام ہے۔
(٤) الصوفیة هم الذین صفت ارواحهم فصاروا فی الصف الاول بین یدی الحق. (ایضاً)	انھیں بزرگ کا یہ قول بھی ہے کہ صوفی وہ لوگ ہیں جن کی ارواح آلائشوں سے پاک ہو چکی ہیں اور وہ رب العزت کے حضور میں صف اول میں حاضر ہیں۔
(٥) الصوفی الذی لا یملک ولا یُملک (ایضاً)	انھیں بزرگ سے یہ بھی منقول ہے کہ صوفی

وہ ہے، جو نہ خود کسی کا مالک ہو اور نہ کوئی اس کا مالک ہو۔

(۶) التصوف رؤیة الکون بعین النقص بل غضّ الطرف عن الکون
(ابو عمرو دمشقی)

ابو عمرو دمشقیؒ ارشاد کرتے ہیں کہ تصوف نام ہے کائنات کی جانب نگاہ عیب جوئی سے دیکھنے کا، بلکہ سرے سے نہ دیکھنے کا۔

(۷) التَّصَوُّفُ شِرْکٌ لِاَنَّہٗ صیانة القلب عن رُؤیة الغیر و لا غیر
(ابوبکر شبلی)

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف ایک طرح کا شرک ہے۔ اس لئے کہ یہ نام ہے قلب کو غیر سے محفوظ رکھنے کا، درآنحالیکہ "غیر" کا سرے سے وجود نہیں۔

(۸) التَّصَوُّف صَفَاءُ السِّرِّ من کدورة المخالفة
(حصری)

شیخ حصریؒ کا مقولہ ہے کہ تصوف نام ہے قلب کو مخالفت حق کی کدورت سے پاک رکھنے کا۔

(۹) الصوفی لا یری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ
(شبلی)

شبلیؒ سے یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ صوفی دونوں جہان میں بجز خدا کے کسی کو نہیں دیکھتا۔

(۱۰) التصوف اسقاط الرؤیة للحق ظاہراً و باطناً
(علی بن نیشاپوری)

شیخ علی بن نیشاپوریؒ کا ارشاد ہے کہ تصوف یہ ہے کہ صوفی کو اپنا ظاہر و باطن نظر نہ آئے۔ سب حق ہی حق نظر آئے۔

اسی باب میں اہل تصوف کے مزید خصوصیات۔ اُن کے معاملات اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی کو بیان کیا ہے۔

دولت گپتا

دولت گپتا ۱- تیسری صدی عیسوی کے تاریک اور نامعلوم دور کے بعد شمالی ہند پھر ایک زبردست حکومت کے زیر سایہ متحد اور متفق نظر آتا ہے۔ جس کا دارالامارۃ ہندی روم یعنی پاٹلی پتر میں تھا۔ یہ حکومت تاریخ میں دولت گپتا کے نام سے مشہور ہے۔ ہندی ادب۔ حکمت اور فنون لطیفہ کے ساتھ سلطنت گپتا کا نام ابدالآباد تک زندہ رہے گا۔ شاہان گپتا کا دور تاریخ ہند کا بہترین زمانہ تھا۔ اس دور حکومت جگ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا۔

مگدھ کا دوبارہ عروج ۲- والی (ریاست) مگدھ چندر گپت کا عقد لیکاوی قبیلہ میں ہوا تھا۔ چندر گپت کے نسب کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ بجز اس کے ہم کچھ نہیں جانتے کہ چندر گپت گھالوٹ کلھا کا لڑکا تھا۔ گھالوٹ کے باپ کا نام گپتا تھا۔ لیکاوی قبیلہ کی قرابت نے اس غیر معروف والی ریاست کو ہندوستان کی سیاسی دنیا میں زبردست بادشاہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ چندر گپت معمولی آدمی نہ تھا۔ موقع پاتے ہی ایک معمولی ریاست کو سلطنت کے درجہ پر پہونچا دیا۔ اسی کے ایسے بلند دماغ راجہ کا کام تھا۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ لیکاوی قبیلہ کی قرابت نے اس کی قوت کو عالمگیر بنا دیا ہے۔ اس لیے اس کے سکوں پر لیکاوی شاہزادی کا نام اس کے نام کے ساتھ نظر آتا ہے۔ سکوں پر راجہ اور رانی کا نام ایک ساتھ دیکھ کر عہد گپتا میں طبقہ نسواں کی منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۳۲۱ء میں چندر گپت نے مہاراج دیسراج کا لقب اختیار کیا۔ اس مبارک تقریب کی یادگار میں گپتا سنہ تاریخ کی ابتدا کی گئی۔ یہ سنہ عرصہ دراز تک ہندوستان میں رائج رہا۔ چندر گپت کی سلطنت کے حدود صحت کے ساتھ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن گمان غالب ہے کہ شمالی ہند کا بیشتر حصہ اس کے تحت میں آچکا تھا۔

سمدر گپت ۳- چندر گپت کے بعد اس کا بیٹا سمدر گپت تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔

اسے ایک متبحر مورخ نے جو صفات کے صحیح استعمال سے اتنا نہیں معلوم ہوتا ہندی نپولین
کا لقب دیا ہی۔ بادشاہ ہونے میں سمندرگپت نے شہنشاہی پر کمر باندھی۔ اس منصوبہ کی انجام
دہی کے لیئے پہلے شمالی ہند اور پھر جنوبی ہند کی تسخیر ضروری تھی۔ سمندرگپت کا سوانح نگار سری ہیں
اُن ریاستوں کے نام گنا تا ہی جو اس الوالعزم بادشاہ کے ہاتھ پر فتح ہوئی تھیں۔ شمالی ہند
سے فارغ ہو کر سمندرگپت نے جنوب کی طرف رخ کیا۔ اور ایسا عجیب غریب دھاوا مارا کہ بہت کم
عرصہ میں جنوبی جزیرہ نما کی انتہائی حد پر پہنچ گیا۔ غالباً کالیداس کے دماغ میں جب اس نے
"رگھو کے گھرمیں" تصنیف کیا ہی سمندرگپت کے کارنامے ضرور ہوں گے۔ کالیداس کا سمندرگپت
کے عہد میں ہونا تقریباً یقینی ہی۔ دکن پر فوج کشی کرنے سے سمندرگپت کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ جنوبی
ریاستوں کو مٹا کر قلمرو مگدھ میں شامل کرے۔ وہ صرف اپنی عظمت و جلالت کا سکہ پورے ملک
میں جمانا چاہتا تھا۔ سمندرگپت کا عجیب غریب دھاوا جو پاٹلی پتر سے دکن کے مشہور شہر کانجی پورم
پر اور کانجی پورم سے مہاراشٹر اپر کچھ ہی دنوں میں انجام دیا گیا تھا۔ دنیا کے قابل ذکر کارناموں
میں شمار کیے جانے کا مستحق ہی۔ اس فوجی نقل و حرکت کی تمثیل ہنیبل اور نپولین اعظم کے ہاں
مل سکتی ہی لیکن ان میں اور سمندرگپت میں اتنا فرق ہی کہ سمندرگپت ان دونوں سے زیادہ کامیاب رہا۔

سمندرگپت کی حکومت کے حدود اربعہ

۴۔ سمندرگپت کی سلطنت کے حدود اربع حسب ذیل قرار دیئے جا سکتے ہیں
شمال میں کوہ ہمالیہ جنوب میں کوہ وندھیا مشرق میں دریائے برہمپتر
اور مغرب میں دریائے سندھ اُس کی سلطنت میں گجرات۔ مالوہ اور دوآب کے علاقے شامل
تھے شمالی ہند پورا اس کے قبضہ میں تھا اور جنوبی ہند کے راجہ اُسے شہنشاہ تسلیم کرتے تھے
اُس کی عظمت ایران کے بادشاہوں کے ہم پلہ ہو چکی تھی۔ شاہان پیشین کی تقلید میں اس نے
اسوامیدھا (گھوڑے کی قربانی) کی رسم ادا کی تھی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہندوستان
میں اُس کی برابر کوئی دوسرا راجہ نہیں ہی اس تقریب کی شہادتیں اُس کے شاعر سوانح نگار
کی تصنیفات میں۔ سکوں میں اور ایک سنگی گھوڑے کی شکل میں جس پر حسب موقع عبارت کندہ

ہے۔ موجود ہیں یہ گھوڑا لکھنؤ کے عجائب خانہ میں تماشہ گاہ خلائق ہے۔

ممالک غیر سے سمدر گپت کے تعلقات

۵۔ آس پاس کی ہمعصر سلطنتوں سے جو ہندوستان کی جغرافوی حد سے باہر تھیں سمدر گپت کے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ لنکا کے راجہ میگھا ورندنے اس کے پاس سفیر بھیجکر لنکا کے بدھ یاتریوں کے لئے خانقاہ بنوانے کی اجازت طلب کی تھی۔ چینی اس خانقاہ کی عمارت نہایت شاندار تھی اور جب چینی سیاح ہیونتسیانگ ہندوستان دیکھنے کی غرض سے آیا ہے یہ خانقاہ موجود تھی۔ کابل و وسط ایشیا کے بادشاہوں سے بھی سمدر گپت کے سیاسی تعلقات دوستانہ تھے۔

سمدر گپت رزم و بزم دونوں کا مرد میدان تھا

۶۔ سمدر گپت رزم و بزم دونوں کا مرد میدان تھا وہ خود شاعر تھا موسیقی میں اُسے خاص مہارت تھی اور اہل علم کا سرپرست تھا بعض سکوں میں وہ تخت پر بیٹھا ہوا بین بجاتا دکھایا گیا ہے ایسے سکے اس کی فن موسیقی کی مہارت زندہ رکھنے کے لئے نکالے گئے ہوں گے۔ دوسرے گپتا بادشاہوں کی طرح سمدر گپت بھی مذہباً ہندو تھا اس کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ اُسے وید پر عبور حاصل تھا افسوس ہے کہ اس کی شاعرانہ تصنیفات میں سے ایک بھی باقی نہیں رہی۔

سمدر گپت کے سوانح نگار

۷۔ سمدر گپت کا سوانح نگار اور ملک الشعرا ہری شین علوم متداولہ میں ماہر تھا ہری شین پراسا شک طرز کا موجد ہے۔ بانا سن ہارشا چرتیا اس کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب متاخر سنسکرت تصنیفات کی طرح کچھ نظم میں ہے اور کچھ نثر میں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ سنسکرت زبان کی پہلی خالص تاریخی تصنیف ہے۔ لیکن باوجود ان تاریخی شہادتوں کے سمدر گپت کا نام فلیٹ کے کتاب گپتا نے دوبارہ زندہ کیا۔ ورنہ زمانہ اسے کب کا بھول چکا تھا۔

چندر گپت ثانی

۸۔ سمدر گپت نے ۳۷۵ء میں وفات پائی اور چندر گپت ثانی اس کا جانشین قرار پایا۔ چندر گپت کے عہد حکومت میں ہندو مذہب کا عروج شروع ہوا۔ اس بادشاہ نے وکرماجیت

کا لقب اختیار کیا تھا۔ وکرماجیت کو رجاتامساترو کی طرح عزیز ترین ہندو شاہی نام ہونے کا
فخر حاصل ہے۔ چندر گپت ثانی کی فتوحات میں مغربی صوبہ گجرات کی فتح بہت نمایاں ہے۔ ۳۹۵ء
میں گجرات کا آخری (سٹرپ یا کھترا پا) صوبیدار اور سنہا اس کے ہاتھوں سے قتل ہوا۔
گجرات زمانہ قدیم سے بحری تجارت کی منڈی بنا ہوا تھا۔ اس کی فتح سے بیشمار دولت
چندر گپت ثانی کے خزانہ میں آئی ہوگی۔

دار الامارۃ کی تبدیلی ۹۔ حدود سلطنت کی توسیع سے دار الامارۃ تبدیل کرنے کی ضرورت
محسوس ہوئی ہوگی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سمندر گپت کے عہد میں شاہان موریہ کا دار السلطنت
چھوٹ چکا تھا۔ اور اس کی بجائے اجودھیا صدر مقام قرار پایا تھا۔ چندر گپت ثانی نے بھی
اجودھیا ہی میں بودوباش اختیار کی۔ دار السلطنت منتقل ہوجانے سے پتالی پتر کی رونق
ضرور گھٹ گئی ہوگی مگر پھر بھی تذکروں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت متمول اور آباد
شہر تھا۔ پتالی پتر کے بعد قدیم ہند کے قرون وسطی میں صوبہ مالوہ کا صدر مقام اجین بہت
بڑا شہر تھا۔ کیونکہ کالیداس نے جو چندر گپت ثانی کا ہمعصر تھا اجین کی شان و شوکت کا
ذکر کیا ہے۔

چندر گپت ثانی کا مذہب چندر گپت ثانی اپنے آبا و اجداد کی طرح مذہباً ہندو تھا۔ لیکن اس میں
مطلق تعصب نہ تھا۔ اس کی بے تعصبی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے عہد میں بدھ مذہب پر کسی طرح
کی زیادتی نہیں کی گئی۔ بلکہ برہمنوں کی طرح بدھ مذہب کے نام لیوا بھی شاہی عطیوں سے
سرفراز ہوتے رہے۔ چندر گپت کے عہد میں مشہور چینی مسافر فاہیان سیاحت ہند کی غرض سے
آیا تھا۔ سنسکرت کی کتابوں میں اس شاندار عہد کی سیاسی و اجتماعی ترقی کا جو تذکرہ
ملتا ہے۔ اس کی مزید تصدیق فاہیان کے سفرنامہ سے ہوتی ہے۔ فاہیان ہندوستان میں
۴۰۵ء سے ۴۱۱ء تک رہا۔ اس عرصہ میں اس نے سنسکرت سیکھی۔ اور بدھ مذہب کی
مقدس کتابیں قصص اور روایات جمع کیے۔

اس پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ ہر شخص اپنے اغراض کو قوم کی اغراض سے جدا کرنے کے بعد بھی صاف مشاہدہ کر لیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قوم سے کلیتہً جدا نہیں کر سکتا۔ بات یہ ہے کہ ریاست کو نقصان پہنچانے میں انسان جو حصہ لیتا ہے وہ اس نفع کے مقابلہ میں جو وہ اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے اُسے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ اس ذاتی نفع سے قطع نظر کرکے وہ اپنے اور دوسروں دونوں کے اغراض کے لحاظ سے عام بہبود و فلاح ہی کا طالب ہوتا ہے۔ اگر اپنی رائے (ووٹ) روپیہ لے کر بیچتا بھی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ مرضیٔ عام کو وہ دل سے بھلا دیتا ہے بلکہ دانستہ اس سے اغماض کرتا ہے۔ وہ قصور یہ آتا ہے کہ مسئلہ کی صورت کو بدلتا ہے اور سوال کچھ ہوتا ہے وہ جواب کچھ دیتا ہے۔ چنانچہ اظہار رائے (ووٹ) کے ذریعہ سے جہاں اسے یہ کہنا چاہیئے کہ "یہ امر ریاست کے حق میں مفید ہے" وہ یوں کہتا ہے کہ "فلاں تجویز کی منظوری فلاں شخص یا فلاں گروہ کے حق میں مفید ہے۔" غرض قومی مجالس کو جس اُصول پر کاربند ہونا چاہیئے وہ چنداں مرضیٔ عام کا ثبات و قیام نہیں بلکہ زیادہ تر اس بات کا اطمینان و ایقان ہے کہ ان سے ہمیشہ مشورہ طلب ہوتا رہے گا اور وہ جواب دیتی رہیں گی۔

میں اس موقع پر استقلالیہ کے ہر فعل کے متعلق محض حق الرائے پر بہت کچھ خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ (یہ وہ حق ہے جس سے کوئی چیز شہریوں کو محروم نہیں کر سکتی) اور تقریر، تجویز، تقسیم، بحث کے حق پر بھی جسے حکومت ہمیشہ نہایت احتیاط کے ساتھ صرف اراکین مجلس کے لئے مخصوص و محدود رکھتی ہے اپنے خیالات ظاہر کرتا مگر یہ اہم بحث ایک علٰحدہ رسالہ چاہتی ہے اور اس ایک رسالہ میں اتنی ساری باتیں قلمبند کر دینا ناممکن ہے۔

۲۔ تصویت[۱]

پچھلے باب سے ظاہر ہے کہ جس اسلوب سے معاملاتِ عمومی کا انصرام ہوتا ہے وہ ملت کی حالت اور قوت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے بالکل کافی ہے۔ قومی مجالس میں جس قدر زیادہ ہم آہنگی ہوگی، یا دوسرے لفظوں میں تصویت میں جس قدر زیادہ اتحاد آرا ہوگا، مرضیٔ عام

[۱] ووٹ دینا

کو اُتنا ہی زیادہ غلبہ ہوگا۔ لیکن طویل مباحثے، اختلافات اور شور وغل شخصی اغراض کے غلبہ اور ریاست کے ضعف وانحطاط پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ایسی حالت میں چنداں نمایاں نہیں ہوتی جب کہ ریاست کے نظام اساسی میں دو یا زیادہ عنصر داخل ہو جائیں جیسے رومہ میں امراء اور عوام جن کی باہمی آویزشوں نے اکثر مجلس نظامیہ کو بہترین عہد جمہوریہ میں بھی پریشاں رکھا ہے۔ لیکن یہ استثنا محض ظاہری ہے واقعی نہیں۔ کیونکہ اُس زمانہ میں ملت کے ایک مجہول عیب کی بنا پر گویا دو ریاستیں ایک میں مدغم تھیں اور جو بات دونوں ریاستوں کے لیئے ملا کر جائز نہیں وہ دونوں کے لیئے علیحدہ علیحدہ درست ہے۔ فی الواقع پرآشوب سے پرآشوب زمانوں میں بھی طبقۂ عوام کو اگر مجلس الشیوخ چھیڑتی نہ تھی تو وہ ہمیشہ صلح وآشتی کا برتاؤ رکھتا تھا اور کثرت آرا اس کی طرف ہوتی تھی تمام شہریوں کے اغراض ایک تھے اس لیئے تمام قوم کی مرضی ایک تھی۔

محیط الدائرہ کے مقابل نقطہ پر اتفاق واتحاد دوبارہ عود کرتا ہے، یعنی اُس وقت جب شہری غلامی میں مبتلا ہو کر حریت اور مرضی دونوں کھو چکتے ہیں۔ اس حالت میں خوف اور خوشامد سے ان کی رائے (ووٹ) نعرہ تحسین وآفریں کی صورت میں بدل جاتی ہے۔ لوگ غور وفکر ترک کر دیتے ہیں اور صرف پوجنے یا کوسنے پر اُتر آتے ہیں۔ شہنشاہوں کے ماتحت مجلس الشیوخ میں بتبذل طرز تقریر جاری تھا بعض اوقات یہ عجب قسم کی بیہودہ احتیاط کے ساتھ عمل میں آتا تھا۔ ٹیسٹیس کا بیان ہے کہ اوتھو کے ماتحت ارکان مجلس الشیوخ جہاں ویٹلیس پر لعنت و نفریں کی بوچھار نازل کر رہے تھے وہاں نہایت وحشت خیز شور وغوغا کرتے تھے جس سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اگر وہ اتفاق سے ان کا حاکم ہو گیا تو اُسے یہ نہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کس نے کیا کہا تھا۔

ان مختلف ملحوظات سے وہ اصول اخذ کیئے جا سکتے ہیں جس کے مطابق اصوات (ووٹ) کے شمار اور رایوں کے مقابلہ کا طریقہ مقرر ہو سکتا ہے، اُسی نسبت سے جس سے مرضی عام کی

دریافت دشوار یا سہل ہو اور ریاست زیادہ یا کم زوال پذیر ہو۔

صرف ایک ہی قانون ایسا ہے جو بالطبع متفقہ رضامندی کا محتاج ہوتا ہے اور وہ معاہدۂ اجتماعی ہے کیونکہ اجتماع مدنی دنیا میں سب سے زیادہ ارادی فعل ہے۔ قدرتاً ہر شخص آزاد اور آپ اپنا مالک و مختار پیدا ہوا ہے لہذا کوئی شخص کسی عذر یا بہانہ سے اس کی مرضی کے بغیر اسے غلام نہیں بنا سکتا۔ یہ قرار دینا کہ ایک غلام کی اولاد غلام ہوتی ہے گویا یہ قرار دینا کہ وہ آدمی کی اولاد نہیں۔

اجتماعی معاہدہ کے وقت اگر کچھ لوگ اس کے مخالف بھی ہوں تو ان کے اختلاف سے یہ معاہدہ باطل نہیں ہوتا بلکہ اس کے سبب سے صرف وہ چند نفوس اس میں شریک ہونے سے رہ جاتے ہیں وہ شہریوں میں اجانب ہوتے ہیں۔ جب ریاست قائم ہوتی ہے تو اس میں مجرد سکونت رضامندی کی دلیل ہوتی ہے۔ اس کی قلمرو میں رہنا اس کے استقلالیہ کو تسلیم کرنا ہے۔[سلہ]

اس اولین معاہدہ کو مستثنیٰ کر کے جمہور آرا کی پابندی باقی تمام قوم پر لازم ہے اور یہ خود معاہدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص آزاد بھی ہو اور غیر کی مرضی کی پیروی پر مجبور ہو۔ ایک مخالف جماعت کے افراد کس طرح آزاد ہو سکتے ہیں جب کہ وہ ایسے قانون کے ماننے پر مجبور رہوں جن پر وہ دل سے راضی نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سوال ہی غلط وارد کیا گیا ہے۔ شہری تو تمام قوانین پر راضی ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان قوانین پر بھی جو اس کی مرضی کے خلاف وضع ہوں، بلکہ اُن پر بھی جو کسی

سلہ یہ صرف آزاد ریاستوں کے متعلق سمجھنا چاہیئے جہاں سے لوگوں کو اپنی مرضی سے اپنا مال و دولت لے کر رخصت ہو جانے کی آزادی حاصل ہو۔ کیونکہ دوسری ریاستوں میں عزا و اقربا، مال و دولت، بے پناہی، احتیاج، ظلم و تعدی کسی باشندہ کو اُس کی مرضی کے خلاف کسی ملک میں محصور رکھ سکتے ہیں۔ البتہ ایسی حالت میں اس کی مجرد سکونت نہ معاہدہ پر اس کی رضامندی پر دال ہوتی ہے نہ اس کی خلاف ورزی پر۔ (منہ)

قانون کی خلاف ورزی پر اسے سزا دلوائیں۔ ریاست کے ممبروں کی غیر متغیر و مستقل مرضی ہی کا نام مرضیِ عام ہے۔ اسی مرضی کی بدولت وہ شہری اور آزاد ہیں [۱]۔ جب مجلس عوام میں کوئی قانون پیش ہوتا ہے تو قوم سے سوال یہ نہیں ہوتا کہ آپ اسے منظور کرتے ہیں یا نامنظور بلکہ یہ ہوتا ہے کہ یا مرضیِ عام کے جو عین اُن کی مرضی ہے مطابق ہے یا نہیں۔ ہر شخص اپنی رائے دے کر اس مسئلہ کے متعلق اپنا عندیہ ظاہر کرتا ہے اور رایوں کے شمار سے مرضی عام دریافت ہو جاتی ہے اس لیئے اگر میری رائے کے خلاف کوئی رائے مسلّم قرار پا جائے تو اس سے صرف یہ نتیجہ نکلے گا کہ میں بر سر غلط تھا اور جس رائے کو میں نے مرضیِ عام سمجھ رکھا تھا وہ مرضیِ عام نہ تھی۔ اگر میری شخصی رائے مان لی جاتی تو یہ گویا خود میری مرضی کے خلاف ہوتا کیونکہ ایک شہری کی حیثیت سے میری مرضی وہی ہے جو مرضیِ عام۔ تو اس صورت میں میں آزاد نہ ہوتا۔

بے شک اس استدلال میں یہ مفروضہ مان لینا پڑے گا کہ مرضیِ عام کی تمام علامات کثرت آرا میں مضمر ہوتی ہیں۔ جب کبھی یہ نہیں ہوتا تو جو طریق بھی اختیار کیا جائے حریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس سے پہلے میں بتا چکا ہوں کہ قومی مجالس کے مباحثہ و مذاکرہ میں خاص افراد اور خاص خاص جماعات کی مرضی کس طرح مرضیِ عام کی جگہ لے لیتی ہے اس ضمن میں میں اس بے عنوانی کے دفعیہ کی علمی تدبیریں بھی واضح طور پر بیان کر چکا ہوں۔ اور میں آگے چل کر اس مسئلہ پر پھر بحث کروں گا۔ مرضیِ عام کے اعلان کے لیئے جس نسبت سے تعداد آرا

---

[۱] جینوا میں ہم زندانوں کے اوپر اور جفاکش غلاموں کی زنجیروں پر لفظ حریت لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس تحریر کا یہ استعمال نہایت موزوں ہے، کیونکہ در اصل کل ریاستوں میں جرائم پیشہ لوگ ہی باشندوں کی حریت کو غارت کرتے ہیں۔ واقعی جس ملک میں ایسے تمام لوگوں سے سخت مشقتیں اُٹھوائی جائیں وہاں کامل ترین حریت نصیب ہوگی (منہ)

کمارگپت اول ۱۱۔ سنہ ۴۱۳ء میں چندرگپت ثانی رہگزاے عالم فانی ہوا اور کمارگپت اول نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس بادشاہ کے عہد کا صرف ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اس نے بھی اسوامیدھا (گھوڑے کی قربانی) کی تقریب ادا کی تھی۔ جس سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ گپت فرمانروائی کشمیر سے راس کموری تک مسلم ہو چکی تھی۔ کمارگپت کے اخیر عہد میں قبیلہ پشامتر نے جو غالباً وادی نربدا میں آباد تھا بغاوت کی۔ اسکندگپت کمارگپت کے بیٹے نے جو ولیعہد سلطنت بھی تھا اس بغاوت کو بڑی زحمتوں کے ساتھ فرو کیا۔ سنہ ۴۵۵ء میں کمارگپت بیکنٹھ باشی ہوا اور اس کا بیٹا اسکندگپت تخت پر بیٹھا۔

اسکندگپت ۱۲۔ بادشاہ ہوتے ہی اسکندگپت کو ہن (تاتاری یا مغول) حملوں کی مدافعت کرنا پڑی۔ تاتاریوں نے (جنھیں مغربی مورخین قوم ہن کے نام سے موسوم کرتے ہیں) ایشیا اور یورپ میں ایک ہی وقت میں خروج کیا تھا۔ جس ملک میں ان کا گزر ہوا خاک اُڑنے لگی تباہی اور بربادی ان کے جلوس میں چلتی تھی۔ ان کی ایک شاخ نے سلطنت روما کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔ ہندوستان میں خاندان گپتا کا اقتدار قیاصرہ سے کم نہ تھا۔ اسکندگپت نے پہلے تاتاری سیلاب کو شکست دے کر کچھ دنوں کے لیے امن وامان کا سامان فراہم کر لیا۔ اس فتح کی یادگار کے طور پر اسکندگپت کا ستون بھتری ضلع غازی پور میں موجود ہے۔ اس ستون پر کچھ اشعار کندہ ہیں جن میں اسکندگپت کی فتوحات کا مضمون نظم کیا گیا ہے۔ سنہ ۴۶۵ء میں تاتاریوں کا دوسرا حملہ ہوا۔ ابکی مرتبہ اسکندگپت کافی مدافعت نہ کر سکا۔ کیونکہ تاتاریوں کے سفاک گروہ اس کے آخر عہد تک بلا خوف وخطر گپتا حدود سلطنت میں گھوما کیے۔ اسکندگپت نے سنہ ۴۶۷ء میں وفات پائی۔ اس کے ساتھ خاندان گپتا کا عروج بھی دنیا سے اُٹھ گیا۔

اسکندگپت کے اخلاف کی حکومت ۱۳۔ اسکندگپت کے اخلاف کی حکومت سلطنت کے مشرقی حصہ تک محدود تھی۔ اس کے اخلاف میں بالادتیا کا نام جامع نلندا میں ایک مدرسہ

قائم کرنے کی وجہ سے مدتوں زندہ رہا۔ سلطنت گپتا کے مغربی ممالک تاتاریوں کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اور انھوں نے وسط ہند میں ایک زبردست حکومت قائم کر لی تھی۔ ان کے بادشاہ کا نام تورامانا تھا۔ تورامانا کا جانشین مہیراگولا ہوا یہ نہایت درجہ بیرحم خونریز اور سفاک تھا۔ اس کی دراز دستیوں سے عاجز آ کر راجگان ہند بالادتیا کے جھنڈے تلے جمع ہوئے۔ راجگان ہند کی اس متحدہ قوت نے ۵۲۸ء میں ہندی تاتاری حکومت کا قلع قمع کر دیا۔ بالادتیا کے بعد کمار گپت ثانی اورنگ نشین ہوا۔ لیکن اس کے متعلق کوئی قابل ذکر بات ہمیں معلوم نہیں۔

سلطنت گپتا کا زوال	۱۴۔ کمار گپت ثانی کے ساتھ دولت گپتا بھی صفحہ ہستی سے ناپید

ہو گئی۔ اگرچہ کچھ دنوں تک گپتا خاندان مگدھ میں برسر حکومت رہا۔ لیکن پھر اس خاندان کو شہنشاہی کا دعویٰ کرنے کی جرأت کبھی نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ باقی رسوخ بھی جاتا رہا۔ اور یہ نامور خاندان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ جن کی حیثیت محض مقامی تھی۔ ان ریاستوں کے والی آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ان کے حریفوں میں قبیلہ مکامر کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ قبیلہ اس عہد کے مشہور قبائل میں سے ہے۔ اور گو اس قبیلہ کو بادشاہت نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن اس کا تعلق شمالی ہند کے حکمران خاندانوں سے ہمیشہ رہا اس طرح گپتا خاندان ۸۰۰ء تک چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حاکم رہا لیکن ان خاندانوں کی مقامی تاریخ ملکی اہمیت سے خالی ہے۔

عہد گپتا کے علوم و فنون

عہد گپتا ست جگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے	۱۔ شاہان گپتا ۳۲۰ء سے ۵۳۵ء تک ہندوستان میں کوس لمن الملکی بجاتے رہے۔ ان کا عہد ہندو تہذیب کے معراج کمال کا زمانہ تھا۔ یہی زمانہ

ست جگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ شاہان گپتا کی سرپرستی میں علم و حکمت نے ایسی ترقی کی کہ تاریخ ہند میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے چندر گپت ثانی راجہ وکرم کے دربار کی رونق۔ اس کی

نور تھی۔ اس کی علم دوستی اس اولوالعزم راجہ کی وسیع تر سلطنت اور عظیم الشان شہنشاہی سے کہیں زیادہ مشہور تھی۔ انہیں باتوں نے اس کا نام صدیوں تک ملک کے گوشہ گوشہ میں زندہ رکھا۔ زمانہ سمندر گپت کی فتوحات بھول گیا۔ لیکن راجہ وکرم کے محبوب نام کا وظیفہ سولہ سو برس بعد بھی عوام و خواص کی زبان پر ہے۔

علم و حکمت کی غیر معمولی ترقی

۲۔ عہد گپتا میں علم و حکمت نے جو غیر معمولی ترقی حاصل کی تھی۔ اس میں سے اب کسی کو شبہ نہیں رہا یہ متفق علیہ امر ہے کہ کالیداس چندر گپت ثانی کے عہد میں تھا۔ کالیداس ہندی شاعری کا ملک الشعراء۔ تغزل اور ناٹک میں لاثانی تھا۔ اس شاعر کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ کالیداس کے کلام میں الحاقی اشعار کثرت سے شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن جس نے کالیداس کا کلام غور سے پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ خس و خاشاک پہلی ہی نظر میں نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ کالیداس کی تصنیفات میں سے تین ناٹک شکنتلا۔ ملاویکا اگنی متر۔ وکرم واسیم دو افسانے راگھو اشرم۔ کمار اسمبھا وام اور دو عشقیہ غزلوں کے مجموعہ رگیا دتا۔ اور رتیو سام ہارا موجود ہیں۔ آخر الذکر نظم غالباً الحاقی ہے اور کالیداس کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی۔ کالیداس کی تمام تصنیفات میں شکنتلا کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہی اس کا بہترین ناٹک سمجھا جاتا ہے۔ شکنتلا کی خوبیوں کا اعتراف مشہور جرمن شاعر گیٹے نے نہایت موثر اشعار میں کیا ہے۔ میگھیا دتیا عاشقانہ رنگ میں مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں ایک عاشق جو بادشاہ کی ناخوشنودی سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ اپنی محبوبہ کو پیغام بھیجتا ہوا اور تصور میں گفتگو کرتا ہوا دکھایا گیا ہے میگھا دتا سنسکرت کی بہترین عشقیہ مثنوی ہے۔ غالباً دوسری زبانوں میں بھی ایسی مثنویاں کم ہوں گی۔ ملاویکا اگنی متر اور وکرم واسیم شکنتلا سے کم رتبہ ہیں۔ پھر بھی ان سے کالیداس کی قادر الکلامی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس زمانہ کی کوئی دوسری نظم ان کی برابری نہیں کر سکتی۔ کالیداس ایک نئی طرز کا موجد ہے۔ اس کے بعد مدتوں تک اہل علم اس طرز کا تتبع کرتے رہے۔ اسی کی طرز پر میگھا نے سیو پا لا وادھا اور بارشا نے

نامی شاعر دھاوکا لکھا ہے۔ لیکن ان میں کالیداس کے رگھوونشم کی نزاکت خیال جاندار بیان اور لطافت نام کو نہیں ہے۔ اور کالیداس کی نظموں سے انہیں کوئی نسبت نہیں دی جا سکتی۔

راجہ وکرم کا دربار ۳۔ پروفیسر سلوین لیوی کے تخیل نے راجہ وکرم کے دربار کا نقشہ ہمارے لیے مہیا کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب شکنتلا پہلے پہل دربار میں پیش کیا گیا۔ علم دوست راجہ فرط خوشی سے بیخود ہو گیا۔ حاضرین مصرعہ مصرعہ پر واہ واہ احسنت و مرحبا کی صدائیں بلند کرنے لگے۔ حریف نکتہ چیں۔ متحیر۔ انگشت بدنداں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کالیداس کامیابی کے آغوش میں انتہائی مسرت کے مزے اٹھا رہا ہے کہ حاضرین یکزبان ہو کر کہتے ہیں کہ شعرا میں کالیداس کا ہمسر کوئی نہیں اور کالیداس کے کلام میں شکنتلا سے بہتر نظم نہیں۔ ایسی کامیابی کسی ناٹک لکھنے والے کو کیوں کبھی نصیب ہوئی ہوگی" یہی رائے زمانہ کی جیلاً بعد جیلاً و نسلاً بعد نسل رہی۔ ہمیں شکنتلا کے اوصاف سے زیادہ تعجب اس امر پر ہے کہ پانچویں صدی میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے شکنتلا کی قدر کی۔ اس سے کم از کم طبقہ اعلیٰ کے تمدن و تہذیب کا حال معلوم ہوتا ہے کالیداس کا کلام شمال و جنوب میں ایک ہی نظر سے دیکھا جاتا تھا چھٹی صدی عیسوی تک عام مقبولیت کی بکثرت شہادتیں موجود ہیں۔ جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ایک ہی تمدن جاری و ساری تھا۔ میگھادوتا کا مصنف جنوبی ہند کے اکثر مقامات سے بخوبی آشنا نظر آتا ہے۔ اس کی واقفیت آریہ ورت سے کے تہذیبی اتحاد پر دلالت کرتی ہے۔

کالیداس کے علاوہ دوسرے ارباب علم ۴۔ کالیداس کی عظمت نے اس عہد کے بہت سے قابل شعرا اور ناٹک نویسوں کو پردہ خفا میں ڈال دیا ہے۔ منجملہ ان کے ایک مشہور شاعر بھاشا تھا جو کالیداس سے کچھ پہلے غالباً ۳۰۰ء میں یا اس سے بھی کچھ قبل گزرا ہے۔ امار سمہا جس کی لغت نصاب سنسکرت میں ابھی تک مروج ہے۔ اس زمانہ کا مشہور عالم تھا۔ علاوہ ازیں مہابھارت کی آخری اصلاح شاہان گپتا کے عہد میں ہوئی تھی۔ اور بعض پرانوں کے نسخے بھی

اسی زمانہ کی تصنیف کئے ہوئے بتائے جاتے ہیں۔

شاہان گپتا فنون لطیفہ کے قدرداں تھے

۵۔ شاہان گپتا کو فن موسیقی سے خاص شغف تھا شاہ سمندر گپت تو اس فن کا ساحر ہی تھا۔ دربار میں گانے اور دوسرے فنون لطیفہ کی قدر ہوتی تھی۔ شاہان گپتا کو تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ زمانہ کی دستبرد سے اس عہد کی شاہی عمارتیں بچ نہ سکیں۔ غارہائے ایجنتا کی دیواروں پر اعلیٰ ترین مصوری کے نمونہ اس عہد کی یادگار ہیں۔ غارہائے الورا کے بعض حصہ شاہان گپتا ہی کے عہد میں تیار ہوئے تھے۔ دنیا اس غاروں کی مصوری کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ فن مصوری کا انتہائی کمال یہی ہوسکتا ہے جو ان میں موجود ہے۔ عہد گپتا میں محلات شاہی ہندو مندر اور بدھ خانقاہیں سب ایسی ہی سنگی اور قلمی تصویروں سے مزین ہوں گی۔ چینی مسافر یوان چوانگ لکھتا ہے کہ جامع ملندا کی عمارتیں اس قدر عالیشان تھیں کہ عام لوگ انہیں دیوؤں کی طرف منسوب کرتے تھے جملہ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد گپتا میں سنگ تراشی۔ مصوری۔ موسیقی ونیز دیگر فنون لطیفہ حد کمال کو پہونچ چکے تھے۔

اس عہد کے اجتماعی حالات

۶۔ خوش قسمتی سے اس عہد کے اجتماعی حالات پر ایک چینی نکتہ شناس کی شہادت موجود ہے۔ جس کا نام فاہیان تھا۔ فاہیان ہندوستان میں بدھ تیرتھوں کی زیارت کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ وہ ان مقدس مقامات میں رہ کر مذہبی معلومات بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا منشا اس دور و دراز سفر سے یہی تھا کہ مذہبی قصے اور روایات جمع کرسکے اور بدھ کتابوں کے نسخے فراہم کرسکے یہ چینی جاتری ہندوستان میں چھ برس رہا (از ۴۰۵ء تا ۴۱۱ء) اس کے سفرنامہ سے اس زمانہ کی حالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ فاہیان کو ہندوستان میں بکثرت شفاخانہ اور سرائیں دیکھ کر جو محض رفاہ عام کے خیال سے بنوائی گئی تھیں سخت حیرت ہوئی اس نے ہر چیز مذہبی عقیدت کی نظر سے دیکھی ہے۔ اس لئے ہندوستان کا ذرہ ذرہ اُسے دھرم کے اثر سے متاثر

نظر آیا۔ گو واقعتاً ہندوستان کی یہ حالت نہ تھی۔ بدھ مذہب خانقاہوں اور مدرسوں میں ضرور فروغ پر تھا بدھ خیالات عام طور سے پسند بھی کیے جاتے تھے۔ ارباب علم زیادہ تر گوتم بدھ ہی کے پیرو تھے۔ لیکن عوام زیادہ تر ہندو مذہب پر تھے۔ گو بدھ مذہب کے حسب نخواہ اُصول عام پسندیدگی کے خیال سے ہندو مذہب میں داخل کرنے لگے تھے۔

فاہیان کے سفرنامہ میں ہندوستان کے تمدن کا ذکر

۷۔ سڑکیں اور شاہراہیں چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ و مامون تھیں۔ کیونکہ چھ برس تک فاہیان ہندوستان میں چکر لگایا کیا اور اسے کبھی نقصان اُٹھانا نہیں پڑا۔ فاہیان کا بیان ہی کہ ہندوستان سرسبز اور متمول ملک تھا۔ یہاں کے باشندے عام طور سے خوش حال اور فارغ البال تھے۔ امن و امان اور اندرونی تحفظ کی وجہ سے جو عام طور سے موجود تھا۔ تجارت۔ صنعتیں اور حرفتیں ترقی پر تھیں۔ حکومت ہند کے چین۔ فارس اور کسی حد تک زوال آمادہ سلطنت روما سے تجارتی تعلقات تھے۔ غرضکہ شاہان گپتا کے عہد میں ہندوستان کی سیاسی وقعت پرانی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔

جمہور اور تصویت

(۱) مرضیِ عام لازوال ہوتی ہے۔

جب تک افراد کی ایک معتدبہ تعداد باہم مجتمع ہو کر اپنے آپ کو ایک واحد جماعت سمجھتی رہے اس کی مرضی بھی واحد ہو گی اس کی مشترک بقا و تحفظ، فلاح و رفاہ عام سے متعلق ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ریاست کے تمام قوائے زبردست اور سادہ اور اس کے اصول صاف اور روشن ہوتے ہیں۔ اس کے اغراض و مفاد میں کوئی برہمی اور تناقض و تصادم نہیں ہوتا۔ ہر طرف نفع عام صاف نمایاں ہوتا ہے جس کے محسوس کرنے کے لئے صرف عقل سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ صلح و امن، اتحاد، مساوات سیاسی عیاریوں کی دشمن ہیں۔ سیدھے سادھے نیک دل لوگ اپنی سادگی کے سبب بمشکل دھوکا کھاتے ہیں۔ ترغیب و تملق اور حیلہ و وعدہ کے سبز باغ سے وہ متاثر نہیں ہوتے۔ ان میں اتنی چالاکی بھی تو نہیں ہوتی کہ کسی چالاکی کا شکار بن سکیں۔ جب دنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب قوموں میں ہم دہقانیوں کی ٹولیوں کو ایک شاہ بلوط کے نیچے بیٹھ کر معاملات ریاست کو سربراہ کرتے اور ان کو نہایت دانائی کے ساتھ نبھاتے دیکھتے ہیں تو کیا ہم دوسری اقوام کی تہذیب و شائستگی کی تحقیر کئے بغیر رہ سکتے ہیں جن کی تدابیر اور طلسم و کرشمہ ان کو مصیبت و فلاکت میں ممتاز بنا رہے ہیں۔

جو ریاست اس طرح چلائی جائے اُسے بہت کم قوانین درکار ہوتے ہیں اور اگر کبھی کسی نئے قانون کے نفاذ کی ضرورت ہوتی بھی ہے تو یہ ضرورت عام طور پر ملک میں محسوس اور تسلیم ہو چکتی ہے۔ پہلا شخص جو کسی نئے قانون کی تجویز پیش کرتا ہے صرف اُس رائے کی ترجمانی کرتا ہے جو سب لوگ پہلے سے قائم کر چکتے ہیں اور جس بات کا فیصلہ ہر شخص کر چکتا ہے اس کو قانون کی صورت میں پاس کرنے کے لئے کسی سازش یا زبان آوری و سخن بافی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ اطمینان رہے کہ دوسرے بھی اسی کی طرح اس قانون

پر عامل ہوں گے۔

ہمارے مدبرین جس بات سے دھوکا کھاتے ہیں وہ یہ ہے کہ صرف اُن ریاستوں کو دیکھ کر جن کی بنا شروع ہی سے خراب ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کی حکمت عملی ان کے حق میں ناممکن العمل سمجھ لیتے ہیں۔ ایک عیار سخن فروش، ایک کائیاں مقرر اہل پیرس اور اہل لندن کو جن بیہودگیوں پر آمادہ کر سکتا ہے ان کا خیال کر کے یہ حقارت سے ہنستے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ اہل برن کرامویل سے زنداں کی کڑیاں اٹھواتے اور اہل جنیوا ڈیوک آف بیوفورٹ سے چکی پسواتے۔

لیکن جب اجتماعی رشتہ ڈھیلا پڑنے لگتا ہے اور ریاست میں ضعف آجاتا ہے، جب شخصی اغراض و مفاد کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ریاست چھوٹے چھوٹے فرقوں یا گروہوں سے متاثر ہونے لگتی ہے تو عام قوم کے اغراض و مفاد کو ضرر پہنچنے لگتا ہے اور ان کی مخالفت ہونے لگتی ہے، مجالس میں اتفاقِ آرا و اتحادِ خیالات باقی نہیں رہتا، مرضیِ عام عام خلق کی مرضی نہیں رہتی، اختلافات و نزاعات شروع ہو جاتے ہیں اور بہترین تجویز بھی بلا بحث و حجت منظور نہیں ہوتی۔

جب ریاست آخر کار تباہی کے گڑھے کے کنارے پہنچ کر محض نمائشی صورت کے سوا حقیقۃً کوئی چیز نہیں رہ جاتی، دلوں کا اجتماعی رشتہ اتحاد ٹوٹ جاتا ہے، ذلیل سے ذلیل مقصد بے باکانہ قومی بہبود کے مقدس نام میں ملبوس و مشتہر کیا جاتا ہے تو مرضیِ عام بے زبان ہو جاتی ہے۔ لوگ اپنے خفیہ اغراض کی رہبری میں اپنے خیالات شہری کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ گویا ریاست کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اور وضع قانون کے نام سے وہ فریب سے نامنصفانہ احکامات صادر کرتے ہیں جن کی علت غائی شخصی مفاد ہوتے ہیں۔

کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مرضیِ عام فنا یا خراب ہو سکتی ہے؟ نہیں۔ مرضیِ عام ہمیشہ ثابت و قائم، غیر متغیر اور خالص رہتی ہے، البتہ یہ اور مرضیوں کے تابع ہوتی ہے جو

درکار ہی میں نے اس کے اُصول بھی قائم کیے ہیں۔ ایک صورت کا فرق بھی اتحاد و ہم آہنگی کے توڑ دینے کو کافی ہی لیکن اتحاد اور مساوات کے درمیان بہت سی غیر مساوی تقسیمیں ہیں جن میں سے ہر ایک کے ساتھ ملت کی حالت اور ضروریات کے مطابق یہ تعداد متعین ہو سکتی ہی۔

اس نسبت کا ضبط و تعدیل دو عام اُصولوں کے ماتحت ہو سکتا ہی۔ ایک تو یہ کہ مسئلہ زیر بحث جس قدر زیادہ اہم و وقیع ہو اُسی قدر زیادہ کثرت آرا کی ضرورت ہی۔ دوسرا یہ کہ مسئلہ زیر بحث جس قدر زیادہ عجلت کا محتاج ہو اُسی قدر کم کثرتِ آرا کی تلاش ہونا چاہیئے۔ جس موقع پر فوری فیصلہ کی ضرورت ہو ایک رائے کی زیادتی کافی سمجھنا چاہیے۔ ان میں سے پہلے اُصول قوانین کے لیئے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہی اور دوسرا معاملات کے لیئے۔ خواہ کچھ بھی ہو ان کی مناسبت ترکیب سے ضروری اکثریت کی دریافت کے لیے بہترین معلوم ہو جاتی ہی

امید اور جاہ طلبی

إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ
وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ

قرآن حکیم کی ان آیات کریمہ میں ایک زبردست راز کا اظہار ہی، وہ راز جس کو خدا نے صرف انسان کے ساتھ مخصوص کیا ہی، وہ راز جس کی وجہ سے تمام عالم کون پراس کو فضیلت دی ہی، وہ راز جس کے پانے کے بعد انسان بڑے بڑے مراتب اور کمال انسانی کے وہ اعلیٰ مدارج حاصل کرتا ہی جن کو عنایت الٰہی نے صرف اسی کے لئے مخصوص کئے ہیں، تم اپنے ضمیر سے مخاطب ہو، اور اس آواز کی طرف کان لگاؤ جو تمھارے اندر سے آرہی ہی، تم اپنے وجدان میں اس وقت ایک قوی میلان اور ایک زبردست جذبہ خواہش کا پاؤ گے جو تمھیں اپنے ابنائے جنس کے قلوب میں طلب عزت اور علو منزلت کے لئے آمادہ کرے گا، اس کے بعد تم قوم کی مجموعی شکل پر نظر ڈالو، وہاں بھی افراد کی طرح تم کو یہ جذبہ ملے گا کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابل سب سے بلند مرتبہ کی مشتاق ہی، دلدادۂ عزت کے لئے اگرچہ اس مقصد کی کامیابی سہل نہیں، لیکن بایںہمہ وہ اس کی راہ میں تمام مشکلات کا خوشی سے استقبال کرتا ہی، اس کے سامنے ایسی دشوار گزار گھاٹیاں بھی آتی ہیں، جو اسے بڑھنے نہیں دیتیں، لیکن پھر بھی اس کی خواہش میں کوئی ضعف اور اس کے میلان میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی، وہ برابر ان گھاٹیوں کو طے کرتا ہوا، دشواریوں کو برداشت کرتا ہوا منزل عزت کی سمت بڑھتا چلا جاتا ہی، یہاں تک کہ وہ عزت کی سب سے بلند چوٹی کو پالیتا ہی، جب اس کی راہ میں کوئی زبردست مانع پیش آتا ہی، جو اسے ٹھہرنے پر مجبور کرتا ہی، تو وہ اس طرح بیتاب و بے قرار ہوتا ہی، جیسے کوئی گرم چٹان پر لوٹتا ہو۔

اگر کوئی عاقل اور واقف کار حکیم انسانی اعمال کی تحقیق پر آمادہ ہو، اور اس کے

ہو فعل کی علت غائی معلوم کرنا چاہے، تو وہ اس نتیجہ پر ضرور پہونچے گا کہ اکثر اعمال انسانی کی غرض و غایت صرف حصول عزت و جاہ ہے، یہ وہ خصوصیت ہے جو ہر قوم کے تمام افراد میں باوجود اختلاف طبقات کے ادنی سے لیکر اعلی تک پائی جاتی ہے، ہر طبقہ میں لوگوں کی یہ باہمی کشمکش عزت کیلیے ہمیشہ جاری رہتی ہے، ہر ایک بلندی کے لیئے جدوجہد کرتا ہے، اور اس بات کی حرص کرتا ہے کہ سب کے دلوں میں واقعی عظمت کا سکہ بٹھا دے، جب وہ اس منزل پر لوگوں کے معیار کے مطابق پہونچ جاتا ہے، تو اس پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے طبقہ کی طرف جست کرتا ہے، اور وہاں بھی سب سے مقابلہ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے، یہ اس لیئے کہ کمال انسانی کی کوئی مقرر حد نہیں، جہاں پہونچ کر انسان کا نفس قانع ہو جائے، اور یہ اعتقاد کرے، کہ یہ آخری سرحد ہے، اب اس کے آگے کوئی نہایت نہیں، سبحان اللہ، اس جذبہ نے انسان کے دل پر کیا جادو کر دیا ہے، کہ وہ اسی کو اپنا ثمرۂ حیات اور اسی کو اپنے وجود کی غایت شمار کرتا ہے، وہ اپنی زندگی کو بیکار سمجھتا ہے، جب اس عزت کے فقدان اور اس کی پامالی کا خطرہ بھی اس کے دل میں گزرتا ہے، کیا تم نے اس گدڑی پوش فقیر کو نہیں دیکھا؟ جس پر کسی نے ظلم کیا ہے، اور اس کی عزت و آبرو کو خاک میں ملانا چاہتا ہے، وہی فقیر جو اب تک عاجز و بے بس نظر آتا تھا، غضبناک ہو کر مرنے اور مارنے کیلیئے طیار ہو جاتا ہے، حالانکہ اس تذلیل نے نہ اس کے کھانے میں کوئی کمی کی، نہ اس کے آرام میں کوئی خلل ڈالا۔ ایک نہیں بلکہ ہر زمانہ میں ہزارہا افراد نے اس عزت کی حفاظت میں اپنے کو خطرات میں ڈالا، اور عزیز جانوں سے ہاتھ دھویا، خدا کی عجیب شان ہے، کہ انسان کا کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے، نرم اور گدگدا بستر خار دار معلوم ہوتا ہے، جب تک اس کو یہ یقین نہ ہو، کہ جو کچھ اسے مل رہا ہے، وہ دوسروں سے بڑھ کر ہے، اور یہ کہ وہ اس کی بلندی کا دل سے اعتراف کرتے ہیں، گویا کھانے پینے کی لذت بھی صرف فخر و مباہات کا وسیلہ ہے، ورنہ لذتوں کا

کیا شمار کتنی ہیں وہ جسمانی مشقتیں جو انسان نے برداشت کیں؟ کتنی ہیں وہ سفر کی صعوبتیں جو خوشی سے اس نے منظور کیں؟ اور کتنے ہیں وہ جنگ و جدال کے مواقع جہاں وہ سر کو ہتھیلی پر رکھ کر نے گیا؟ اور کتنے ہیں وہ حسرتناک مناظر جب انسان کو لذائذ دنیوی سے باوجود قدرت کے کنارا کرنا پڑا ہے؟ یہ سب کس لیئے؟ صرف اس لیے کہ وہ عزت و شہرت کا طالب ہے۔ انسان پر خدا کی کس قدر مہربانی ہے، کہ وہ صرف ناموس عزت کے لیئے زندہ ہے، اس کی عزت تمام عالم کی عزت ہے، دنیا کی تمام لذتیں صرف عزت ہی کے لیئے بنی ہیں، بلکہ یہ زندگی بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے، کہ انسان اس کو شاہراہ عزت بنائے، انسان جب اپنی زندگی کو الوداع کہتا ہے، تو اس کی آنکھیں ان چیزوں سے ٹھنڈی ہوتی ہیں، جن کو اس نے کر لیا، اور اس کا دل رنجیدہ ہوتا ہے اُن چیزوں سے جن کے انجام سے وہ قاصر رہا۔

وہ عزت کیا ہے! جس کے لیئے انسان اس قدر دیوانہ وار کوشش کرتا ہے، بڑے بڑے خطرات میں اپنے کو خوشی سے ڈال دیتا ہے، اگر موقع پڑ جاتا ہے تو اپنی عزیز جان کو بھی اس عزت کی دیوی پر قربان کر دیتا ہے! یہ عزت وہ انمول گوہر ہے، کہ جس کے نصیب میں یہ آتا ہے، لوگ اس کی سیادت اور حقیقی عظمت و بزرگی کا اعتراف کرتے ہیں، اس کے ہاتھوں میں اپنی عنان حکومت سپرد کر دیتے ہیں، یہ قدر و منزلت نہ صرف اس صاحب عزت کو حاصل ہوتی ہے، بلکہ ہر وہ ذات جو اس شخصیت سے متعلق ہے، اس کے عزیز، اس کا خاندان اور اس کی تمام قوم، یہ درحقیقت ایک بہت بڑا اجر ہے، جو رب العزۃ کی طرف سے کسی انساں کو گوناگوں مصائب کے عوض ملتا ہے، عزت کا طالب جن باتوں میں اپنے لیئے نفع دیکھتا ہے، اُن کے لیے مدبر کائنات کا شکر گزار ہوتا ہے، جس کا خوشگوار نتیجہ اسکی ساری قوم کو ملتا ہے خدا کی یہ کتنی بڑی حکمت ہے، کہ اگر قوم کا ایک فرد بھی حقیقی عزت و حرمت حاصل کرتا ہے، تو ساری قوم کو سیادت کا فخر حاصل ہوتا ہے، اس میں شبہ نہیں

کہ جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے، وہ تنہا اپنی کوششوں سے نہیں، بلکہ تمام افراد قوم کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے، (ذالک تقدیر العزیز العلیم) ایک اکیلا محنت کرنے والا کیا کر سکتا ہے، اور اپنی سعی و کوشش کو کیونکر بار آور بنا سکتا ہے، تا وقتیکہ اس کے خاندان و قبیلہ کے لوگ اس کے لیے دست و بازو نہوں۔ لہذا جو عزت و شرف کے اعلیٰ درجات تک پہونچنا چاہتا ہے، اُس کو از بس ضروری ہے، کہ وہ خود مع اپنے ساتھیوں کے ہر کمال و فضیلت کے حاصل کرنے کے لیے بڑھے۔

انسان کے اس فطری میلان اور الہام الٰہی کی خدمت گزاری کس قدر دشوار ہے، کس قدر زبردست ہیں وہ مشکلات جو انسان اپنے بعض مقاصد کی خاطر اُٹھاتا ہے، اور کس قدر عظیم ہے وہ شئے جو انسان کو کسی بلند مقصد کے حصول کے لیے گوناگوں مصائب اٹھانے پر آمادہ کرتی ہے، آخر وہ کونسی شئے ہے، جو لوگوں پر ہر مشکل کو آسان، ہر دور کو نزدیک، ہر بڑے کو چھوٹا، اور ہر سخت کو ملائم کر دیتی ہے، مصائب کا خیال لوگوں کے دل سے یکقلم نکال دیتی ہے، اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے جانی ہو یا مالی راضی کر دیتی ہے، یہ زبردست محرک، اور نفس کو ہر عمل پر برانگیختہ کر دینے والی برقی قوت امید ہے۔

امید مصائب کی تاریکیوں میں ایک روشنی مشعل ہے، ہجوم مشکلات میں ایک حاذق رہنما ہے، ارادوں میں سستی کے وقت ایک قاہر حاکم ہے، اور ٹوٹی ہوئی ہمتوں کو دوبارہ تقویت دینے کے لیے ایک فرشتہ غیب ہے، امید اُن آرزوؤں اور بوالہوسیوں کا نام نہیں جو ذہن میں پے در پے داخل ہوتی رہتی ہیں، اور انسان ان کو ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے کاش میرے لیے سلطنت ہوتی، میرے لیے جاہ و منزلت ہوتی، حالانکہ وہ عیش و عشرت سے باز نہیں آتا، ملائم بستروں سے ایک گھڑی علحدہ ہونا نہیں چاہتا، اُن ملاہی و ملاعب کو ترک نہیں کرتا، جو ہر آن مقصد سے اس کو دور کر رہے ہیں، گویا یہ شخص چاہتا ہے کہ خدا انسانی اعمال و حرکات میں اس کی خاطر اپنی سنت کو بدل دے، اور اس کی دلی آرزو بغیر

محنت و مشقت کے پوری کر دے نہیں، بلکہ امید اس سچی اور حقیقی خواہش کا نام ہے، جس کے ساتھ ساتھ عمل ہو، اور انسان کو اس کی راہ مقصود میں آنے والی دشواریوں اور نازل ہونے والی مصیبتوں کے جھیلنے پر خوشی سے آمادہ کر دے، وہ امید جو انسانی قلب میں اس خیال کو راسخ کر دے، کہ بغیر مقصود کے جینا بیکار ہے، وہ سر جو اس بادۂ امید سے سرشار ہے اسکی قربانی کا پہلا قدم نقد جان ہے، دولت و زر کو تو وہ صرف حوادثات عالم سے زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیئے ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔

جس طرح بڑھنے کا میلان ایک فطری بات ہے۔ اسی طرح امید اور نفس پر یہ اعتماد کرنا، کہ اس کی کوششیں مقصد تک پہونچانے والی ہیں، قدرت کی ودیعتوں میں سے ہے، اگرچہ دونوں کا وجود عام فطرت انسانی میں مزاحمات و موانع سے خالی نہیں، تاہم ہر ایک اس ودیعت الٰہی کے مطابق ضرور عزت و مجد کی تلاش کرتا ہے، اور دوسروں کے دل میں اپنی جگہ کرنا چاہتا ہے گویا ہر ایک طالب و مطلوب دونوں ہے، عقل انسانی کی مساعی ابھی اس پایہ تک نہیں پہونچی ہیں، کہ وہ ہر فرد کے اس عمل کی تائید کریں، جو وہ دوسروں کے نزدیک ہر دلعزیز ہونے کے لیئے کر رہا ہے، اور اس طرح سے سب کے سب معزز و محترم ہو جائیں، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ وہ امید و خواہش کی طرح اعمال میں بھی متصادم ہوتے ہیں، اور اس طرح سے ہر ایک کی راہیں بیشمار مشکلات سے پُر ہیں، مگر نوع انسانی کی اس کشمکش میں بھی خدا کی ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے (لیعلم الذین جاھدوا و لیعلم الصابرین) جب کسی فرد یا قوم پر پیہم مشکلات طاری ہوتی ہیں، تو اُس کی ہمت پست ہو جاتی ہے، ارادوں میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے اور انحطاط کا بادل چاروں طرف سے اس پر محیط ہو جاتا ہے، اُس وقت کیا ہوتا ہے؟ اسوقت یہ ہوتا ہے کہ طبیعت انسانی کی ان دونوں شریف خصلتوں (امید و طلب عزت) میں فساد واقع ہو جاتا ہے، جس طرح اور عمدہ اخلاق و مکارم میں، اور انکی جگہ یاس و حرماں نصیبی لے لیتی ہے۔ نعوذ باللہ منہا۔

ان مایوس اور حسرت زدہ انسانوں کی کیا کیفیت ہوگی۔ جن کے رشتہائے امید ایک ایک کرکے سب منقطع ہوگئے؟ وہ اپنی ذلت کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ ہر بلندی سے محرومیت اور عاجزی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ کوئی ایسی دنائت اور ذلت باقی نہیں رہتی جس کو وہ اختیار نہ کرتے ہوں، اہانت و تحقیر کی ہر ادا انھیں محبوب ہونے لگتی ہی، ان کے تمام وہ احساسات و وجدانات انسانی جو انسان کو انعام سے ممتاز کرتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں وہ ہر اُس شے سے خوش ہوتے ہیں، جو حیوانات کو خوش کرتی ہی، ان کا سرمایہ حیات بجز چند کھانے پینے کی احتیاجات کے اور کچھ نہیں، کاش وہ جانور ہی ہوتے، اِدھر اُدھر چراگاہوں میں پھرتے، اور سرسبز نباتات سے اپنا پیٹ پالتے، لیکن افسوس ایسا نہیں ہی، وہ اگر اپنے لئے کام نہیں کرتے، تو خدا ان پر بطور سزا کے ایسے لوگوں کو مسلط کر دیتا ہی، جو اپنے آرام کے لئے ان کو استعمال کرتے ہیں، بالکل اس جانور کی طرح جو اگرچہ اپنی پیٹھ پر ہزاروں من کا بوجھ اُٹھاتا ہی، لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے آرام و راحت کے لئے، کسان چلچلاتی دھوپ میں دن بھر کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں، مزدور کارخانوں میں ہر وقت لگے رہتے ہیں اور اس کے علاوہ سیکڑوں محنت و مشقت کے کام لوگ کرتے ہیں، اور اتنی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں کہ کوئی اپنے لئے بھی نہیں اُٹھا سکتا، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہی؟ آیا ان کو بھی اپنے پسینہ بہانے کا کوئی عوض ملتا ہی؟ نہیں بلکہ ان کی گاڑھی کمائی کا سارا فائدہ صرف انکی نذر ہو جاتا ہی، جو اپنی الوالعزمیوں کی بدولت ان پر حکمراں ہیں، کاش جس قدر ایک ذلیل اپنی ذلت کے لئے اعمال شاقہ کی مصیبت گوارا کرتا ہی، اس کا کوئی حصہ بھی وہ عزت و شرف کے چاہنے میں گوارا کرتا تو یقیناً اسے خاطر خواہ ثمرہ ملتا، حقیقت یہ ہی کہ ان حرماں نصیبوں کا درجہ حکومت کرنے والوں کے نزدیک حیوانات سے بھی گیا گزرا ہوتا ہی، اس لئے کہ وہ بداہتاً اس کو سمجھتے ہیں، کہ یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے خود اپنے کو مقتضائے فطرت انسانی کے مرتبہ سے گرا دیا ہی، اور اس چیز پر راضی ہوگئے ہیں، جو ان کے حق سے کہیں کم ہی، بلکہ ایسی چیز جو

کبھی ان کی شایان شان نہیں، انھوں نے انسانی شکل میں پیدا ہو کر خدا کی نعمتوں اور ودیعتوں کا جوہر فرد بشر میں اس نے ودیعت کی ہیں، صاف و صریح کفر کیا ہے، لہذا حکمران ان کے ساتھ وہ وہ روا رکھتے ہیں، جو جانوروں سے ان کے قاصر ہونے کے سبب روا نہیں رکھتے، اس کا مشاہدہ ہم آج ان قوموں سے کر سکتے ہیں جن کو مایوسی نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے، اور غیروں کی غلامی کا جوا ان کے کندھوں پر رکھا ہوا ہے۔

اب تک ہمارا گمان یہی تھا، کہ پہلے ایسی قومیں تھیں جن کے حکمران ان کو طرح طرح سے ستاتے تھے، مگر اب ہم اپنی آنکھوں سے ایسی قومیں دیکھتے ہیں، جن کے حکمران ان کے ساتھ جانوروں سے بھی زیادہ برا سلوک کرتے ہیں۔

حیرت بالائے حیرت ہے، کہ طبیعت کے احکام کیونکر بدل جاتے ہیں، فطرت کے اثرات کیونکر محو ہو جاتے ہیں، کیونکر ایک نفس اس طرح ذلت پر قانع ہو جاتا ہے کہ ابھرنے کی آرزو نہیں کرتا، اور کیونکر اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ کوئی امید باقی نہیں رہتی، حالانکہ امید اور عزت کی محبت انسان کی طبیعت میں داخل ہیں، غور و تامل کے بعد اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ انسان نے یہ سمجھ لیا ہے، کہ اس کے تمام اعمال و افعال مستقل حیثیت سے صرف اسی کے قوت و ارادے سے صادر ہوتے ہیں، اس کی قوت ہی صرف اس کے تمام اعمال کی حاکم ہے، اس کے اوپر کوئی ایسی قوت نہیں، جو اس کی مدد کرے، یا اس کو مجبور کر سکے۔ لہذا جب بار بار کسی عمل کے لئے اس کے سامنے مواقع پیش آتے ہیں، اور مقصود تک پہونچنے کے لئے بیشمار مشکلات سد راہ ہوتی ہیں، تو وہ اپنی قدرت کی طرف لوٹتا ہے، مگر اس کو مردہ پاتا ہے، قوت کی طرف پھر کر دیکھتا ہے، تو وہ بھی جواب دے رہی ہے، اس وقت وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے بے بس ہو جاتا ہے، اور مایوس و نا امید ہو کر بیٹھ جاتا ہے، یہی ہے وہ منحوس مقام جہاں سے انسان کی ذلت و رسوائی کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے کہ اس وقت وہ اپنے دل میں اس امر کا اعتقاد کر لیتا ہے کہ بس ان

موانع کے لیئے کوئی روک نہیں، جب مانع کی قوت اس کی قوت سے بڑھ گئی، تو اب عمل
کے راستے مسدود ہوگئے، لہٰذا اس کی تمام اُمیدیں یک لخت منقطع ہوجاتی ہیں، اور دائمی
بدبختی کے جال میں پھنس جاتا ہے، لیکن کہیں اگر اسے یہ یقین ہو کہ کائنات کے پس پردہ ایک ور
بھی زبردست مدبر ہے، جس کی عظمت و جبروت کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سر جھکائے
ہوئے ہے، زمین کے تمام سلاطین اس کے خراج گزار ہیں، اور وہ ایسا قادر مطلق ہے، کہ تمام
کائنات عالم اس کے (کن فیکون) کا ادنیٰ مظہر ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ اس یقین کے ساتھ مایوسی
اس پر قبضہ کر سکے، یا ناامیدی اس کی امیدوں کا خاتمہ کردے، اس لیے کہ ایک یقین کرنے والا
جس وقت بھی اپنی کمزوری کا احساس کرے گا۔ یا اپنے ہاتھوں کو کسی عمل کے لیئے شل پائے گا۔ تو
خدا کی اس قوت کو کبھی نہ بھولے گا، جو تمام قوتوں سے بالاتر ہے، ایسے ہی وقتوں میں وہ اپنے عمل
کو جاری رکھنے کے لیئے، اس قوت کی طرف متوجہ ہوگا، اور مایوسی کو اپنے پاس نہ آنے دے گا،
جب جب اس پر سختیوں کا ہجوم ہوگا، وہ اور جوش کے ساتھ اس کی مدافعت کو بڑھے گا، اس لئے
کہ اسے اس ہستی کی قوت کا اعتقاد ہے، جس کا کوئی آسمان و زمین میں مزاحم نہیں، ایک دروازہ
اگر اس پر بند ہوگا، تو صدہا دروازے خدا کی عنایت و مہربانی سے اس پر کھل جائیں گے، لہٰذا
نہ کبھی وہ ملول ہوگا، اور نہ کبھی پست ہوگا، اور نہ کبھی کسی ناکامیابی کا خطرہ اس کے دل میں
گزرے گا، وہ سمجھتا ہے کہ مدبر عالم اس پر یقیناً قادر ہے کہ پہاڑوں کو متزلزل کردے، دریاؤں
کو شق کردے، شہنشاہوں کو گدا بنادے، اور ایک گدا بے نوا کو تخت شاہی پر سرفراز کردے،
اور بارہا خدا کی قدرت نے اس طرح جلوہ کیا ہے، لہٰذا اس کا ارادہ اور مضبوط ہو جاتا ہے، اور
کمال کے حاصل کرنے کے لیئے ہمہ تن مستعد ہو جاتا ہے جس کو کوشش کے بعد خدا نے مرحمت کرنیکا
وعدہ کیا ہے، جو شخص خدا، اس کی قدرت، اس کی عزت، اور اس کی جبروت پر یقین کامل رکھتا
ہے، وہ کبھی مایوس نہ ہوگا، اس لیئے خدا نے اصل حقیقت سے اس کو خبردار کردیا ہے جس میں
مطلق شک و شبہ نہیں، وہ اصدق القائلین ہے، (انہ لا ییأس من روح اللہ

إلا القَوْمُ الكَافِرُوْن) اپنے پیغمبر ابراہیم کی زباں سے اسی تعلیم کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتا ہے (ومن یقنط من رحمة ربه إلا الضالون) پس بلا شبہ خدا نے یاس اور نا امیدی کو گمراہی کی دلیل قرار دی ہے اور اس دل میں کہاں سے یاس داخل ہو گی، جو دل خدا اور اس کی قدرت کاملہ کے ایمان سے بندھا ہے، لہذا ہم بیانگ دہل یہ کہہ سکتے ہیں، کہ مسلمانوں کا خدا کے ساتھ یقین، اور جو کچھ نبی صلعم لائے اس کی تصدیق کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی گزشتہ عزت و عظمت کے لوٹانے میں باوجود کثرت تعداد کے رحمت الٰہی سے مایوس ہوں، ان کا ایمان کبھی یہ نہیں بتاتا، کہ وہ توہین کو قبول کریں، اور اپنی ذلت و رسوائی سے خوش ہوں، بلندی و رفعت کے حاصل کرنے کے بجائے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں، رب العزت کا شکر ہے کہ مسلمان ابتک اس ابتلا و آزمائش سے محفوظ ہیں، جو اکثر قوموں کے ساتھ کی گئی، ان کے پاس ابھی سلطنت بھی باقی ہے، اور انشاء اللہ ہمیشہ ایک بڑی سلطنت اس زمین پر مسلمانوں کی رہے گی، حق تو یہ ہے کہ ان پر رحمت الٰہی کے دروازے اب بھی کھلے ہیں، ان کا کام صرف ان میں داخل ہو جانا ہے، خدا کا ابر کرم ان پر گلاب پاش کر رہا ہے، اس کی خوشبوؤں سے معطر ہونے کے لیے بس ایک سونگھنے والی ناک درکار ہے، فرمتیں ہمیشہ ان کو بیدار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہیں، غافلوں کی تنبیہ کرتی ہیں، سونے والوں کو ہشیار کرتی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کے حاصل کرنے کے لیے بجز اس بات کے اور کوئی بات ضروری نہیں کہ وہ متحد ہو جائیں، اعزاز ملت کے لیے باہم ایک دوسرے کی اعانت کریں، اور اس کامیابی کا حقیقی راز اسی دینی اتحاد ہی میں پوشیدہ ہے، پھر کونسی چیز اب یاس کا باعث ہے، اور کونسی چیز نا امیدی کی طرف بلانے والی ہے، جبکہ ان کے سامنے صاف صاف خدا کی کتاب یہ کہہ رہی ہے، کہ مایوس ہونا گمراہوں کی صفت ہے، کیا ہدایت و ضلالت میں کوئی یگانگت ممکن ہے، اور کیا حق کے بعد صرف گمراہی باقی نہیں رہ جاتی؟ کیا مسلمان ساری دنیا میں حکومت و سیادت کی عزت حاصل کرکے آج اغیار کی غلامی میں آنے کے لیے خوش ہیں؟ وہ زندگی سے کس بات کی لو

لگائے ہیں، اگر وہ ظالم دشمنوں کے قبضہ میں اس طرح ذلت واہانت، فقر و فاقہ اور بدبختی کی زندگی پر قانع ہیں؟ وہ مطمئن ہیں، حالانکہ اغیار ان کے داہنے بائیں سرکوبی کے لیئے موجود ہیں، وہ اغیار جو جفا کار ہیں، ذلیل و رسوا کرنے والے ہیں، اور جنھوں نے اپنے غلاموں کے متعلق یہ قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ وہ اقوام کی صف میں جگہ نہیں پا سکتے، کیا اس سے بڑھ کر انسانیت کی کوئی اور رسوائی ممکن ہے، اور کیا انسان جب تک اس کی انسانیت سلب نہ ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی اس ذلت اور بدبختی کی زندگی کو پسند کرے گا، مسلمان کیا وہ زمانہ بھول گئے، جبکہ دنیا ان کو اپنی آنکھوں میں بٹھاتی تھی، حالانکہ ابھی زیادہ عرصہ اس کو نہیں گذرا، صفحات تاریخ کی روشنائی ہنوز تازہ ہے، دنیا کے پاس ان کی عظمت کے آثار باقی ہیں۔ اس وقت بھی زمین پر ان کا شوکت و اقتدار بالکل معدوم نہیں ہوا ہے (بلکہ اب تو خدا کی مہربانی سے امید کی نئی کونپلیں تمام دنیائے اسلام میں پھوٹ رہی ہیں)

عوام اگر اس قانون الٰہی سے بے خبر ہیں، تو خیر مگر علماء کے لیئے کیا عذر ہے؟ وہ علماء جو شریعت اسلامیہ کے محافظ ہیں، وہ علماء جو راسخون فی العلم کہلانے کے مستحق ہیں، کیوں وہ متفرق مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ کیوں وہ ان کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک لڑی میں نہیں پروتے؟ کیوں وہ ان خرابیوں کی اصلاح نہیں کرتے، جو انمیں پیدا ہو گئی ہیں کیوں وہ اپنے امکان بھر مسلمانوں کو تقویت پہونچانے، اور رب العزت والجلال کے ان وعدوں کی بشارت دینے میں پہلو تہی کرتے ہیں، جو اطاعت شعاری اور ایمان بالجزم کے عوض ان سے کیئے گئے ہیں؟ یقیناً اب ایک جماعت خدا نے ایسی پیدا کر دی ہے جن کے سینوں کو ایمان کے لیئے اس نے کشادہ کر دیا ہے، اور وہ اس عالمگیر مقصد کی تکمیل کے لیئے زمین کے چپہ چپہ میں پھیل گئے ہیں، ان کا باہمی اتفاق ایک روز ضرور ان کو مرکز واحد پر کھڑا کر دے گا، باقی مسلمانوں سے ہمیں صرف اس قدر توقع ہے کہ وہ ان سے اتفاق کر کے ان کی اعانت کریں تاکہ سب کو خدا کی فتح عظیم حاصل ہو (ان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم) مترجمہ سعید انصاری۔

جشن نوروز اور ایک محفل عروسی

ترجمہ از دستاالیفسکی

"دستاالیفسکی کے نام سے ہمارے ملک میں بہت کم لوگ واقف ہیں اور اُس پر کیا موقوف ہی کسی روسی انشاپرداز تک ہماری پہونچ ابھی نہیں ہوئی ہی۔ دستاالیفسکی صرف روس ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں بہ حیثیت باکمال فسانہ نویس سحرنگار انشاپرداز اور نفس انسانی کے حقائق و اسرار کے ترجمان کے شہرت رکھتا ہی۔ اس چھوٹے سے فسانے سے اُس کے کمالات کا قرار واقعی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ آگے چل کر انشاء اللہ اس قصہ کے مترجم محمد مجیب صاحب بی۔ اے جو روسی ادب سے خاص مذاق رکھتے ہیں اور روسی زبان سیکھ رہے ہیں اس مصنف اور دوسرے روسی ادیبوں کی معرکۃ الآرا کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کریں گے۔"

کچھ دن ہوئے میں ایک شادی میں شریک تھا۔ مگر نہیں میں پہلے ایک نوروز کے جشن کا قصہ سناؤں گا۔ شادی بہت دلچسپ تھی اور مجھے بہت پسند آئی مگر اُس پہلے واقعہ کا ذکر پہلے کرنا چاہیئے۔ عجب بات ہی کہ اس شادی میں شریک ہو کر مجھے وہ نوروز کا جشن یاد آگیا۔ اِسکی وجہ یہ تھی۔

پورے پانچ برس ہوئے میں نوروز کے موقعہ پر ایک بچوں کے ناچ میں مدعو تھا۔ صاحب خانہ جنھوں نے مجھے دعوت دی تھی تاجروں کے طبقہ میں بہت ممتاز تھے اُن کے تعلقات با اثر لوگوں سے تھے اور اُن کی ملاقات کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ اکثر طرح طرح کی صحبتیں منعقد کیا کرتے تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بچوں کا ناچ محض ایک بہانہ ہی جس کی آڑ میں اُنھوں نے ایک معمول سے بڑی جماعت اکٹھا کی ہی تاکہ ہر طرح کی بے مزا اور دلچسپ گفتگو سے دل بہلائیں۔

میں اس حلقے میں اجنبی تھا اور مجھے اس گفتگو سے بالکل رغبت نہ تھی۔ اس لئے اُس بات کو

کئی بار ایسا ہوا کہ میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ وہاں ایک صاحب اور تھے جو معلوم ہوتا تھا کہ میری طرح یہاں کی صحبتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور محض اتفاقاً بلائے گئے تھے۔ ایک لانبے دبلے آدمی تھے سنجیدہ طبیعت کے معلوم ہوتے تھے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل بہلانے یا خاندان کی خوشی میں حصہ لینے نہیں آئے ہیں۔ جب کبھی وہ کونے میں ہٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو فوراً ہنسنا موقوف کر دیتے تھے اور اُن کی تیوری پر بل پڑ جاتا تھا۔ صاحب خانہ کے علاوہ وہ اس مجمع میں کسی سے واقف نہ تھے ظاہر ہے کہ اُن کی طبیعت اُکتا گئی تھی مگر اُنھوں نے اس کا ارادہ کر لیا تھا کہ آخر تک ایک شادان و فرحاں مہمان کے انداز کو نباہیں گے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک صاحب تھے جو مفصلات سے ایک نہایت اہم معاملہ کے طے کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے اور ہمارے میزبان کے پاس ایک سفارش کا خط لائے تھے جس کی وجہ سے موصوف نے اُنھیں اپنی حمایت میں لے لیا تھا، اگرچہ خالص محبت کے انداز سے نہیں اور از راہ مہمان نوازی اُن کو اپنے بچوں کے ناچ میں بھی بلا لیا تھا۔ تاش کوئی کھیل نہیں رہا تھا سگار ان کو دیے نہیں گئے اُن سے باتیں کسی نے چھیڑی نہیں (شاید اس وجہ سے کہ لوگوں نے دور سے پر دیکھتے ہی ایک وسی مثل کی طرف اشارہ ہے، چڑیا کو پہچان لیا تھا اور بیچارے کیا کرتے مجبوراً اپنے ہاتھوں کو کسی طرح مشغول رکھنے کے لیے ساری شام اپنے گلچھوں پر ہاتھ پھیرتے رہے اُن کے گلچھے در اصل بہت خوبصورت تھے مگر وہ ان پر اس قدر رجوع قلب کے ساتھ ہاتھ پھیرتے تھے کہ دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا تھا کہ دنیا میں اُن کے گلچھے پہلے آئے تھے اور یہ حضرت بعد میں اُن پر ہاتھ پھیرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ ان صاحب کے علاوہ میری نظر ایک اور صاحب پر پڑی مگر یہ بالکل ہی دوسری قسم کے آدمی تھے۔ وہ نہایت اہم شخصیت رکھتے تھے اور اُن کا نام دمیتری پیٹرووچ نارکن تھا۔ پہلی ہی نظر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑے آدمی ہیں اور ہمارے میزبان سے اُسی قدر برتر ہیں جتنے ہمارے میزبان

گلچھوں والے صاحب سب ہمارے میزبان اور اُن کی بیوی دونوں ہر طرح کی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ بہت ادب سے پیش آتے تھے۔ بار بار شراب کے جام پینے پر مجبور کرتے تھے۔ غرض ہر طرح اُن کی درباداری کرتے تھے۔ دوسرے لوگوں کو لا کر اُن کے سامنے پیش کرتے تھے اور اُن کو کسی کے سامنے نہیں میں نے یہاں تک محسوس کیا کہ ایک موقعہ پر جب جناب نارکن نے فرمایا کہ اُنھوں نے اپنا وقت اتنی اچھی طرح نہیں گذارا تھا جتنا کہ اِس بچوں کے ناچ میں تو ہمارے میزبان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس قدر عظیم الشان آدمی کے قریب رہنے نے مجھ پر خوف طاری ہوا تھا اس لیے جب میں بچوں کو اچھی طرح دیکھ چکا تو ایک چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا جہاں کوئی نہ تھا اور وہاں ایک پھول دار درختوں کے کنج میں جو آدھے کمرے کو گھیرے ہوئے تھا بیٹھ گیا۔

بچے غیر معمولی طور پر پیارے تھے۔ اور باوجود میاں اور اُستانی کی تاکید کے وہ اس پر راضی نہیں ہوتے تھے کہ ہر بات کو اپنے بزرگوں کی مرضی کے مطابق کریں۔ ان کے لیے جو مٹھائی بڑے دن کے درخت پر رکھی گئی تھی ــ وہ اُنھوں نے ساری کی ساری لوٹ لی تھی۔ اور یہ معلوم کرنے سے پہلے کہ کونسا کھلونا کس کا ہے اُنھوں نے آدھے کھلونے توڑ ڈالے تھے۔ خاص طور سے پیارا ایک کالی آنکھوں اور گھونگھروالے بالوں کا لڑکا تھا جو مجھ کو اپنی لکڑی کی بندوق سے داغ دینا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی لوگوں کی توجہ اُس کی بہن کی طرف زیادہ تھی۔ وہ تقریباً گیارہ برس کی دلفریب خاموش اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ زردی مائل تھا اور اُس کی آنکھیں بڑی اور کشادہ تھیں جن پر غور و فکر کے آثار پائے جاتے تھے۔ دوسرے بچوں نے اُس کو کسی طرح سے خفا کر دیا تھا اس لیے وہ اُن کے پاس سے بھاگ کر اُسی کمرے میں چلی آئی جہاں میں بیٹھا تھا اور ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی گڑیا سے کھیلنے لگی۔

یہاں میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں جو میں نے پہلے مشاہدہ کی تھیں۔ تمام مہمان ایک دوسرے

کو بار بار ایک دولتمند شراب کے ٹھیکہ دار کی طرف متوجہ کر رہے تھے جو اس لڑکی کا باپ تھا کسی نے چپکے سے کہا کہ اُس نے اپنی لڑکی کے جہیز کے لیئے تین لاکھ روبل (یعنی کوئی ۸ لاکھ روپے) علیحدہ رکھ دیئے ہیں۔ میں اُس طرف مڑا کہ اُن لوگوں کو دیکھوں جنھیں اس معاملے سے دلچسپی ہے اور میری نظر نارگن صاحب پر پڑی۔ وہ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے اور سر کو ذرا سا ایک طرف جھکائے ہوئے نہایت توجہ سے ان لوگوں کی بے مزہ گفتگو کو سُن رہے تھے۔

علاوہ اس کے بچوں کو کھلونے تقسیم کرنے میں۔ اپنے میزبان کی دانشمندی کی میں بغیر تعریف کیئے نہیں رہ سکتا۔ اُس چھوٹی لڑکی کو جس کا جہیز ابھی سے ۳ لاکھ روبل مقرر ہو چکا تھا سب سے خوبصورت گڑیا ملی۔ اس کے بعد اور بچوں کو اُن کے ماں باپ کی حیثیت کے مطابق کھلونے دیئے گئے۔ جو بچہ سب سے آخر میں آیا کوئی دس برس کی عمر کا لڑکا تھا۔ وہ دُبلا اور پستہ قد تھا اُس کے بال سُرخی مائل تھے اور چہرہ داغ دار تھا۔ اُس کو صرف ایک کتاب ملی جس میں قصے تھے مگر صرف ایسے جن میں قدرت کی شان و شوکت اور متاثر دل کے آنسوؤں وغیرہ وغیرہ کا ذکر تھا۔ اُس کتاب میں تصویروں کا نام بھی نہ تھا اور پھول پتیاں بھی نہیں تھیں یہ ہمارے میزبان کے بچوں کی اُستانی کا لڑکا تھا۔ وہ ایک غریب بیوہ تھی اور یہ ایک شرمیلا سہما ہوا بچہ تھا جس کا کوٹ سستے نین سکھ کا تھا۔ اپنی کتاب لے کر وہ بہت دیر تک اور کھلونوں کے چاروں طرف گھومتا رہا۔ اُس کا بہت جی چاہتا تھا کہ اور بچوں کے ساتھ کھیلے مگر اُس میں اتنی ہمت نہ تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنی حیثیت کو محسوس کرتا تھا۔ مجھے بچوں کو غور سے دیکھنے میں بہت خوشی ہوتی ہے۔ اُن کا درجہ بدرجہ سمجھ دار ہونا بہت دلچسپ ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ سُرخ بالوں والا لڑکا اور لڑکوں کے کھلونوں سے اور خصوصاً ایک مصنوعی تھیٹر جس میں وہ خود ایک پارٹ کرنا چاہتا تھا کھیلنے کی اس قدر ہوس رکھتا تھا کہ وہ ایک خوشامدانہ حرکت پر بھی آمادہ ہو گیا۔ اُس نے اور بچوں کو دیکھ کر مسکرانا شروع کیا اُس نے دل لگی کرنے کی کوشش کی اور اپنا سیب ایک چھوٹے فربہ اندام بچے کو دے دیا جس کی کمر

سے ایک مٹھائیوں کا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ اور لڑکوں کو اپنی پیٹھ پر سواری دینا شروع کیا تاکہ وہ اس کو اُس تھیٹر کے پاس تک نہ بھگا دیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا کو بچہ سنے بے وجہ اُس کو خوب بٹھوکا۔ بیچارے میں اتنی ہمت نہ تھی کہ روئے اس پر اس کی ماں پہونچی اور اُس سے بہت سختی سے کہا اس کو اور لڑکوں کو کھیلنے میں دق نہ کرنا چاہیے اب یہ بچہ بھی اُسی چھوٹے کمرے میں پہونچا جہاں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کو اس کی صحبت سے کوئی شکایت نہ تھی اور دونوں گڑیا کو کپڑے پہنانے میں مشغول ہو گئے۔ ۱

میں اپنے کنج میں آدھے گھنٹہ بیٹھا رہا اور اُس سرخ بالوں والے لڑکے اور اُس ۲ لاکھ روپے کے جہیز والی لڑکی کی باتیں سنتے سنتے اونگھ گیا تھا کہ ایکبارگی نارکن صاحب کمرے میں وارد ہوئے۔ اُن کی چال بہت تیز تھی اور بچوں کے مجمع میں اس وجہ سے اختیار کی گئی تھی کہ بڑے کمرے سے گزرنے میں انھیں کوئی دیکھ نہ لے۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس سے کچھ دیر پہلے وہ اُس ہونے والی دُلہن کے باپ سے جن سے اُن کی ملاقات اُسی وقت ہوئی تھی دو عہدوں کے ایک دوسرے پر ترجیح رکھنے پر گرما گرمی سے سخت بحث کر رہے تھے۔ یہاں پہونچکر وہ کسی خیال میں محو ہو کر کھڑے ہو گئے اور اپنی انگلیوں پر کچھ حساب کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"۲ لاکھ... ۲ لاکھ" اُنھوں نے چپکے سے کہا "گیارہ.. بارہ.. تیرہ... سولہ یعنی پانچ سال فرض کیجئے پانچ فی صدی کی شرح سے یہ بارہ ہزار ہوئے، بارہ پنجے ساٹھ۔ اچھا اور اُن ساٹھ ہزار سے اوپر اور.. اچھا فرض کیجئے پانچ سال میں چار لاکھ ہو جائیں گے۔ ہاں، مگر یہ بے ایمان اپنا روپیہ چار فی صدی کے حساب سے نہیں لگائے گا۔ آٹھ یا دس فی صدی لے گا۔ اچھا تو سمجھئے پانچ لاکھ کم از کم پانچ لاکھ ہوئے۔ یہ تو یقینی ہے۔ اچھا اور پھر پاندان کا خرچ! ہونہہ

اپنے سلسلۂ خیال کو ختم کرکے اُنھوں نے ناک صاف کی اور کمرے سے باہر جانا چاہتے

تھے کہ ایکبار گی اُن کی نظر اُس لڑکی پر پڑی اور وہ کھڑے ہو گئے۔ میں کنج کے اندر اُسیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یا تو یہ اُس حساب کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی مگر وہ ہاتھ مل رہے تھے اور کسی ایک جگہ بے حس و حرکت نہیں کھڑے رہ سکتے تھے۔

یہ گھبراہٹ انتہا پر پہونچی جب اُنھوں نے اُس ہونے والی دلہن پر ایک دوسری معصوم نظر ڈالی۔ اُنھوں نے اُس کے پاس جانے کا ارادہ کیا مگر اُس سے پہلے اپنے آپ کو ہر طرف سے جھاڑ پونچھ لیا، اور پنجوں کے بل چلتے ہوئے گویا کہ اُنھیں کسی جرم کے ارتکاب کا احساس ہو رہا تھا اُس کی طرف بڑھے۔ مسکراتے ہوئے اُس کے پاس پہونچے اور جھک کر اُس کے سر پر بوسہ دیا وہ بیچاری ایسے کسی حادثے کے لئے تیار نہ تھی اور گھبرا کر چلا اُٹھی۔

"کیوں پیاری تم یہاں کیا کر رہی ہو" اُنھوں نے چپکے سے پوچھا۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کر اُس کے گالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ "کھیل رہے ہیں"

"اچھا؟ اس چھوکرے کے ساتھ؟" یہ کہہ کر نارکن صاحب نے اُس لڑکے کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور فرمانے لگے۔

"پیارے لڑکے تو بڑے کمرے میں کیوں نہیں جاتا؟" وہ لڑکا کچھ نہیں بولا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن کو دیکھنے لگا۔ نارکن صاحب پھر چاروں طرف دیکھ کر بچی کی طرف جھکے۔ "اور تمھارے پاس ہے کیا میری پیاری بچی؟ گڑیا ہے؟"

"جی ہاں" اُس نے کچھ شرما کر جواب دیا اور اُس کے چھوٹے سے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہوئے۔

"گڑیا ہے۔ مگر تم کو معلوم بھی ہے کہ تمھاری گڑیا کس چیز سے بنی ہے؟"

"جی نہیں" بچی نے چپکے سے کہا اور اپنا سر نیچے جھکا لیا۔

"چھوٹے چیتھڑوں سے میری جان۔ لڑکے تجھ کو اپنے ساتھیوں کے پاس بڑے کمرے میں جانا چاہیے۔" نارکن صاحب نے لڑکے کی طرف گھور کر کہا۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کو بہت

غصہ آیا اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کا ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہونے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔

"اور تم کو معلوم ہے کہ تم کو یہ گڑیا کیوں دی گئی ہے؟" نارکن صاحب نے اور آہستگی سے پوچھا۔ "جی نہیں"

"اسی وجہ سے کہ تم تمام ہفتہ ایک بہت پیاری لڑکی رہی ہو"

یہاں پر نارکن صاحب نے جو کہ اب سخت اضطراب کی حالت میں تھے پھر چاروں طرف دیکھا اور اس قدر آہستگی سے کہ اُن کی آواز مشکل سے سُنائی دیتی تھی گھبراہٹ اور بے صبری کے انداز سے پھر سوال کیا۔

"لیکن پیاری بچی جب میں اگلی مرتبہ تمھارے والدین سے ملنے آؤں گا تو تم مجھ سے خوشی سے ملو گی؟" یہ کہہ کر نارکن صاحب چاہتے تھے کہ اُس چھوٹی پیاری بچی کو ایک مرتبہ اور پیار کریں۔ لیکن جب اُس سرخ بالوں والے بچے نے دیکھا کہ وہ بالکل رونے والی ہے تو اُس نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور ہمدردی کے جوش میں خود زور سے رو دیا۔ اب نارکن صاحب دراصل خفا ہو گئے۔

"نکل جا یہاں سے" اُنھوں نے لڑکے سے ڈانٹ کر کہا "ہال میں اپنے دوستوں کے پاس جا کر بیٹھ، نکلتا ہے کہ نہیں؟"

"نہیں یہ نہیں جائے گا۔ آپ خود کیوں نہیں چلے جاتے ہیں" لڑکی بول اُٹھی "اس کو یہاں بیٹھا رہنے دیجئے۔ اس کو یہاں بیٹھا رہنے دیجئے" اور یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

اس موقعہ پر شور اور لوگوں کی آوازیں دروازے سے سُنائی دینے لگیں اور نارکن صاحب نے گھبرا کر اپنے موٹے بدن کو سیدھا کیا۔ مگر وہ سرخ بالوں والا بچہ نارکن صاحب سے بھی زیادہ ڈر گیا تھا۔ اُس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور چپکے چپکے دیوار سے لگا ہوا اُس کمرے سے نکل کر کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس خیال سے کہ اُن پر کسی طرح بدگمانی نہ ہو نارکن صاحب بھی اُسی کمرے

میں چلے گئے۔ وہ ایک کیکڑے کی طرح سرخ اور سخت پریشانی کی حالت میں تھے۔ شاید اپنے جوش اور بے صبری کی وجہ سے وہ اپنے آپ سے خفا ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اُنکھوں پہ جو حساب لگایا تھا اُس کی وجہ سے اُن کی طبیعت میں گھبراہٹ لالچ اور بے صبری نے ایک ساتھ زور کیا ہوگا۔ اور اسی وجہ سے اُنھوں نے باوجود اپنی سنجیدگی اور عظمت کے بچوں کی طرح ایک دولہن کے گرفتار کرنے کے لئے حملہ کیا تھا۔ اور ایسی چھوٹی سی لڑکی پر جو پانچ سال سے قبل شادی نہیں کر سکتی تھی۔۔۔۔ میں بھی اُنھیں کی طرح کمرے میں پہونچا اور ایک بہت پر لطف نظارہ دیکھا۔ معزز نارکن صاحب غصہ سے لال اُسی سرخ بالوں والے لڑکے کی طرف لپک رہے تھے اور وہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور آخرکار اس کو کسی طرف بھاگنے کا موقعہ نہ ملا۔ "دور ہو یہاں سے" وہ حضرت چلائے "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ نکل بدمعاش نکل! تو یہاں پھل چرا رہا ہے کیوں بے؟ پھل چرا رہا ہے۔ نکل بدمعاش: نکل۔۔۔۔ ! جا اپنے ساتھیوں کے پاس جا!"

بیچارہ سہا ہوا لڑکا جان بچانے کے لئے میز کے نیچے گھس گیا۔ نارکن صاحب نے جھلا کر اپنا کمرکہ کا رومال نکالا اور اُس سے مار مار کر بیچارے خوف زدہ لڑکے کو میز کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کی۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ نارکن صاحب کسی قدر فربہ اندام واقع ہوئے تھے۔ وہ تندرست سرخ گالوں والے اور مضبوط آدمی تھے۔ اُن کے ایک چھوٹا سا توند بھی نکلا ہوا تھا اور موٹی موٹی رانیں تھیں اُن کے بدن کا ہر ایک حصہ اخروٹ کی طرح گول تھا۔ اس وقت اُن کے پسینہ بہہ رہا تھا۔ ہانپ رہے تھے اور بے حد لال ہو گئے تھے۔ آخرکار ان کا غصہ (اور عجب نہیں کہ اُن کا حسد) اس قدر بڑھ گیا کہ وہ دیوانے سے ہو گئے۔ میں نے بڑے زور سے ٹھٹھا لگایا۔ نارکن صاحب نے مُڑ کر مجھے دیکھا اور باوجود اس کے کہ وہ اتنے بڑے رتبے کے آدمی تھے بہت گھبرائے۔ اسی لمحہ میں ہمارے میزبان صاحب سامنے کے دروازے سے اندر آ گئے۔ وہ لڑکا میز کے نیچے سے نکل آیا اور اپنے گھٹنے اور بازو جھاڑنے لگا۔ نارکن صاحب جلدی سے

اپنے رومال سے ناک صاف کرنے لگے۔

ہمارے میزبان نے ہم تینوں کو کسی قدر تعجب سے دیکھا مگر ایک آزمودہ کار شخص کی طرح اُنھوں نے اس وقت کو اپنے مہمان کے ساتھ اکیلے میں بات کرنے کا موقع بنا لیا۔ لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

"یہ لڑکا وہی ہے جس کے لیے میں نے آپ سے کچھ عرض کیا تھا۔

"اچھا.. ہاں" نارکن صاحب نے جواب دیا۔ اُن کو ابھی تک اپنی طبیعت پر قابو نہیں تھا

"یہ ہمارے بچوں کی اُستانی کا لڑکا ہے" ہمارے میزبان نے التجا کے لہجے میں کہا۔

"وہ ایک غریب عورت ایک شریف عہدہ دار کی بیوہ ہے۔ اور اسی لیے.. اگر ممکن ہو تو.... بیتری پیٹرووچ ..."

"نہیں نہیں" نارکن صاحب نے جلدی سے کہا "فیلپ الیکسئیوچ صاحب آپ بُرا نہ مانئے گا مگر یہ کسی طرح سے ممکن نہیں ہے۔ میں نے پوری طرح سے دریافت کر لیا ہے۔ کسی طرح کی کوئی جگہ خالی نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی تو اُس کے لئے پہلے ہی سے دس آدمی موجود ہیں جن کا حق اُس پر اس لڑکے سے زیادہ ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے مگر..."

"افسوس صد افسوس" ہمارے میزبان نے کہا "یہ تو اس قدر حلیم اور صلح پسند بچہ ہے"

"ہرگز نہیں" بلکہ ایک دخل در معقولات کرنے والا مربی ہے' جیسا کہ میں نے دیکھا ہے" نارکن صاحب نے جواب دیا اور بے اختیار اپنے ہونٹ چبانے لگے اُنھوں نے لڑکے کی طرف مُڑ کر کہا "نکل یہاں سے چھوکرے' تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟ اپنے ساتھیوں کے پاس جا!"

جیسا کہ معلوم ہوتا تھا وہ اُس وقت میری طرف بھی کنکھیوں سے دیکھنے سے باز نہ رہ سکے۔ مجھے بھی اپنے اوپر قابو نہ تھا اور ان کے سامنے ہنس دیا۔ نارکن صاحب نے فوراً دوسری طرف منہ پھیر لیا اور میں صاف سُن سکتا تھا کہ اُنھوں نے میزبان سے سے پوچھا کہ "یہ عجیب غریب جوان کون ہے" اور تب میں نے یہ دیکھا کہ نارکن صاحب میری طرف سے مایوسی ظاہر

کرنے کے لیئے سر ہلانے لگے۔

جب میں جی بھر کر ہنس چکا تو میں ہال میں واپس آ گیا۔ وہاں میں نے لالچ دولتمند صاحب (یعنی نارکن) کو ماؤں اور باپوں سے جن میں ہمارے میزبان اور ان کی بیوی بھی شامل تھے گھرا ہوا پایا۔ نارکن صاحب ایک خاتون سے جن سے ان کی ملاقات اسی وقت ہوئی تھی بہت گرمجوشی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاتون اپنی چھوٹی بچی کا ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑی تھیں جس سے اور نارکن صاحب سے اس چھوٹے کمرے میں مختصر سی گفتگو ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اس کی خوبصورتی حلم لیاقت اور تہذیب کی تعریف کے دریا بہا رہے تھے۔ اس کی ماں کی رضاجوئی کے لیئے صاف صاف خوشامد کر رہے تھے ان کی باتیں سننے سے ماں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپکنے لگے۔ باپ کے منہ پر سرور کی مسکراہٹ تھی۔ ان تین معزز شخصوں کی کیفیت دیکھ کر مالک مکان کو بھی خوشی ہوئی۔ باقی مہمانوں پر بھی اسی قسم کا اثر ہوا۔ لوگوں نے بچوں تک کو مجبور کیا کہ وہ اپنا کھیل تھوڑی دیر کے لیئے بند کر دیں تاکہ اس گفتگو میں خلل نہ پڑے۔ ہر ایک میں ایک قسم کا جوش بھرا ہوا تھا۔ تب میں نے اس دلچسپ بچی کی متاثرماں کو نارکن صاحب سے بہت چیدہ الفاظ میں کہتے سنا کہ وہ اس کے یہاں قدم رنجہ فرما کر اس کو سرفرازی اور عزت بخشیں۔ اور اس نے بعد میں سنا کہ نارکن صاحب نے کیسی بیساختہ خوشی سے یہ دعوت قبول کی۔ اور اس پر تمام مہمانوں نے پہلے کی طرح پر اپنی گفتگو میں اس شراب کے سوداگر اور اس کی بیوی اور نارکن صاحب کے نام لے لے کر جوش و خروش سے تعریف کرنا شروع کی۔

"کیا ان نارکن صاحب کی شادی ہو چکی ہے؟" میں نے کچھ زور سے ایک صاحب سے پوچھا جن سے مجھے واقفیت تھی اور جو ان کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔

نارکن صاحب نے مجھ پر ایک جگر دوز غصہ کی نگاہ ڈالی۔

"نہیں" ان صاحب نے جواب دیا جن سے میں نے پوچھا اور جو میری بے شعوری پر

کچھ کم خفا نہیں تھے۔ مگر میں نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی۔

کچھ دن ہوئے میں . . . گرجا کے پاس سے جا رہا تھا۔ وہاں پر آدمیوں اور گاڑیوں کا مجمع دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ چاروں طرف ایک شادی کی باتیں ہو رہی تھیں جو یہاں ہونیوالی تھی۔ اس وقت پالا پڑ رہا تھا اور موسم بہت بے رونق تھا۔ میں مجمع میں گھستا ہوا گرجا کے اندر پہونچا اور وہاں دولہا کو دیکھا وہ ایک پستہ قد موٹا سا گول آدمی تھا جس کے تھوڑا سا توند بھی نکلا ہوا تھا اور جو حد سے زیادہ چہرے پر غازہ لگائے ہوئے تھا وہ بہت مشغولیت کے انداز سے ادھر اُدھر دوڑتا اور انتظام کرتا پھرتا تھا۔ آخرکار شور ہوا کہ دُلہن آتی ہے۔ میں مجمع کو چیر کر آگے بڑھا اور میں نے ایک نہایت خوبصورت لڑکی دیکھی جس کے بانغ جوانی میں تازہ بہار آئی تھی لیکن یہ حسین لڑکی زرد اور غمگین تھی۔ وہ کھوئی ہوئی سی نظر آتی تھی بلکہ مجھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آنکھیں ذرا دیر پہلے رو چکنے کی وجہ سے سرخ تھیں اُس کے خط و خال کی کل شکل متانت سے اُس کے حسن میں ایک طرح کی عظمت اور وقار آگیا تھا۔ لیکن اس وقار و تمکنت اور اس رنج و ملال میں اب تک بچپن کی معصومیت کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا بھولا پن۔ بے بسی اور ہراس ظاہر ہوتا تھا جو الفاظ میں نہیں ظاہر ہو سکتا۔

میں نے مجمع میں لوگوں کو کہتے سُنا کہ وہ ابھی پوری سولہ برس کی بھی نہیں ہے۔ میں نے دولہا کو ذرا غور سے جو دیکھا تو پہچان لیا کہ وہ مسٹر ی - پیٹر و وچ نارکن ہے جسے میں نے پچھلے سال نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دلہن کو غور سے دیکھا۔ یا اللہ۔ میں نے مجمع کو چیرنا شروع کیا تاکہ جس قدر جلد ممکن ہو گرجا سے باہر نکل جاؤں۔ لوگوں میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ دلہن بہت امیر ہے اُس نے پانچ لاکھ روپیہ جہیز میں پایا ہے، اور پاندان کا خرچ اس کے علاوہ۔

بہر حال وقت سڑک پر پہونچکر میں نے اپنے دل میں کہا" تو وہ حساب پورا اُترا "

مجلس اقوام

امتیاز رنگ و قوم اپنے دامن میں دنیا کے لیے تباہی و ہلاکت کا جو سامان پوشیدہ رکھتا ہے اُس کا ثبوت بیسویں صدی کی جنگ عظیم سے تمام اہل عالم کو مل چکا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اقوام متمدنہ کو تجارت، فارغ البالی اور بین الاقوامی تعلقات کبھی اس اتحاد باہمی کو صدمہ پہونچنے کی بھی اجازت دیں گے جس کی شکست امن عالم کے لیے پیام موت تھی۔ مگر ان عالمجنگی کو کا رنگ دیر تک نہ جم سکا، اور آخر کار ہیجان عظیم پیدا ہو گیا۔ کاغذ کے وہ چند پرزے، جن پر اتحاد کا عالیشان قصر تعمیر کیا گیا تھا، خود غرضی کے ہاتھوں سے مسل کر پھینک دیے گئے، اور عمارت منہدم ہو گئی، جس کے کھنڈروں کے نیچے امن کی امیدیں اور ترقی کے خواب، دنیا کی بیوفائی، اور اپنی بے ثباتی کی داستان زبان خاموشی سے دہراتے ہوئے مدفون ہو گئے۔ دنیا طلبی کے سے جو فتنہ انگیز جذبات مذہبی اندر فضا کو مسموم کر رہے تھے اُن کا یہ انجام ناگزیر تھا۔

مگر خون ناحق سے زمین لالہ رنگ کرنے کے بعد، زندگی کی خاموش فضا میں ہنگامہ برپا کرنے کے بعد، دنیا کے سمندر میں طوفان تلاطم پیدا کرنے کے بعد، تمدن جدید کے نونہالوں نے محسوس کیا کہ حقیقی راحت امن میں ہے نہ کہ جنگ میں۔ جس چیز کو وہ احیائے ملت کے لیے [illegible] سمجھ رہے تھے وہ سراسر فانی تھا۔ کشمکش حیات کی روز افزوں ہلاکت آفرینی سے تنگ، اپنی زوال قوت سے مجبور، اور آئے دن کے مصائب سے خستہ و پریشان ہو کر امن کے لیے وہ بھی چلا اٹھے۔ ہاں، بدترین گنہگار بھی اپنے عصیاں پر پشیمان ہوتا ہے، مگر اس وقت جب آئندہ ارتکاب گناہ کی سکت باقی نہیں رہتی، اور دنیا ہی میں اپنے اعمال بد کے عبرتناک انجام کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ کاش لوگوں کی آنکھیں کھلتیں، اور وہ دیکھتے کہ جنہیں بڑی سے بڑی دنیاوی طاقت نصیب ہے، جن کے ہاتھ دنیا کی تقدیر کے بظاہر عناں گیر ہیں، وہ بھی کسی فعل بد کے معمولی سے معمولی انجام کے بدلنے میں کتنے مجبور و بےبس ہیں۔

دنیا میں اگر شر نہ ہو، تو خیر کی برکتیں قابلِ قدر نہ سمجھی جائیں۔ قدرت کے اسی اُصولِ مسلمہ نے آہستہ آہستہ خلفشار میں سکون پیدا کر کے حالات میں ردِ عمل کی صلاحیت بخشی، اور لوگ کسی ایسی راہ کے متلاشی ہوئے جس پر گامزن ہو کے امن کی منزلِ مقصود تک رسائی یقینی ہو۔ تاکہ ایک بار پھر پُر سکون اور مطمئن زندگی نصیب ہو سکے۔ اس اہم ترین موقع پر ہماری نگاہیں کسی ایسی شے کی جستجو میں بیتابانہ اُٹھتی ہیں، جو ان مساعی کی کامیابی کا ثبوت بن کر اہلِ عالم کی اُن توقعات کے پورا ہونے کا یقین دلا سکے جن کے ساتھ اُن کا مستقبل وابستہ ہے، مگر ہر گوشہ سے مایوس و ناکام واپس آتی ہیں۔ کیونکہ حالات میں حقیقی تغیر ہنوز نہیں ہو سکا۔ ارادوں میں وہی کمزوریاں ہیں، نیتوں میں وہی فتور ہے، ہوسِ ملک گیری کے شعلوں میں وہی لپٹ ہے، جس کی جہاں سوزی کا اثر ابھی تک زائل نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ کشاکش و بے چینی زبانِ حال سے اس امن و صلح کے زمانہ سے بھی اُتنی ہی بیزاری کا اظہار کر رہی ہے، جتنی دنیا زمانہ جنگ سے نالاں تھی۔ جو قومیں اس عالمگیر مصیبت کی ذمہ دار ہیں اُنھیں اپنے ذاتی اغراض کے مقابلہ میں بنی نوعِ انسان کی فلاح کی کچھ پرواہ نہیں۔ اُن کی دنیاوی طاقت، اُن کے مدبرین کے دماغ، اُن کے ملک کے تمام وسائل ہزاروں لاکھوں ہم جنسوں کو جائز حقوق سے محروم کر کے اپنی قوم کے چند افراد کے دامنِ حرص کو پُر کرنے کے لیئے وقف ہیں۔ اُن کے تمام مساعی صرف اس مقصد کے لیئے صرف ہوتے ہیں۔ اُن کی تلواریں اسی سمت جھکتی ہیں، اُن کے ترکش کا ہر تیر کسی کمزور قوم کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ کاش اُنھیں احساس ہوتا کہ تمام بنی نوعِ انسان کے حقوق خود ساختہ حدود کے اندر رہنے والی جماعت سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور اُن کی توجہ مصیبت زدہ دنیا کو مشکلات سے نجات دلانے کی طرف منعطف ہو جاتی!

اگرچہ صلح و آشتی کے اس اخلاقی پہلو کو بین الاقوامی تعلقات کے خوشگوار بنانے میں شمعِ راہ نہیں بنایا گیا، تاہم جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ متحاربہ کے ہاتھ شل ہو چکے

تھے، اور وہ اپنے ملک کے جانی و مالی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ جنگ کو کسی حد تک روکنے کے لیے مجلس اقوام معرضِ وجود میں آئی۔ اس کا قیام ایک معاہدہ کی رو سے عمل میں آیا، جو اتحادی اور ان کی رفیق کار طاقتوں کے درمیان ۲۸ اپریل ۱۹۱۹ء کو بمقام پیرس، ایک کانفرنس میں باہم طے پایا تھا۔ قبل ازیں کہ اس کے اغراض و مقاصد اور اُن کی کامیابی یا ناکامی پر بحث کی جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جائے۔

لیگ اقوام میں ایک اسمبلی ہے جس کے ممبر اُن ممالک کے نمائندے ہیں جنھیں لیگ کی رکنیت حاصل ہے۔ اور ایک کاونسل ہے جس کے اراکین بڑی بڑی اتحادی طاقتوں اور اُن کے رفقائے کار کے نمائندے ہیں۔ مزید براں اس میں چار اور اراکین ہوں گے جنھیں اسمبلی، ممبران لیگ کے درمیان سے وقتاً فوقتاً انتخاب کرے گی۔ اس کے علاوہ ایک صیغہ نظامت ہے، جو کاونسل مذکورہ کے غالب عنصر کی رضامندی سے مقرر شدہ ناظم اور ضروری اسٹاف پر مشتمل ہے۔ ایک عدالت کا قیام بھی عمل میں آیا ہے "جو ان بین الاقوامی نزاعات کی سماعت و فیصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو، جو فریقین کی جانب سے وقتاً فوقتاً پیش کیے جائیں۔" اس عدالت کے نظام کی ترتیب کا اختیار کاونسل کو حاصل ہے۔ لیگ کا صدر مقام جنیوا ہے۔

اس کا مقصد، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، یہ ہے کہ آیندہ بڑی بڑی قوموں کو جنگ سے باز رکھنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے۔ اس کی دفعات اس امر پر بہت زور دیتی ہیں کہ قیام امن کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ فوج اور اسلحہ میں جہاں تک مصالح ملکی و بین الاقوامی اجازت دیں، تخفیف کی جائے۔ انسداد جنگ کے مساعی صرف اراکین مجلس اقوام کی باہمی نزاعات ہی تک محدود نہ رہیں گے، بلکہ اُن ملکوں کو بھی اس کے قوانین کی پابندی پر مجبور کیا جائے گا جو کسی رکن مجلس سے برسرپیکار ہوں، خواہ انھیں

اس کی رکنیت نہ بھی حاصل ہو۔

اہلِ عالم کی بہبودی کے لئے اس سے زیادہ امید افزا اور قابلِ مسرت اور کیا امر ہو سکتا ہے، کہ ذمہ دار مدبرین اپنے حقیقی فرائض کو محسوس کر کے کسی ایسے نظام کو ترتیب دیں جو کسی قوم کے جائز حقوق اور مفاد کو صدمہ پہونچائے بغیر قیامِ امن کے لیئے کامیاب کوشش کر سکے۔ اور بنی نوعِ انسان کو، جو محض خود ساختہ اُصولوں، اور بیجا تعصب کے باعث ایک دوسرے سے علحدہ ہو گئے ہیں تصادم سے باز رکھے، تاکہ وہ اُس مقصدِ عظیم کے حصول میں سرگرم سعی ہو سکیں جو آفرینشِ انسان کا تنہا سبب ہے۔ انسان کی فطرت بہت بلند ہے، اور اس میں ترقی کی لامحدود اہلیت موجود ہے۔ اگر کامیابی کی انتہا بہت سی جانوں کو تلف، بہت سے حقوق کو پامال، اور بہت سے دلوں کو شکستہ کر کے زمین کے چند قطعات کی ملکیت ہی نہ تصور کر لی جائے، بلکہ اس حقیقت کا احساس ہو جائے کہ انسان دنیا میں اعلیٰ ترین مقاصد اور اہم ترین فرائض کے ساتھ آیا ہے، تو ایسے اسباب کے بہت جلد پیدا ہو جانے کا امکان ہے، جو زمانہ کی حالت میں نہایت ہی مفید تغیر پیدا کر دیں، اور زندگی کا جام تہی بادۂ امن و سکون سے لبریز ہو جائے۔

کاش مجلسِ اقوام کی تعمیر ایسے دست و بازو سے ہوئی ہوتی، جن کے صدق و خلوص پر اعتماد کیا جا سکتا، تو یقیناً ہر گوشہ سے صدائے لبیک اُٹھتی۔ لیکن اس کے چند سالہ کارنامے کسی روشن مستقبل کی اُمید نہیں دلا سکتے، کیونکہ خود وہی اراکین جن کی کوششوں سے یہ عالمِ وجود میں آئی، اور اب تک قائم ہے، اپنے طرزِ عمل سے، اس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ خاطر خواہ دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک قومی مفاد کے مقابلہ میں فلاحِ عام کی کوئی وقعت نہیں۔ اس سے زیادہ حوصلہ شکن، اور تاریکیٔ مستقبل کو نمایاں کر دینے والا اور کیا امر ہو سکتا ہے کہ خود امریکہ اس کی تائید نہ کر سکا، اور اس سے کنارہ کش ہونے لگا، حالانکہ یہ مجلس پریسیڈنٹ ولسن ہی کی

تخلیق ہی، اور اپنے نشو و نما میں اُنہیں کی دماغ سوزی و مساعی کی رہینِ منت۔ پھر بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہی کہ اگر یہی حالت رہے تو کسی خوشگوار نتیجہ تک پہونچنے اور اپنے کسی ایک مقصد میں بھی کامیاب ہونے سے قبل اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہی کہ مجلس اقوام چند طاقتور سلطنتوں کا کھلونا بن کر رہ گئی اور یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا، کہ وہ فتحمند قومیں، جن کو اُس کے سیاہ و سفید پر کامل قدرت حاصل ہی صرف اس لئے اس کے قیام کے موافق و مؤید ہیں، کہ بیرونی خطرات اور آیندہ کسی مکانی جنگ سے محفوظ ہو کر اقوام مغلوبہ کو اطمینان کے ساتھ اپنی حرص و آز کا شکار بنا سکیں۔

بلاشبہ اس "مجلس امن و انصاف" کے اراکین اپنے ہی منظور کردہ قوانین کو شکست اور اپنے ہی مقرر کردہ اُصولوں کو پامال کرکے پُر فریب چالوں سے اس مقصد میں بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ فرانس اور جرمنی کی باہمی کشمکش اور اول الذکر کی سخت گیر پالیسی اس کی بین شہادت ہی۔ کیا فرانس کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے جابرانہ رویہ کو اس اطمینان و استقلال کے ساتھ برقرار رکھتا، اگر اُس کو حریف و حلیف قوتوں کے توازن سے اپنے پوزیشن کی مضبوطی کا یقین نہ ہو جاتا، اور کسی بیرونی حملہ کا خوف دامنگیر ہوتا؟

کیا فرانس اپنی حکمت عملیوں میں کامیاب ہو جاتا اگر روس اور جرمنی کو مجلس اقوام سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر بین الاقوامی معاہدۂ حریت و مساوات کی حد شمولیت سے باہر نہ کر دیا جاتا؟ اگر مجلس اقوام دنیا کو پیام امن دیتی ہی، تو اقوام مغلوبہ کے لئے اُس کا دامن کیوں تنگ ہی؟ کیا قومیت کی تفریق مٹانے کے لئے یہی بہترین طرز عمل ہی؟ اس سے انکار نہیں، کہ برطانیہ فرانس کے اس رویہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی، لیکن جرمنی سے ہمدردی کا حقیقی محرک وہ اخلاقی جذبہ نہیں ہی جس کا اعادہ بار بار ہوتا رہتا ہی، بلکہ ذاتی اغراض ہیں، کیونکہ جرمنی کی موجودہ حالت برطانوی تجارت کے لئے سخت مضرت رساں ہی۔

اٹلی اور یونان کے تصادم میں مجلس کا قوت سے مرعوب ہو کر اطالوی مطالبات کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا، اور کمزور یونان کی حمایت سے پہلو تہی کرنا حقیقت پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ ان واقعات میں دول حلفاء کے درمیان بھی نا اتفاقی کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ فرانس اور اٹلی ذاتی منافع کے لئے مجلس اقوام کے اُصول اور اپنے معاہدہ برطانیہ کے مفاد کو نظر انداز کرنے میں چنداں تامل نہیں کرتے، اور اپنے اثر و اقتدار کی بدولت کسی الزام کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ تنازعات کے بُرے نتائج سے بچنے اور جائز حقوق کی حفاظت کے لئے اب بھی فوجی طاقت کی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی مجلس اقوام کے قیام سے پہلے تھی۔ مساوات کے زبردست دعاوی کے بعد بھی اس میں تفریق قومی کی اسپرٹ ہنوز زائل نہیں ہوئی۔ پھر اس مجلس سے آزادانہ انصاف کی توقع کیونکر ہو سکتی ہے، جو قوت سے مرعوب ہو جائے، اور جماعتی تفریق کا مرکز بن گئی ہو۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجلس اقوام برکات امن کے احساس کا ثمر اولین ہے۔ اگرچہ موجودہ فضا اس کی نشو و نما کے لئے کچھ موزوں نہیں، لیکن جس وقت دنیا کی عنان سیاست زیادہ ایمان دار اور دانشمند مدبرین کے ہاتھوں میں ہوگی اُس وقت عالمگیر جمہوریت کا خیال شاید درس اخوت دینے میں کامیاب ثابت ہو۔ اگر دنیا اسلامی جمہوریت و اخوت سے آشنا ہو جاتی، تو اپنے مقصد کی تکمیل میں اُسے کسی آنے والے زمانہ کا منتظر نہ ہونا پڑتا۔ کاش مسلمان اپنے فرض تبلیغ کو محسوس کریں جس کی کامیابی ان مصائب کا تنہا علاج ہے۔ اسلام کی صداقت کے اظہار کا بہترین موقع یہی ہے جب زمانہ خود پیام امن سننے کے لئے گوش بر آواز ہے، اور موجودہ حالت سے بیزار ہو کر دوسری جانب پلٹا کھانے کے لئے بے قرار نظر آتا ہے۔ ع

ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

عبدالقادر

مطبوعات جدیدہ

پیام امن - از مولوی عبدالماجد، بی۔ اے۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، قیمت ۱۲ ؁
جناب عبدالماجد صاحب کی مستقل تصنیفات میں "پیام امن" ایک جدید اضافہ ہے۔ جو اگرچہ مشہور فرانسیسی اہل قلم موسیو پال ریچرڈ کے ترجمہ ہونے کی حیثیت سے اس مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتا تھا لیکن جناب مترجم نے جو محنت اُس کے حواشی کی ترتیب، مقدمہ کے اضافہ، اور ضمیمہ جات کے ذریعہ سے کی ہے وہ بلاشبہ اس کتاب کو محض ترجمہ کہلائے جانے کے بجائے اک تالیف کہلانے کی مستحق قرار دیتی ہے۔

پیام امن ایسے وقت شائع ہو رہا ہے جب کہ تمام عالم لذت امن کو فراموش کر چکا ہے، خصومات باہمی اور جنگ و جدال کا دور دورہ ہے، امن و سلامتی کی روحانی تعلیم تو بعض حلقوں میں ہذیاں سرائی کے مرادف قرار دی جاتی ہے، اور یورپ کی جدید سیاسی تگ و دو انسانی جذبات، مذہبی معتقدات اور اخلاقی تعلیمات کو اس سنگدلی سے پامال کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے کہ فی الواقع "امن و سلامتی" کا راگ بے وقت کی شہنائی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح ہندوستان میں مہاتما گاندھی نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو اپنی حیرت انگیز اخلاقی قوت سے دفعۃً روک دیا اسی طرح یورپ کے بعض حلقوں میں بھی بے چینی کے آثار نظر آتے ہیں گو اس وقت تک کوئی زبردست آواز اس تعلیم کی حق و حمایت میں نہیں اُٹھی جس کو مسیح نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا، "مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے (متی - ۵)" اور سچ یہ ہے کہ اس کی توقع بھی عبث تھی اس لیے کہ مسیح کا دوسرا قول فیصل بھی موجود ہے۔

"یہ امت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے۔ لیکن ان کا دل مجھ سے دور ہے، اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں" (مرقس باب ۷)

ترجمہ کی خوبی کے لئے خود عبدالماجد صاحب کا نام کافی ضمانت ہے کہ وہ زبان کی خوبی و دلکشی کے ساتھ اس فن میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ کتاب ۱۸۱ صفحہ پر ختم ہوئی ہے اور اچھے سفید کاغذ پر صحت و صفائی کے ساتھ چھپی ہے۔

جدید دنیائے اسلام - مترجمہ محمد جمیل الدین صاحب بی۔ اے علیگ ڈپٹی کلکٹر مطبوعہ عثمانی پریس بدایوں۔ قیمت ؏

ڈاکٹر استاڈرڈ کی شہرۂ آفاق تصنیف "دی نیو ورلڈ آف اسلام" کا یہ ترجمہ ہے، جس کو جناب مترجم نے باوجود اپنے مشاغل ملازمت مکمل کر کے شائع فرما دیا۔ ہم ان کی اس خدمت کی دل سے قدر کرتے ہیں اس لئے اور بھی کہ اُن کی جماعت میں بہت کم ہیں جو ملک و قوم کی اس ممکن امداد کی سعی فرماتے ہوں جو وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انجام دے سکتے ہیں۔ موجودہ سیاسیات اسلامی کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ کتاب کی اشاعت نے مصنف کو فوراً ممتاز ماہرین سیاست کی صف اول میں شامل کر دیا۔

مصنف نے ممالک اسلامی کے گزشتہ صدی کی زوال پذیر حالت کو وضاحت و خوبی سے بیان کرنے کے بعد جس قدر جدید تحریکات احیار ملت کے لئے ہوئی ہیں اور اکابر مصلحین مثلاً عبدالوہاب نجدی، شیخ جمال الدین افغانی، شیخ سنوسی، سید احمد خاں اور دوسرے بزرگوں کی جد وجہد کے تفصیلی حالات پیش کر کے موجودہ سیاسیات اسلامی پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ اور آج جو عام تحریک انگورہ، ترکی، فلسطین، سوڈان، مصر، اور دوسرے عربی ممالک اور ایران میں نظر آ رہی ہے اس کے اسباب اور اس کی قوت کا نہایت صحیح اندازہ کیا ہے اور بالآخر پان اسلامزم یا عالم اسلامی کی ہیئت عظیمہ کے متعلق خوشگوار پیشینگوئی ان الفاظ میں بطور "نتیجہ" پیش کی ہے "مشرق ادنے و وسطے پر ہمارا تبصرہ ختم ہو گیا۔ اس تبصرہ کی نمایاں صورت کیا ہے؟ انقلاب! بالآخر غیر متحرک مشرق اور کامل طور پر متحرک ہو گیا۔ آج مشرق کامل انقلاب، سیلان اور ہیجان کی حالت

میں ہے اور یہ انقلاب، اسیلان، اور ہیجان جس قدر فوری اور عمیق ہے اس قدر پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ دنیائے اسلام ایک ہزار سال تک جمود اور سکون کی حالت میں رہ کر اب پھر ایک بار سرگرم تگاپو نظر آتی ہے" کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان بنظر غور مطالعہ کرے۔ اور ہم کو نہایت مسرت ہے کہ مولوی جمیل الدین صاحب کی عنایت سے وہ اردو خواں طبقہ تک پہونچ گئی ترجمہ نہایت صاف صحیح اور برجستہ ہے۔ اور اسی وجہ سے اصل کتاب سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ کاغذ معمولی سفید طباعت معمولی اور حجم ۲۶۴ صفحہ ہے۔

موریشس اور اسلام - مؤلفہ مولانا قاری حکیم عبدالرشید صاحب نواب رشدی امام پورٹ لوئس۔ موریشس قیمت ۱۰ر

یہ تین جزو کی مختصر کتاب ہے جس میں اک جدت بھی نظر آتی ہے یعنی فہرست مضامین ختم کتاب کے بعد دی گئی ہے۔ صفحہ اول پر ماریشس کا نقشہ ہے اور انتساب و تعارف و بعض نظموں کے علاوہ جزیرہ ماریشس کے متعلق مفصل معلومات و تاریخی حالات کے علاوہ وہاں کی مسلمان آبادی کی موجودہ کیفیت اور ان میں تبلیغ اسلام کی اہم ضرورت پر توجہ دلائی گئی ہے۔ حکیم عبدالرشید صاحب کی کوششوں سے وہاں ایک تبلیغی انجمن۔ اور مدرسہ قائم ہے ہم کو مؤلف صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ مسلمانان ماریشس کے لیئے اگر عمدہ تعلیم کا انتظام ہو سکے تو ان کی اصلاح کی بہت کچھ امید ہے۔

یادِ وطن - (مہینہ میں دوبار) باتصویر اخبار، مقام اشاعت نیویارک (امریکہ) رئیس تحریر سید حسین چندہ سالانہ صہ، پتہ پوسٹ بکس ۳۰۷، ٹائمز اسکویر اسٹیشن

جذبہ وطن پرستی کی تازہ مثال ہندیانِ مقیم امریکہ کی وہ کوشش ہے جو انھوں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی خاطر امریکہ میں اردو اخبار جاری کرنے سے کی ہے "یاد وطن" جدید ہندوستان کی مساعی جمیلہ کا اک پرتو ہے اور اس عہد میں ہمارے نوجوانوں کے قابل فخر کارناموں میں شمار کیئے جانے کے قابل ہے۔ اس کے اڈیٹر کا نام ہندوستان

سے کے لیئے جس طرح مانوس ہے اسی طرح امریکہ میں بھی ہندوستان کے ہمدردوں سے پوشیدہ نہیں۔ مسٹر سید حسین نے اپنے قیام امریکہ میں خدمت ہند کا جو موقع نکالا ہے وہ ان کی جدت پسندی و ذہانت کی دلیل ہے۔ ہم صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ امریکہ میں اُردو خواں ہندوستانیوں کی کیا تعداد ہے، لیکن محض ہندوستان کی عظیم الشان آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے اگر اس اخبار کے کامیابی کی توقع کی جائے تو بیجا نہیں۔

"یادِ وطن" عام اخباری تقطیع پر آٹھ صفحے کے مضامین اور متعدد تصاویر دیتا ہے۔ مضامین زیادہ تر ہندوستانی قومی تحریکات اور سیاسی جد و جہد سے متعلق ہوتے ہیں جو زبان کی خوبی، مطالب و بیان کی عمدگی کے لحاظ سے یورپ امریکہ کے دوسرے اخبارات سے جو مشرقی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں کسی حیثیت میں کم نہیں بلکہ اکثر سے بہتر ہوتے ہیں۔ کاغذ و طباعت کی خوبی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے "یادِ وطن" اپنے نام کے ساتھ ہی یہ شعر لکھ کر ہندوستانی اخوت پر اس انداز سے ناز کرتا ہے کہ مذاق سلیم وجد کرنے لگتا ہے۔

به آں گروه که از ساغر وفا مستند — ز ما سلام رسانید ہر کجا ہستند

"یادِ وطن"، نے ہندیان مقیم امریکہ کے متعلق دو طویل مضامین شائع کیے ہیں اور ہندوستان و نیز امریکہ میں اک نظام تحفظ حقوق کے قیام پر زور دیا ہے۔ ہم کو اس حقیقت سے انکار نہیں اور نہ اس کی اہمیت کو گھٹایا جاسکتا ہے۔ امریکہ کے رہنے والے ہندوستانیوں کے متعلق زیادہ تفصیلی حالات اگر اس اخبار میں شائع ہوا کریں تو وہ اہل ہند کے لیے بہت زیادہ دلچسپ ہو جائے۔

حسن و عشق ۔ اڈیٹر ابو محمد مصلح ابو العلائی۔ ڈہری ضلع شاہ آباد (بہار) چندہ سالانہ ۔ ہ ر یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جس کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے مضامین جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اسی عنوان کے ہیں ادب لطیف کی خدمت کے خیال سے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے۔

علاوہ اور مضامین کے اک پورا مشاعرہ بھی نقل ہے۔

حور - مرتبہ بیگم صدیق انصاری - سالگرہ وت لین کلکتہ چندہ سالانہ ے/۔

یہ "زنانہ لٹریچر کا ماہوار صحیفہ" کلکتہ کی اک خاتون کی زیر ادارت تین ماہ سے نکل رہا ہے اور طباعت و تہذیب نیز تنوع مضامین کے لحاظ سے قابل تعریف ہے اس وقت تک جس قدر زنانہ پرچے شائع ہوئے ہیں ان میں "حور" غالباً زیادہ سلیقہ و محنت سے ترتیب دیا جاتا ہے علاوہ مردوں کے متعدد خواتین بھی مضمون نگاروں کے صف میں نظر آتی ہیں۔

الرفیق - مدیر سید عبدالوہاب استھانوی - مانکتلہ روڈ ڈاکخانہ شمیہ - کلکتہ

کلکتہ سے یہ رسالہ بھی نیا جاری ہوا ہے۔ اگست و ستمبر کا مشترکہ نمبر ہمارے پیش نظر ہے جس میں مولوی کیفی چریاکوٹی اور حکیم رکن الدین صاحب دانا کے مضامین بھی ہیں۔ مضامین میں تصوف و حکمت علم و ادب سب ہی کچھ ہے۔ طباعت و کاغذ معمولی ہے۔ اگر دو چار نمبر اور شائع ہوں تو کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

"ناقد"

برق بے جولاں

از جناب آزاد عظیم آبادی

نمود برق بے جولاں کی ہستی کیا عدم کیا ہے
سمندر مشربی بازیچۂ طفلاں سے کم کیا ہے

مشیت کا بھلا ہو کیسی آسان ہو گئی مشکل
خوشی جینے کی جس کو کچھ نہیں مرنے کا غم کیا ہے

نہ کہنا مغلطہ صاف اعتراف ضعف باطن ہے
جہاں ہے عزم راسخ حاجت قول و قسم کیا ہے

صدا ہے ناتواں کے شکست شیشۂ دل کی
کوئی سوچے تو یہ آوازۂ طبل و علم کیا ہے

یہ ہستی کیا ہے؟ خود اک خواب آشفتہ کی انگڑائی
جھپک ہے دیدۂ بے خواب کی خواب عدم کیا ہے

فلک کی دشمنی ہے اپنی ہستی پر قوی حجت
جہاں ہو زہر ہی امرت وہاں پروائے سم کیا ہے

ہزاروں سر بکف ہو کر نہ پہونچے تیری غایت کو
رموز زندگی! اللہ! تیرا پیچ و خم کیا ہے

فریب سادہ لوحاں اک نمائش ہے سراب آسا
نمود و نام کیا ہے شہرۂ جاہ و حشم کیا ہے

ہم اس باطل پرستی کی فسوں کاری پہ حیراں ہیں
اگرچہ نقش باطل دلنشیں نقش درم کیا ہے

شرر سے کم نہیں ہر قطرۂ اشک اے حرم والو
شرر کو پھونک دینے کے لئے دیر و حرم کیا ہے

کہاں مرتے پھریں طول حیات خضر کے غم میں
کہ مرنے کو تھوڑی سی بھی قید عمر کم کیا ہے

فراغ طبع آخر مقصد سعی دو عالم ہے
اسی خرمن کا خوشہ ہے گلستان ارم کیا ہے

مصائب کی رفاقت میں بھی پہلو ہیں مصیبت کے
دو نیم اپنا جو دل ہے سینہ شق اپنا قلم کیا ہے

غضب ہے ایسے بیماروں کو ہے زعم مسیحائی
جو اس سے بے خبر ہیں خیر بھی کیا ہے ورم کیا ہے

کرم بھی ہے تو بے روئی ریا کم ہے درم دم ہے
تہی مغزی کے پہلو میں کف اہل کرم کیا ہے

دل افسردہ جو از رحمت آہ آزاد کی میری
بس اک زندہ دلی اس کے سوا حضرت میں دم کیا ہے

حیات

خموشی آشنا گو ہے زبانِ نکتہ داں اس کی
پہنچتی ہے دلوں تک داستانِ خونچکاں اس کی

بسا دیتے ہیں اُجڑے گھر کو اس کے رعد کے کڑکے
ہرا کرتی ہیں باغِ دل کو گر کر بجلیاں اس کی

تبسم ہائے پنہاں اس کے ہوتے ہیں امید افزا
عزیمت خیز ہوتی ہیں دلوں میں چٹکیاں اس کی

بپا کرتی ہیں ہر ساعت، نیا ہنگامہ عالم میں
دکھاتی ہیں بہارِ تازہ ہر دم شوخیاں اس کی

ضعیفوں کے دلوں میں پھونکتی ہیں روح رستم کی
جوانوں کو جھنکاتی ہیں گوئیں اٹکھیلیاں اس کی

سبق دیتی ہے یہ افراد کو جب سرفروشی کا
تو ہوتی ہے بقائے نوع آکر ہمزباں اس کی

علو کے راز جب یہ منکشف کرتی ہے کانوں میں
بصد آہنگ ہوتی ہے شجاعت نغمہ خواں اس کی

تمناؤں کا دریا موجزن ہوتا ہے سینہ میں
غضب کی روح پرور ہے نوائے جانستاں اس کی

جسے سر کی نہیں پروا ہے کچھ، وہ اس کا ہمدم ہے
حمیت ہے دلِ دردآشنا کی پاسباں اس کی

منافی موت کی تکلیف سعی دمبدم اس کی
بشر زندگی کی، دعوتِ تسلیم جاں اس کی

جو اس عالم میں رہنا ہے تو وقفِ جستجو رہنا
یہ آے دن ہوا کرتی ہے، تلقینِ نہاں اس کی

مزہ سر چڑھ کے مرنے میں ہے کیسا تجربہ کر لو
سبق دیتی ہیں دل والوں کو یہ سرگرمیاں اس کی

"صدائے خاموش"

رقصِ بسمل

ہمارے مکرم دوست محمد مسلم صاحب ایم اے عظیم آبادی کو حال میں اک جگر دوز حادثہ پیش آیا ہے کہ اُن کے صاحبزادہ ہاشم نے اُن کو اپنی دائمی مفارقت کا داغ دیا۔ یہ چند اشعار اسی کیفیت قلبی کا اظہار ہے جو اس وقت نہ صرف مسلم صاحب بلکہ ان تمام احباب کی ہے جن کو ہاشم کی صورت اس کی خداداد ذہانت اور غیر معمولی متانت کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہم اس موقع پر اگر تعزیت کا کافی حق ادا نہ کر سکیں تو اس کی وجہ وہی ہے جس کو اکبر مرحوم نے اسی موقع پر خود اپنے لیئے لکھا تھا، مرنے والا اُس وقت بھی ہاشم ہی تھا۔

بہت نہ رونے پہ یہ نہ سمجھو کہ کم ہے جوشِ سرشک دل میں
یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایت ظرفِ آستیں ہے!

مدیر

"سب کہاں۔ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں!"

غالب

کل صبح صحنِ گلشن میں اک گلاب دیکھا رنگ اُس کا باغِ عالم میں لاجواب دیکھا
اور مست بو میں اُس کی کیفِ شراب دیکھا گل کی بہار دیکھی یا میں نے خواب دیکھا؟

تھا کیا وہ میرا پیارا؟ ہاں ہاں وہی تھا ہاشم

کل دوپہر کو دیکھی وادی میں اک تیتلی نازک پروں پہ ساتوں رنگوں کی بیل بوٹی
کالی ہری سنہری لال اودی نیلی اُجلی ہو کس کا تحمل، ایسی کہاں تھی ترمی

وہ بھی مری دل آرا، یعنی وہی تھا ہاشم

کل سہ پہر کو دیکھا، گردوں پر اک دھنک تھی جو رونقِ زمیں تھی جو زینتِ فلک تھی
حسنِ مئی نظارہ آنکھوں سے روح تک تھی کس نے کہا دھنک تھی، اک وہم تھا، تُنک تھی

آنکھوں کا تھا وہ تارا، یعنی وہی تھا ہاشم

کل شام تک چمن میں اک طائرِ خوش الحاں   تھا شاخِ گل پہ رقصاں اور جوش میں غزلخواں
شیرینیٔ ترنم سے شادکام تھی جہاں   خاموش ہو گیا لو وہ مطربِ گلستاں
ہاشم نہ ہو ہمارا! بے شک وہی تھا ہاشم

شب ظلمتِ فضا میں تھا ایک کرمکِ نور   ایک اخترِ جہندہ، ایک اخگرِ سرِ طور
مسکیں کا ایک دینار، اک شمعِ بختِ دیجور   بو پھٹتے ہی ہوا وہ آنکھوں کا نور کافور
وہ مضطرب شرارہ! اُف اُف وہی تھا ہاشم

مستور

کلام فانی

دل ہمیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر
عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر

اور بندے ہیں جن کو دعوئ خدائی ہے
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

عمر خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں
زندگی نئی پائی آپ سے جدا ہو کر

کارگاہ حسرت کا حشر کیا ہوا یا رب
داغ دل پہ کیا گزری نقش مدعا ہو کر

نامراد جینے تک نامراد جیتے ہیں
سانس بن گیا ایک ایک نالہ نارسا ہو کر

بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

عشق سے ہوئے آگاہ صبر کی بھی حد دیکھی
خاک میں ملادوگے دیر آشنا ہو کر

اب ہوئی زمانہ میں شیوۂ وفا کی قدر
عالم آشنا ہے وہ دشمن وفا ہو کر

زندگی سے ہو بیزار فانیؔ اس سے کیا حاصل
موت کو مناؤ گے جان سے خفا ہو کر

غزل

جناب اعزازالدین صاحب ایم اے

روزے بمن دل شدہ ناکام بیاشام
وز وقت سحر تا بسر شام بیاشام
تاچند ہمیں نامہ و پیغام، بیا، شام
زبادۂ گلرنگ دو سہ جام بیاشام
گر جام صبوحی بزدی خیرہ بہ اغیار
باد نشۂ خویش بیاشام بیاشام
از دست حنابستۂ خود برکن و دردہ
وز نازنگاہے کہ "بیاشام! بیاشام؟"

ق

چوں مست شوم از سر الطاف دو یک جام
از دست من رعشہ براندام بیاشام
اے پیر مغاں بادۂ سر جوش نخواہم
با بندہ بگو دردتہ جام بیاشام
وی واعظ بدمست چہ خوش گفت بہ مومن
"خواہی کہ نہ بینی غم ایام، بیاشام"

شذرات

رسالہ جامعہ نے اس ایک سال میں جو خدمت کی ہے اس کا صحیح اندازہ ممکن ہے کہ ناظرین و علم دوست حضرات کر سکیں، لیکن جن لوگوں کے ذمہ ادارت کا بار ہے وہ اس کے اہل نہیں؛ ایک نمایاں خصوصیت اس رسالہ کی یہ رہی ہے کہ ابتدا ہی سے وہ ایک خاص مقصد کے ساتھ نکالا گیا، ترتیب و تہذیب، مضامین کی نوعیت، حجم اور ظاہری شکل و صورت میں وہ ہمیشہ یکساں رہا اور بڑی حد تک وقت کی پابندی کو بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ ان کوششوں میں جس قدر کامیابی حاصل ہوئی اس کی بڑی وجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعلق ہے جو ملک میں بہ اعتبار اپنے مقاصد تعلیمی کے ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ اس عرصہ میں بعض ناگوار و ناگزیر اسباب کی بنا پر رسالہ وقت پر شائع نہ ہو سکا اور غالباً ابھی ایک دو مہینہ اس قصور کی سزا اور بھی ملے گی۔ جن اصحاب نے ازراہ قدردانی رسالہ کے انتظار میں شوق و محبت اور گلہ و شکوہ سے کام لیا ہے ان کا شکریہ الفاظ سے نہیں ادا ہو سکتا، اگر رسالہ اُن کے تقاضے کے ساتھ ہی اُن تک پہنچ جاتا تو ہم سمجھتے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، لیکن اب بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

رسالہ جامعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جامعہ ملیہ کی علمی و تعلیمی زندگی کے متعلق بہت کم لکھتا ہے۔ خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو، لیکن جامعہ کی اس ادا نے یہ ضرور ثابت کر دیا ہے کہ اس کے صفحات روزنامچے کالم نہیں، اور نہ وہ کسی چیز کو محض اپنی ہونے کی خاطر پبلک میں پیش کرتا ہے۔ لیکن آج جبکہ مدعیان علم و ماہرین تعلیم اس فن شریف کے لیے یورپ کے

بعض نہایت پس یا افتادہ تجربوں پر اپنی جدید تعلیمی ترقی کی بنیاد رکھنی چاہتے ہیں اور جن کی کوششیں صرف تقلید کے اک خفیف و ناکام کوشش تک محدود ہیں ان کے لیئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فضا اور تعلیمی آب ہوا بالیقین اک درس عبرت ہے۔ جامعہ کا نصاب تعلیم اور قدیم روشس میں جو خاص تبدیلیاں موجودہ نظام کرنا چاہتا ہے بار ہا پبلک میں آچکی ہیں۔ ممکن ہے کہ کاغذ پر اور بھی بہت سی تجاویز و دستور العمل ہوں جو ہمارے بعض رہبران تعلیم کے میزوں کے کسی گوشہ میں پڑے ہوں لیکن جامعہ نے ان تجاویز کو جس جرأت کے ساتھ عملی جامہ پہنایا ہے اس کا صحیح اندازہ صرف علی گڑھ ہی میں ہو سکتا ہے۔ سیڈلر کمیشن نے کلکتہ یونیورسٹی کے اصلاح کے سلسلہ میں جو اصول تعلیمی ہندوستان کے لیے قرار دیئے تھے وہ عام طور پر پسند کیئے گئے اور توقع تھی کہ جدید یونیورسٹیاں اسی نظام کے ماتحت عمل میں آئیں گی، مسلمان بھی اپنی یونیورسٹی کو اس ترقی یافتہ شکل میں دیکھنا چاہتے تھے مگر

قریب دیر خضر آیا تھا لیکن
ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جدید وائس چانسلر جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اُن بزرگان قوم میں سے ہیں جنھوں نے سیاسیات کو ہمیشہ اس لیے ناقابل التفات سمجھا کہ اُن کا رجحان طبیعت تعلیمی مسائل کی طرف تھا، نیز سیاسی حالت کی جس بلند سطح تک اُن کی دوربیں نگاہ پہنچتی تھی اس کا اقتضا بھی یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو بجائے سیاسیات کے تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ ممکن ہے کہ اُن کو اپنے خیال میں اس مقصد میں کامیابی ہوئی ہو، لیکن ملک کی موجودہ بے چینی اور مسلمانوں کا اس میں جو حصہ ہے وہ تو ہوا کا رُخ کسی کے دوسری ہی جانب بتا رہا ہے۔ بہرحال، باوجود ان موانعات کے وہ اپنی رائے پر قائم ہیں۔

اور اُمید ہے کہ یونیورسٹی بھی اُن کے مشوروں سے فائدہ اُٹھائے گی جس کے آثار نظر نہیں آتے اس لیئے کہ صاحبزادہ صاحب نے اپنے جدید عہدہ کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد جس عنوان سے ذمہ داراراکین یونیورسٹی کو خطاب فرمایا ہے وہ تو اک نوحۂ درد ہے جس کا آخری بند یہ ہے کہ جس یونیورسٹی کا خواب ہم نے دیکھا تھا وہ گورنمنٹ کی عنایت کرنے سے بھی حاصل نہ ہوا۔

اس خواب کی تعبیر اگر کہیں نظر آتی ہے۔ تو وہ جامعہ ملیہ ہے جہاں درختوں کے نیچے کھلی زمین پر طلبہ اور اساتذہ فلسفہ وحکمت، تفسیر وحدیث سے ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ اور ان دلدادگان علم کے کارناموں کے دھندلے نشان ان کوششوں میں دکھائی دیتے ہیں جو پریس کے ذریعہ سے کبھی کبھی کتابوں کے صورت میں نظر پڑتے ہیں لیکن جن کا بڑا حصہ ہنوز مسودات کے ہی نام سے یاد کیئے جانے کے لایق ہے۔

جامعہ کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک تعلیمی اور دوسرا اصلاحی، دارالاقامہ کے زندگی اصلاح معاشرت کے لیئے اور جامعہ کی درسیات ترقی تعلیم کی خاطر۔ جامعہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ لائق اساتذہ و پرجوش کارکن اس کو ابتدا ہی سے مل گئے تھے۔ اور اُنھوں نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے طلبہ کے لیئے ہر قسم کی مفید تربیت کا انتظام کیا۔ حال میں اک کواپریٹو اسٹور یا مشترکہ سرمایہ کی دُکان خود طلبہ ہی کے سرمایہ اور انتظام سے قائم کی گئی ہے۔ جس کے حصوں کی فروخت اور فراہمی سرمایہ کے بعد اسباب تجارت کی خرید و فروخت سب طلبہ کے ہاتھ میں ہے۔ حسابات خود طلبہ ہی رکھتے ہیں اور طلبہ ہی ان کی جانچ کرتے ہیں۔ یہ تمام کام باقاعدگی اور پابندی کے علاوہ اس طرح انجام پاتا ہے کہ دارالاقامہ کے اکثر طلبہ کو اُس میں تھوڑی مدت کے لیئے شرکت کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ کاروبار کا عملی تجربہ ان میں سے ہر فرد کو حاصل ہوسکے۔ اس کی کان

میں جو سامان برائے فروخت رکھا گیا ہی اُس میں تعیشات و تکلفات کی تمام چیزوں کو علحدہ کر دیا گیا ہی اور اصل مقصد یہ ہی کہ طلباے دارالاقامہ کے ضروریات روزمرہ کی تقریباً تمام چیزیں خود طلبہ ہی کی دوکان فراہم کرے۔

عرض جوہر

از

محمدؐ علی جوہر

مولانا محمدؐ علی مدظلہٗ کا تازہ ترین کلام جس میں زمانہ اسیری بیجاپور کی تمام غزلیں درج ہیں اور جو اس وقت ہاتھوں ہاتھ نکل رہا ہی۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

سے مل سکتا ہی

اردو زبان کی [illegible]

[illegible] اور کتابت سے صرف مکتبہ [illegible]

المدینۃ و دار السلام

(مترجمہ مولوی رشید احمد صاحب [illegible])

[illegible] کتاب ہے جو بارہا شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی [illegible] شائع ہوا ہے جو صرف مکتبہ جامعہ سے مل سکتا ہے۔ قیمت [illegible]

خواجہ عبدالحی صاحب کی تصانیف

[illegible] تصانیف میں تفسیر القرآن نے خاص مقبولیت حاصل کی ہے [illegible] میں باقاعدہ [illegible] طباعت و کتابت نفیس ہے۔

[illegible] سورہ بقر کی تفسیر ہے [illegible] مجلد [illegible]

[illegible] سورہ توبہ و انفال کی تفسیر ہے [illegible] مجلد [illegible]

[illegible] حضرت موسیٰ و فرعون کے واقعات پر [illegible] مشتمل ہے [illegible] تشریح کی گئی ہے۔ قیمت [illegible]

دیوان غالب

جس طرح کلام غالب اردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اسی طرح جو ایڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہے اُس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب نہیں چھپی ہوئی نہایت نفیس ٹائپ سرخ جلد پر سنہرا کام ہے اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہے اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات، رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دیئے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر چیز مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جو شروع میں درج ہے۔ اس ایڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہے ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہنچ سکے بہر حال درخواست خریداری بھیج دیجیے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے ایڈیشن پر مایوسی نہ ہو۔ قیمت صرف تین روپیہ

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ